مکاتیب گیلانی

مرتب

منت اللہ رحمانی

مسعود احمد برکاتی

مکاتیب گیلانی رح

جلد اوّل

حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی رح کے خطوط کا نادر مجموعہ

مرتّب

منّت اللہ رحمانی

ناشر

دار الاشاعت رحمانی، خانقاہ، مونگیر

مکاتیب گیلانی رح

مطبع : جمال پرنٹنگ د کوہ نور پرنٹنگ پریس، دلّی
سالِ اشاعت : ۱۹۷۲ء
تعداد اشاعت : ۱۰۰۰
ناشر : دار الاشاعت رحمانی، خانقاہ، مونگیر
قیمت :

فہرست مضامین

مکاتیب گیلانی

جلد اوّل

۵ "مدینہ" سے روانگی والی رات
۶ حضرت تھانوی کی صحت، جہانیوں کی صحت کے مرادف ہے۔
۷ مولانا محمد حسین صاحب سے خلافت

مکتوب ۴۶ — ۲۳۵

۱ حیدرآباد اور اس کے مشاغل پھر جھانکنے لگے
۲ اس سال آموں کی بہار خوب رہی، لیکن آپ کو اس میں شریک نہ کرنے کا افسوس مسلسل ہے۔
۳ اب تو جو جہاں ہے، جب تک جنگ ہے، وہیں ہے
۴ مٹھوا اس سال پیٹ بھر کھانے میں آیا
۵ گرانی کے لفظ سے آسمان و زمین بھرے ہوئے ہیں۔ مگر اب تک فاقہ سے کوئی موت دیکھنے میں نہیں آئی۔

مکتوب ۴۷ — ۲۳۷

۱ آپ کہاں ہیں؟ کیا کر رہے ہیں؟
۲ مولانا فضل کی علالت
۳ نزہۃ الخواطر کی طباعت کے لیے سعی
۴ حیدرآباد میں بجلی پر کنٹرول

مکتوب ۴۸ — ۲۴۰

۱ اُف اتنی غیر دلچسپ دنیا میں دلچسپیوں پر تعجب ہوتا ہے۔
۲ میں گیلانی میں ہوں، اور گیلانیہ پٹنہ میں۔
۳ اختلافِ دین موجبِ حرمانِ ارث ہے۔
۴ لاوارث کے مال کی جگہ بیت المال ہے ولکن این بیت المال؟

۵ یہ دار الحرب ہے، اموال معصومہ کے قوانین کا انطباق حربی ممالک کے اموال پر مشکل ہے۔

مکتوب ۴۹ — ۲۴۲

۱ مکتوب الیہ کی صحت یابی پر شکر خداوندی
۲ دیوبند علمی ادارہ نہیں ہے یا فقیر علمی نمائندہ بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔
۳ آپ جیسے ارباب نظر بھی جب ستائش کرنے لگیں تو جو کچھ خراب نہ ہو کم ہے۔
۴ فاضل گیلانی کی کتاب "قرآنی ادب"

مکتوب ۵۰ — ۲۴۴

۱ شرمندگی قلم پکڑنے کی اجازت نہیں دیتی
۲ اس بندہ کمینہ کی مسلسل فاکہۃ و ابّا کی نعمتوں سے سرفرازی کی جارہی ہے
۳ روزانہ سو سے اوپر ہی آم کٹتے ہیں۔
۴ آموں کے بیچنے کے خلاف پر لطف استدلال
۵ ارباب حقوق تک ان کے حقوق آم ہی کی شکل میں کیوں نہ پہنچیں۔
۶ منہ میں آموں کی قاشیں ڈالتا ہوں اور آپ کو یاد کرتا ہوں۔

مکتوب ۵۱ — ۲۴۶

۱ یہاں انتظار کی گھڑیاں شمار کر رہے ہیں اور گرامی نامہ آیا بھی ہے تو کس کے پاس۔
۲ یاروں نے آپ کی ڈاک خورد برد کر دی
۳ مولوی فضل چار عدیم الجواب خطوط کے مدعی ہیں۔
۴ نزہۃ الخواطر کی طباعت کے لیے کاوش
۵ دار المصنفین کی نظامت مولینا عباری کے سپرد کی جائے۔

عرض مرتب

از
منّت اللہ رحمانی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی رح اپنے زمانہ کی چیدہ شخصیتوں میں ہیں۔ جو تبحرّ علمی، وسعت مطالعہ، غیر معمولی ذکاوت، مثالی حافظہ، اخذ و نتائج اور طرز نگارش کی خصوصی نعمتوں سے سرفراز کیے گئے تھے۔ موصوف نے اپنی کتابوں رسائل اور مضامین کے ذریعہ طویل عرصہ تک دین کی خدمت انجام دی۔ اور علمی دنیا کی پیاس بجھائی۔

حضرت مرحوم کے وصال کے بعد خیال ہؤا اور اس خیال کی تائید آپ کے علمی فرزندوں نے بھی کی، کہ حضرت مولانا کا علمی خزانہ تصنیفات اور مضامین کے ذریعہ جس حد تک عام ہو چکا وہ تو ہو چکا، اب حضرت مرحوم کے وصال کے بعد ان کے علمی مسودات کو مرتب کر کے شائع کیا جائے۔ لیکن میں اپنے تلاش و جستجو سے اس نتیجہ پر پہنچا کہ مولانا نے قلمی مسودات نہیں چھوڑے ہیں۔ اور اگر چھوڑے ہیں تو وہ میری دسترس سے باہر ہیں، پھر ساتھ ہی ساتھ یہ خیال آیا کہ حضرت مرحوم کے علم کا اچھا خاصہ حصہ ان خطوط میں منتقل ہؤا ہے جو آپ نے مختلف حضرات کو لکھے ہیں۔ اور اس وقت ہند و پاک میں منتشر ہیں۔ وقت کی اہم اور کارآمد علمی

خدمت یہ بھی ہے کہ ان خطوط کو جمع کیا جائے اور ان کی ترتیب و اشاعت عمل میں آئے۔

حضرت مولانا کا وصال جون ۱۹۵۶ء میں ہؤا۔ اور میں نے خطوط کی جمع و ترتیب کا کام ۵۷ء کے اوائل میں شروع کر دیا۔ اس سلسلہ میں بہت سے حضرات نے میرے ساتھ تعاون کیا اور کچھ تلخ تجربات بھی ہوئے۔ عام طور پر مکتوب الیہ حضرات نے اصل خطوط یا ان کی مصدقہ نقلیں جلد بھیجدیں۔ اور بعض حضرات نے بار بار کی یاد دہانی کے باوجود برس دو برس انتظار کرایا۔ بہر حال منتشر خطوط کا معتدبہ حصہ دو سال کی محنت میں میرے پاس جمع ہو سکا، ساتھ ہی یہ خیال بھی آیا، کہ اگر خطوط کو یہاں وہاں سے جمع کر لیا جائے اور اسے آگے پیچھے ترتیب دے کر شائع کر دیا جائے۔ تو اس میں مرتب کی محنت کیا ہوئی؟ اس لیے میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اولاً تو ان حضرات کا تعارف کرایا جائے جن کے نام کے خطوط شائع کیے جا رہے ہیں۔ اور پھر خطوط میں جن شخصیتوں، کتابوں، اور مقامات کے نام آئے ہیں، ان پر مختصر تعارفی نوٹ لکھے جائیں۔ ان مکاتیب کی ترتیب میں دراصل یہی میری محنت ہے۔ کسی شخص، کتاب یا مقام پر دو چار سطریں لکھ دینا بظاہر آسان معلوم ہوتا ہے۔ لیکن تجربہ نے بتلایا کہ اس طرح کے نوٹ لکھنا بہت مشکل اور صبر آزما کام ہے۔ اگر مکاتیب صرف مشاہیر کے نام ہوتے، یا معروف مقامات کا تذکرہ ہوتا تو کام اتنا مشکل نہ تھا، لیکن کثرت سے ایسے نام ہیں جن کی شخصیت اپنی جگہ پر کافی اہم سہی لیکن لوگوں میں ان کا تعارف بہت کم ہے، ایسے حضرات کے حالات معلوم کرنا ہمارے خیال میں بہت ہی پیچیدہ اور مشکل کام ہے بعض حضرات کے حالات دریافت کرنے کے لیے دس پندرہ اور بیس بیس خطوط لکھنے پڑے، بعض موقعہ پر دریافت حال کے لیے کسی کو بھیجنا پڑا یا خود جانا پڑا۔

بعض لوگوں کے متعلق دو تین سال کے بعد معلومات فراہم ہو سکیں۔ اس طرح مکاتیب کی ترتیب و تسوید کا کام جو ۱۹۵۷ء سے شروع ہوا تھا ۱۹۶۱ء میں بڑی حد تک پورا ہو سکا۔

کتاب کی ترتیب و تسوید کے بعد طباعت کا مرحلہ سامنے آیا۔ خیال تھا کہ طباعت میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ لیکن اردو کتابوں کے ساتھ جتنی سنتیں وابستہ ہو چکی ہیں اس سے چھٹکارا کس طرح مل جاتا۔ ایک ایک کر کے ساری سنتیں پوری ہوئیں۔ سب سے پہلے ۱۹۶۱ء میں حیدر آباد کے ایک مشہور مکتبہ سے بات چیت ہوئی، اور مسودہ بھیج دیا گیا، اور کئی سال تک وہاں مسودہ پڑا رہا، اور مکتبہ والے ٹال مٹول کرتے رہے۔ مجبوراً مسودہ واپس منگانا پڑا۔ پھر ہندوستان کے مختلف مکتبوں سے خط و کتابت کی گئی۔ لیکن افسوس ہے کہ وہ آمادہ نہ ہو سکے۔ باوجودیکہ رائلٹی وغیرہ کا کوئی سوال نہ تھا۔ کتاب رکھی رہی۔ بعض بزرگوں نے مشورہ دیا کہ خود ہی اس کی اشاعت کا نظم کرو۔ لیکن میں اپنے آپ کو اس کے لیے آمادہ نہ کر سکا طباعت کا کام کچھ ایسا مشکل نہ تھا۔ لیکن اس کی اشاعت اور مکاتیب کا لوگوں کے ہاتھوں تک پہنچانا میرے بس سے باہر کی بات تھی۔ کچھ دنوں بعد ہمارے ایک مخلص نے اس کو شائع کرنا چاہا۔ میں نے اجازت دیدی۔ کتابت شروع ہو گئی، اور نصف سے زیادہ کتابت ہو بھی گئی۔ لیکن پھر کام رک گیا۔ شاید ابھی خدا کو منظور نہ تھا۔ تقریباً دو سال پہلے ہمارے ایک دوسرے مخلص اس کی طباعت کے لیے تیار ہوئے۔ کام پھر شروع کیا گیا۔ اور بحمد اللہ کتابت مکمل ہو گئی۔ کاپیاں بھی پڑھی گئیں۔ امید تھی کہ چند ماہ میں کتاب پریس سے باہر آ جائے گی۔ مگر اس مرحلہ تک بات پہنچ کر پھر رک گئی۔ ہمارے وہ دوسرے مخلص اپنی تمام تر خواہشوں اور کوششوں کے باوجود طبع نہیں کرا سکے۔ آخر میں پھر مخلصوں اور بعض بزرگوں نے

اصرار کے ساتھ مشورہ دیا کہ اسے میں ہی شائع کراؤں: بحمد اللہ طباعت کا کام شروع ہو چکا ہے، اور اس امید کے ساتھ یہ آخری سطر میں لکھ رہا ہوں۔ پھر بھی رہ رہ کر دل میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ دیکھیے مکاتیب کی طباعت کب مکمل ہوتی ہے۔

مکاتیب کے اس مجموعہ میں جسے جلد اول کہنا چاہیے۔ سب سے پہلا خط حضرت مولانا گیلانی علیہ الرحمہ کے بچپن کا ہے، جب کہ مولانا ریاست ٹونک میں پڑھتے تھے، اور ان کی عمر کا سولھواں سال تھا۔ پھر کچھ اور خطوط ہیں، جو مولانا نے دار العلوم دیوبند سے اپنی تعلیم کے زمانہ میں یا فراغت کے بعد اپنے بعض بزرگوں، قرابت داروں اور ہمدرس دوستوں کو لکھے ہیں۔ لیکن اس جلد کا بڑا حصہ ان خطوط پر مشتمل ہے جو حضرت علامہ سید سلیمان ندوی علیہ الرحمۃ اور حضرت مولانا عبد الباری ندوی مدظلہ کے نام ہیں۔ حضرت مولانا عبد الباری صاحب ندوی نے اپنے نام والے خطوط پر کہیں کہیں نوٹس لکھے ہیں۔ اس کے آگے "ع" بطور علامت لکھدیا گیا ہے۔ بقیہ سارے نوٹس و حواشی راقم عاجز کے قلم سے ہیں۔ شخصیات، مقامات اور کتابوں پر لکھے ہوئے ان تمام نوٹس کی فہرست آخر میں دے دی گئی ہے۔

اس مجموعہ میں ہماری ایک محنت مکاتیب کی تفصیلی فہرست بھی ہے۔ مکاتیب کی حیثیت نجی گفتگو کی ہوا کرتی ہے، جس میں مرتب اور مربوط علمی تحقیقات کی تلاش "زیادتی" ہے۔ مولانا گیلانی کے مکاتیب بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ مولانا رح کے تقریباً ہر مکتوب میں علمی تحقیق اور بڑے کام کی باتیں مل جایا کرتی ہیں۔ لیکن انھیں تلاش کرنا خود ایک کام تھا، مولانا کے منتشر جواہر پاروں تک آسانی کے ساتھ پہنچنے کے لیے کتاب کی ابتدا میں ہر

مکتوب کی تفصیلی فہرست شامل کر دی گئی ہے۔ حضرت مولانا عبدالباری صاحب ندوی نے راقم الحروف کی فرمائش اور اصرار پر بڑا نادر سنگم ۔ "دل و دماغ کا" کے عنوان سے ایک تحریر لکھ کر دی ہے۔ جو بطور مقدمہ شریک اشاعت کی جا رہی ہے۔ اس تحریر سے فاضل گیلانی کی زندگی کے بعض ایسے پہلو بھی سامنے آ گئے ہیں جو یقیناً عام لوگوں کی نظروں سے مخفی تھے۔ اور جن کی وجہ سے مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے معاصرین میں خصوصی امتیاز حاصل ہے۔ مولانا عبدالباری صاحب ندوی کی اس تحریر کے بعد مکاتیب جلد اول کے لیے میں کسی اور مقدمہ کی ضرورت نہیں سمجھتا۔

ان مکاتیب کے جمع و ترتیب اور تسوید و تبییض میں متعدد بزرگوں اور بہت سے احباب و عزیزوں نے میرا ہاتھ بٹایا ہے۔ میں سبھوں کا شکر گذار ہوں۔ حق تعالیٰ مجھے بھی اور معاونین کو بھی علمی و دینی خدمت کی توفیق عطا فرمائے اور اسے شرف قبول بخشے۔ (آمین)

منت اللہ غفرلہٗ
خانقاہ رحمانی ۔ مونگیر

۱۳ ذی قعدہ ۱۳۹۰ھ
۱۱ جنوری ۱۹۷۱ء
دوشنبہ

مقدمہ

از

مولانا عبدالباری صاحب ندوی

بڑا نادر سنگم ـــــــ دل و دماغ دونوں کا

مقصود اوراقِ ذیل کا نہ صاحبِ مکتوبات کی عمری سوانح و واقعات ہیں، نہ علمی و فکری، قلمی و تصنیفی کمالات و کارناموں کی کوئی تفصیل و تحقیق، نہ خود مکتوبات پر کوئی ادبی و انشائی تبصرہ و تنقید، ان سب کے لیے اس نا اہل مکتوب الیہ کے سوا صاحبِ مکتوبات کے دوسرے دوستوں، شاگردوں اور معتقدوں میں ماشاء اللہ ایک سے ایک بڑھ کر اہل موجود ہیں۔ راقم عاجز کو مرتب مکتوبات حضرت مخدوم ابن مخدوم مولانا شاہ منت اللہ صاحب مدظلہ کے امتثالِ امر میں صرف یہ خیال آگیا کہ قریباً چوتھائی صدی کے قریب تعلقات کے علم و واقفیت پر مبنی صاحبِ مکتوبات کے قلب و باطن کی زندگی کے بعض ایسے گوشوں کو خصوصاً اُجاگر کر دیا جائے جن پر دوسروں کی نظر کم پڑی ہوگی، واللہ اعلم بالصواب۔

دماغ و ذہن کے چھوٹے بڑے کمالات کی دولت رکھنے والے تھوڑے بہت ہر جگہ ہر زمانہ میں مل جاتے ہیں، لیکن دل کی دولت والے یا قلب و روح کے باطنی

فضائل کے مالک ڈھونڈے بھی ہمیشہ کم ہی ملتے ہیں، اور دونوں کی جامعیت تو کمیاب کیا نادر و نایاب ہوتی ہیں۔ بلکہ دیکھا یہاں تک جاتا ہے کہ ذہن و دماغ کی غیر معمولی صلاحیت و عبقریت والے اسی نسبت سے بالعموم قلب و باطن یا دین و دل کے محاسن سے محروم ہوتے ہیں۔ خالص دینی علوم و تعلیم کے علمی و قلمی نمایاں جوہر رکھنے والوں تک کو ایمان و یقین، صدق و اخلاص، ایثار و بے نفسی، تواضع و مسکنت فنائیت و عبدیت وغیرہ کے باطنی و روحانی صفات میں اکثر خام یا ان سے خالی ہی پایا جاتا ہے۔

بھولنا نہ چاہیے کہ دین و دل کا ساتھ چولی دامن کا ہے۔ قلب سلیم کے بغیر "یوم دین" کی حاضری میں نہ کوئی چیز کام آسکے گی نہ وہاں کی رسوائی سے بچا سکے گی۔ لا تخزنی یوم یبعثون لا ینفع مال ولا بنون الا من اتی اللہ بقلب سلیم۔

مشہور حدیث ہے "دل بنا تو سب بنا، یہ بگڑا تو سب بگڑا"۔

حضرت گیلانی (جعل اللہ فی قبرہ نورا کما جعل فی قلبہ نورا) کے ذہنی و دماغی علمی و قلمی گوناگوں کمالات کسی تعریف و تعارف کے محتاج نہیں۔ خصوصاً اس بے علم کے قلم سے البتہ اس سلسلہ میں ایک بڑے خاص کمال کا علم و اندازہ جتنا اور جیسا کہ چاہیے لوگوں کو کم ہے۔ وہ ان کی بہت خاص الخاص قرآن مجید کی فہم و تفہیم تھی۔ ان کی انفرادی و فکری بڑائیوں میں راقم ہذا کی نظر میں یہی سب سے بڑی بڑائی تھی۔ بقول خود "بیچارے مولوی نے سمجھا ہی نہیں" کہے نہ سمجھنے کے ڈر سے چھپاتے بہت تھے۔ سورۂ کہف کی تفسیر شائع بھی ہونے دی تو اپنے خاص رنگ و ذوق کی چیزوں کو دبا دبا کر ہی زبان قلم تک آنے دیا۔ کچھ شک نہیں کہ بارہا ان کے ذہن کی تیزی اس راہ میں جتنی دور نکل جاتی وہ خلاف

احتیاط ہی نہیں، ایمان وعمل کے لیے خطرناک بھی ہو جاتی تھی۔ خصوصاً عوام کے حق میں، تاہم ان کی ژرف نگاہی اور دوررس ذہن ایسے بہتیرے حقائق کو پالیتا جن پر سلف سے خلف تک شاید ہی کسی مفسر قرآن کی نگاہ پڑی ہو۔ اور یہ "لا تنقضی عجائبہ" والی کتاب کے اعجاز کی عین شہادت ہے۔

اس زندہ کتاب کو حضرت مرحوم تفسیری کتابوں سے زیادہ زندگی کی زندہ کتاب اور زندہ واقعات ومشاہدات سے سمجھنے سمجھانے کی کوشش کرتے تھے۔

ایک مثال یاد آئی، سورۂ واللیل کی یہ آیتیں پڑھیے: ان سعیکم لشتی فامامن اعطیٰ واتقیٰ وصدّق بالحسنیٰ فسنیسرہ للیسریٰ واما من بخل واستغنیٰ وکذب بالحسنیٰ فسنیسرہٗ للعسریٰ۔

انسان اپنے انفرادی واجتماعی حوائج وضروریات، مقاصد واغراض پورے کرنے کے لیے مختلف مساعی وتدابیر اختیار کرتا ہے۔ (ان سعیکم لشتی) لیکن ان کی راہیں اصولی طور پر دو ہی ہوتی ہیں۔ ایک خدا پرستی کی، ایک دنیا پرستی یا خدا گریزی کی۔ بس جو عطا وانفاق، داد ودہش اور خدا سے خوف وتقویٰ یا عملاً نیکی کی راہ اختیار کرتا ہے (صدق بالحسنی) اس سے خدا کا وعدہ ہے کہ ہم اس کی ذہنیت کو آسان پسند بنادیں گے[1] تاکہ وہ اپنی ان مساعی وتدابیر میں آسانی کی راہیں

[1] یہ ترجمہ کرتے وقت طبیعت ذرا جھجک رہی تھی، مگر روح المعانی میں "خصلت" کا سا ایسا لفظ نکل آیا جس کا لفظی ترجمہ آج کل کے محاوروں میں "ذہنیت" ہی ہو سکتا ہے۔ فسنھیئہ للخصلۃ التی تودی الی یسر وراحۃ "یعنی ہم اس کی خصلت (باقی ص۲۹ پر)

اختیار کرے۔ بخلاف اس کے جو بخل وامساک اور خدا سے روگردانی یا عملاً نیکی کی تکذیب (کذب بالحسنیٰ) یا اس سے گریز کی راہ اختیار کرتا ہے اس کی ذہنیت ہم دشوار پسند بنادیں گے۔ تاکہ وہ اپنی ان مساعی وتدابیر کی راہیں اختیار کرلے۔

آسان کو آسان کر دینے کا مطلب تو خیر یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ اس میں مزید آسانی پیدا کردی جائے گی۔ لیکن دشوار کو آسان کر دینا بظاہر خدا و نیکی سے روگردانی کرلے والوں کی سزا کیا الٹے انعام ہوا!

تفسیروں یا ترجموں میں جی کو لگتی ہوئی بات نہیں ملتی۔ مفسر گیلانی کے نزدیک صاف سیدھا مطلب یہ تھا کہ کسی معاملہ میں سعی وتدبیر کی جو راہ فی نفسہٖ آسان ہے خدا پرستوں اور نیکوکاروں پر خدا وہی آسان کر دیتا ہے اس کے برعکس جو خدا ونیکی سے بغاوت وروگردانی کرتے ہیں اس کی سزا دنیا ہی میں یہ دی جاتی ہے کہ سعی وتدبیر کا فی الواقع ونفس الامر میں جو راستہ دشوار گذار ہے ان کی کج نگاہی کو وہی آسان نظر آنے لگتا ہے۔ اور اس پر چل کر کج روی کا خوب مزہ چکھایا جاتا ہے۔

اس زمانہ میں روز افزوں خدا فراموشی بلکہ خدا گریزی کی ترقی کا ایک

ایسی بنادیں گے جو اس کو آسانی وراحت کے طریقوں کی طرف لے جائے گی اسی طرح مکذبین کی ذہنیت ایسی بنادیں گے جو ان کی دشواری وسختی (الی العسر والشدۃ) کے طریقوں سے ڈھکیلے گی۔

بڑا دل زندگی کے ہر شعبہ میں مشکل پسندی یا طوالت و پیچیدگی والے طریقوں اور تدبیروں کی بھرمار ہے۔ سیاست ہو کہ حکومت، قانون ہو کہ عدالت، معیشت ہو کہ معاشرت ہر چیز شیطان کی آنت اور ہفت خوان! کسی دفتر میں ذرا کوئی کام پڑ جائے "دفتریت"[1]، کا مزہ چکھ لیجیے۔ عدالتی چکر مشہور ہی ہیں معمولی معمولی مقدموں میں برسوں

---

[1] اس دفتریت کا لال فیتہ (RED TAPE) اپنی طوالت و طوماریت کے لیے تو خود ان دفتریت والوں ہی میں کیا کم نیک نام ہے اس شیطانی آنت کی پیمائش کا تازہ ترین ریکارڈ خود اپنے ملک کا بزبانِ "صدق" سن لیں کہ ۱۹۵۸ء تا ۱۹۵۹ء صرف ایک سال کی مدت میں یہ لال فیتہ جو حکومت کے صرف مرکزی دفتروں میں استعمال ہوا ہے اس کی مقدار پچپن لاکھ گز تھی" پھر جمہوریہ ہند کی ساری ریاستوں کے لاکھوں دفتروں کو ملا کر اس دفتری طومار کی طوالت کروڑوں کروڑ گز تک کی خبر تو لیتی ہی ہوگی بقول صاحب صدق ہی کے آج سے قبل اتنی جکڑ بندیاں، زندگی کے لیے ہر ہر قدم پر اتنی پابندیاں اتنے فارموں کی خانہ پری اتنے کاغذات پر دستخط، مکان کی تعمیر کے لیے سیمنٹ کی ضرورت ہو تو درخواست دیجیے، سفارشیں اٹھوائیے، باقاعدہ پیروی کیجیے۔ فلاں چیز پر کنٹرول، فلاں چیز کے لیے لائسنس زندگی ہے۔ یا کوئی طوفان ہے" "ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے" اکبر الٰہ آبادی کو دل لگی مقصود نہ تھی (حقیقت کی ہلکی سے ہلکی ترجمانی تھی کہ) "ہر گام پہ چند آنکھیں نگراں، ہر موڑ پہ اک لائسنس طلب"

(صدق جدید ۱۵ر جولائی سنہ ۱۹۶۰ء)

ابھی لکھنؤ ۱۰ر جولائی سنہ ۱۹۶۰ء کو ایسی طوفانی ہولناک بارش سے گذرا جس کی نظیر ماضی میں قطعاً کسی کو معلوم نہیں کسی مکان کی تعمیر کے لیے نہیں، اس عظیم مصیبت میں صرف معمولی مرمت کے لیے بوری دو بوری سیمنٹ خود اپنے بڑے مکان کے لیے آج تک مہینوں میں دستیاب نہ ہوئی! اعلان

لگ جانا کوئی بات نہیں[1]۔ وقت و قوت کی کوئی قیمت نہیں رہ جاتی۔ جان و مال ضمیر و ایمان ہر چیز کو داؤں پر لگا دینا پڑتا ہے جس قدر محکموں پر محکمے، اور دفتروں پر دفتر بڑھتے جاتے ہیں، اسی قدر معمولی معمولی آسان سے آسان کام دشوار سے دشوار ہوتے جاتے ہیں گویا ہر معاملہ میں دشواریوں کو بڑھاتے جانا ہی آسان بن گیا ہے بس یہ کچھ ویسی ہی آسانی ہے کہ ع

مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

"اعطی واتقی" والی (خدا پرستی) کی زندگی کی آسانیوں اور "بخل واستغنی" والی (خدا چھوڑی) زندگی کی خود پیدا کردہ دشواریوں کا ایک بڑا عذاب آ گئے، دن کے معاملات میں باہمی بے اعتمادی ہے۔ مثلاً حدیث کی رو سے قرض دینے کا ثواب صدقہ سے بھی زیادہ ہے۔ اگر کسی معاشرہ میں قرض کا لین دین بے تکلف اس طرح جاری ہو کہ خدا اور آخرت کے تعلق و خوف کی بنا پر ایک طرف اہل وسعت کو "من بخل" والے بخل و امساک کے

ہوا کہ ہاؤس ٹیکس کی رسید پیش کرنے پر ملیگی، وہ پیش کی گئی تو کہا گیا اس پر کسی اوورسیر کے دستخط ہوں، اوورسیر نے کہا انجنیر کے ہوں۔ ہنوز دو مہینوں پر بھی روز اول۔ اور تو اور کسی اور نے نہیں خود ہندوستان کے جواہر لال نہرو جیسے وزیر اعظم نے اسی سیلاب کے مصیبت زدوں کی مدد کے لیے دس ہزار کا چیک بھجوا دیا تھا وہ بھی کارپوریشن کے میئر اور ڈپٹی میئر کی باہمی لاگ ڈانٹ اور نفسا نفسی کی بدولت آج سیلاب کے دو مہینوں بعد تک ان مصیبت زدوں کے کام نہ آ سکی۔ اور دفتری حیلوں ہی کا نام لے لگا کر ٹالی جا رہی ہے خدا پرستی یا "صدق بالحسنی" کے بجائے خود پرستی یا "کذب بالحسنی" کا زور لازماً لال فیتہ والی دفتری حیلہ جوئیوں کے کڑوے کریلے کو اور نیم چڑھا دیتا ہے۔

[1] خود شامت زدہ راقم کو تو کسٹوڈین کی طرف سے ایک دعوی میں پھنسے ہوئے بارہ سال ہو چکے اور اب ایک سال سے زیادہ ہو چکا ہے ہائی کورٹ میں پڑا ہے۔

بجائے اجر و ثواب کے لیے "من اعطیٰ" والے اعطاء و انفاق کی فکر و حرص لگی ہو اور دوسری طرف خدا ہی کے خوف "من اتقیٰ" کی بنا پر لینے والوں کو خود ہی جلد از جلد عطا کرنے کی فکر رہتی ہو۔ اس طرح کہ دینے والوں کو قانونی تحفظات اور چارہ جوئیوں وغیرہ کیا تقاضوں پر تقاضوں تک پریشانیوں میں مبتلا ہونا نہ پڑے تو اہل حاجت کے وقت پر کتنے کام آسانی سے نکلتے رہ سکتے ہیں۔ خود راقم احقر کو اللہ تعالیٰ نے ہزاروں تک قرض دینے کی وسعت و توفیق بخشی۔ لیکن آخر میں تنگ آ کر بس اتنی ہی ہمت رہ گئی کہ اتنا ہی دیا جائے کہ وصول نہ ہونے پر بے تکلف معاف کر دیا جائے۔ باقی تقاضوں وغیرہ کی پریشانی وبے لطفی میں ڈالے بغیر ادا کرنے والی مثال صرف ایک ہی آدھ یاد ہے۔ ورنہ عام عادت و نیت، تجربہ ہوا کہ لوگوں کو ٹالتے رہنے یا نہ دینے ہی کی رہ گئی ہے۔ خیال کرنے کی بات ہے کہ دینی و اسلامی زندگی کی ایک کتنی بڑی آسانی (یسریٰ) کو ہم نے اپنے ہی ہاتھوں دشواری (عسریٰ) بنا لیا ہے۔ حتیٰ کہ اب ہم کو یہی آسان نظر آتا ہے کہ قرض لینے دینے میں سود بھی بے تکلف لیں، دیں اور قانونی تحفظات کی پیچیدگیوں اور بارہا مقدمات تک کی مصیبتوں کو بھی خریدیں فسنیسرہ للعسریٰ کے سوا یہ کیا ہے۔

گیلانی تفسیر کی ایک اور مثال خود مکتوبات گیلانی میں پڑھیں پیش نظر اسی زمانہ کی دنیا ہے۔ ارشاد ہے کہ "دنیا اس طرح کانپ رہی ہے، لرز رہی ہے کہ بڑے بڑوں کے پاؤں ڈگمگا رہے ہیں۔ پھر ہم جیسے ناکسوں گیاہ ضعیف کا جو حال بھی نہ ہو۔

ادھر سورۂ یونس کی تلاوت میں کچھ استغراق ہوا، کچھ ایسا واضح ہوا کہ

"آیات" کے بعد "انذار" سے کام لیا جاتا ہے۔ اور جب "انذار" کو غیر موثر بنا کر چھوڑ دیا جاتا ہے، تب فیصلہ کا وقت آ جاتا ہے" وما تغنی الآیات والنذر عن قوم لا یومنون۔ اس میں "الآیات" اور "النذر" کا ذکر فرما کر آگے ارشاد ہے فهل ینتظرون الا مثل ایام الذین خلوا من قبلهم (الآیہ)

کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جن حالات سے دنیا گذر رہی ہے یہ "نذر" کے حالات ہیں، "قوم لا یومنون" پر ان نذر کا کوئی اثر مرتب نہ ہوا۔ بلکہ اسی سورہ میں مکر فی الآیات کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔ (یعنی) ذہانت کے زور سے ہر واقعہ کی ایسی توجیہ کہ اصل کارفرما طاقت (خدا) پر پردہ پڑ جائے۔ اور جو واقعی اسباب نہیں ہیں ان ہی کی طرف حوادث کو منسوب کرنے کی مشق شاید یہی مکر فی الآیات ہے۔

"شاید" کیا "مکر فی الآیات" سے بہتر "ماڈرن مکر" کی اور کوئی تعبیر کیا ہو سکتی ہے۔ البتہ ہر زمانہ کے مکر کی نوعیت و صورت ایک ہی ہونا ضروری نہیں، تاہم اس زمانہ کی ترقیوں کا یہ مکر ایک بڑا دجالی نمونہ ہے۔ آگے ہی بالکل بجا ارشاد ہے کہ:۔

"اس زمانہ میں جتنا زور اس مکر کا ہوا ہے، شاید کبھی نہیں ہوا ہے۔ بہرحال فیصلہ شاید زیادہ دور نہیں، بس اتنا اطمینان ہے کہ منتظر بنا دینے کے بعد ارشاد ہوا ثم ننجی رسلنا والذین

آمنوا کذالک حقا علینا ننج المومنین " اس آہلکہ عظیم
سے ایمان والوں کو نکال لینے کا تماشہ عجیب ہوگا۔ کیسے ہوگا۔
سمجھ میں نہیں آتا۔ مگر ہوگا ضرور "

بشرطیکہ۔ حقا علینا ننج المومنین " کے اٹل وعدہ بشارت والے " المومنین " ہم بھی ثابت ہوں۔ ورنہ اب تو ہم بھی ان " مکر فی الایات " کی راہوں کو ہی عین ترقی جان کر ان ہی پر دوڑنے میں ترقی کر رہے ہیں۔

اسی سلسلہ میں نظم قرآن کے متعلق فرماتے ہیں کہ " اور کیا عرض کروں سورۂ یونس کی ان آیتوں میں پہلے جتنی بے ربطی محسوس ہوتی تھی اب اس قدر بلکہ اس سے زیادہ منطقی ترتیب کی یافت ہوتی جارہی ہے " اس راقم کو بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب سے جو شُد بُد کچھ مناسبت عطا فرمادی ہے بارہا اس کی بدولت بظاہر بلفظ بے ربط آیتوں میں ایسے ربط و ترتیب کی یافت ہوجاتی ہے جس کے لیے منطقی کیا، خدائی " نظم و ترتیب کے سوا کوئی نام ہی سمجھ میں نہیں آتا۔ آخر میں ہم مسلمانوں کے لیے زیادہ کان لگا کر سننے کی بات یہ ہے کہ :۔

" ہاں آخر میں جو فرمایا گیا فلولا کانت قریۃ آمنت
فنفعھا ایمانہا الا قوم یونس لما آمنوا کشفنا عنھم
عذاب الخزی فی الحیوۃ الدنیا ومتعنٰھم۔ مگر مغرور
انسانی آبادیوں کو شاید اس کی توفیق پہلے بھی کم ہوئی ہے اور

اب تو اس کی راہ بند ہی معلوم ہوتی ہے "
(مکتوبات گیلانی صفحہ ۱۴۲ المبیضہ)[1]

عام " مغرور انسانی آبادیوں " کا نام کس منہ سے لیا جائے جب خود اسلام کا نام لے کر " قوم محمد (علیہ الصلوٰۃ والسلام) ہی کو " قوم یونس " والے " ایمانی نفع " کی فکر کیسی اس پر ایمان ہی جیسا کچھ ہے ظاہر ہے۔ پھر اس کے ساتھ رسوائی کا عذاب (عذاب الخزی) بھی جس طرح ہر طرف سے محیط و مسلط روز بروز ہوتا جارہا ہے خصوصاً آنکھوں کے سامنے خود ہندوستان میں —— وہ ظاہر سے بڑھ کر ظاہر ہے۔ ستم ظریفی یہ کہ اس عذاب سے نجات کی راہ کا سوال ہوتا ہے کہ " مسلمان کیا کریں " ؟ تو اس کے جواب میں " کشفنا عنھم عذاب الخزی " والے ایمان و اسلام کی طرف متوجہ کرنے کرانے کے بجائے مسلمان لال بجھکڑ لیڈر بھی " مکر فی الایات " والوں ہی کی راہیں زیادہ دکھلاتے ہیں۔ غضب پر غضب کہ علماء تک کی جماعت ان ہی ائمہ کی مقتدی بن رہی ہے۔

میں مولانا سے ہمیشہ اور ہمیشہ سے زیادہ وظیفہ پر سبکدوشی کی فرصت و فراغت کے دنوں میں بارہا درخواست کرتا رہا کہ اب ہر طرف سے یکسو ہو کر اپنی

---

[1] وہ مبیضہ مراد ہے جو راقم ہذا کے مکتوبات کا حضرت مرتب نے صاف کرا کے بھیج دیا ہے۔ آگے بھی اسی کے بعض اور حوالے ہیں۔

ان خاص قرآنی "یافتوں" ہی کو جمع و مرتب فرما دیں، مگر کتراتے ہی رہے۔ بڑی وجہ بظاہر وہی "پیارے مولویوں" کی ناراضی کا ڈر کہ تفسیری دفتروں کے خلاف بعض باتوں پر خدا جانے کتنا شور و شغب اٹھ کھڑا ہو۔ ایک مکتوب ہی میں کہتے ہیں "مگر جب ان آیتوں کی تفسیر کسی کتاب میں پڑھتا ہوں تو ساری شیرینی جو قلب میں پیدا ہوئی تھی، معلوم ہوتا ہے کہ واپس ہو گئی۔"

(صفحہ ۱۳۵ سفینہ ۲۱ اگست ۱۹۳۵ء)

بات یہ ہے کہ قرآن مجید کوئی علمی و فنی قسم کی کتاب بالکل نہیں۔ اصلاً زندگی کا عملی ہدایت نامہ (ایک آف گائیڈنس) ہے۔ اس لیے جس قدر زیادہ اپنے پرائے، انفرادی و اجتماعی آئے دن پیش آتے رہنے والے زندگی کے معاملات و مشکلات پر پیش کرنے اور ان کی روشنی میں اس کو پڑھنے پڑھانے سمجھنے سمجھانے اور اس سے راہ یابی کی کوشش کی جائے، اسی قدر یہ کتاب قدرۃً سرچ لائٹ کی طرح دور دور تک راستہ دکھلاتی چلی جائے گی، بلکہ میں تو کہا کرتا ہوں کہ شروع شروع میں تفسیر ہرگز نہ دیکھی جائے۔ "ترجمان حقیقت" کی زبان سے بڑی حقیقت ادا کر دی گئی ہے کہ ؎

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

اپنی عادت تو بتوفیق اللہ یہ ہو گئی ہے کہ عام علمی و عملی مسائل و مشکلات

ہی میں نہیں، نجی سے معاملات میں بھی جب کوئی لاینحل الجھن گھیر لیتی ہے تو جس تلاوت میں اس کا حل ڈھونڈنے لگتا ہوں، اور عموماً ایک آدھ دورہ ہی میں ایسی آیات مل جاتی ہیں کہ گویا خاص اس مسئلہ و معاملہ ہی میں اور اسی موقع پر ان کا نزول ہوا ہے۔ پھر ملتے جلتے معنیٰ و مفہوم کی دوسری آیات کو ملا کر تفکر و تدبر سے شرح تام ہو جاتا ہے۔ آگے کام صرف ہمت و عمل کا رہ جاتا ہے۔ البتہ کسی لفظ و لغت میں کوئی دشواری ہوتی ہے تو لغت کی کتابوں کی طرف رجوع کرنے سے اکثر مزید فوائد کے ساتھ مزید اطمینان ہوتا ہے۔ باقی تفسیروں کا درجہ اگر کچھ ضرورت رہ گئی —— جو کم ہی رہ جاتی ہے —— سب سے آخر میں آتا ہے اور تب ہی تفسیروں میں کبھی کبھی کوئی پتہ کی بات ہاتھ آجاتی ہے۔

اس بے علم کی نظر میں مولانا کے فکری و علمی کمالات کا وقت کے سب سے کا سا آمد و یادگار کارنامہ —— خصوصاً جدید ذہنوں یا نئی تعلیم والوں کے حق میں —— ان کی قرآنی "یافتوں" کا ذخیرہ ہی ہوتا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ کہف کے سوا قصداً انھوں نے اہتمام فرمایا کہ اس سلسلہ کی کوئی اور مستقل چیز منظرِ عام پر نہ آنے پائے۔ پارۂ عم کا مسلسل درس سالہا سال تک حیدر آباد میں اپنے مختلف قیام گاہوں کی قریبی مسجدوں میں درس دیتے رہے۔ اس میں شریک ہونے والے زیادہ تر نئی روشنی و تعلیم والے ہی ہوتے۔ اس کی یادداشتوں کی بیاض یاد آتا ہے کہ میں نے خود ان کے پاس دیکھی۔

بلکہ شاید ایک آدھ مرتبہ کچھ مستفید ہونے کی بھی کوشش، غالباً کچھ نامحرم ہی پاکر مجھ کو بھی زیادہ موقع ملنے نہ دیا۔ زبانی البتہ کبھی کبھی مستفید فرماتے رہے۔ وفات کے بعد بعضوں کو کچھ لکھا لکھایا بھی اگر کم از کم پارۂ عم کی یادداشتیں بھی دستیاب ہو جائیں مگر کسی سے کچھ پتہ نہیں ملا۔ ان سطروں کے کسی پڑھنے والے کو کوئی سُراغ مل جائے تو انشاء اللہ حضرت مرحوم کی بڑی گراں مایہ یادگار کی حفاظت ہو جائے گی۔

یوں مولانا کے علمی و ذہنی کمالات پر ایک بالکل اچٹتی یا غلط انداز نظر کا عالم بھی یہ تھا کہ دس بیس منٹ میں جو پاس بیٹھ جائے ان کے تفوق سے مسحور ہوئے بغیر نہ اٹھتا۔ ہر طرح کے علمی و دینی معلومات کی بہتات، ان سے عجیب عجیب نتائج و استنباطات، پھر حُسنِ تعبیر کی نُدرت و برجستگی۔ ہر چیز بجائے خود "دامنِ دل" کے لیے "کرشمۂ دلِ کش" ہوتی۔ نجی و مجلسی گفتگو یا خطاب خاص سے اوپر عام خطاب یا خطابت سنیے، تو یہ کمالات اور زیادہ مبہوت کر دیتے تقریر سے آگے تحریر و تصنیف کو دیکھئے تو گیلانی اشہبِ قلم اس میدان میں بھی بڑے سے بڑے ہم چشموں سے پیچھے نہیں، نہ کم، نہ کیفاً۔ ایک متبحر عالمِ دین کی میزان پر کھیے، تو معقول و منقول، تفسیر و حدیث، فقہ و کلام، سیرت و سوانح، تعلیم و تصوّف وغیرہ وغیرہ جس شعبہ میں جو کارنامہ چھوڑا ہے کیا اس کو صفِ اوّل کی متانت جگہ سے بھی کم کسی جگہ پر رکھا جا سکتا ہے۔ خالص عصری مطالبات یا نئے

چلن کی چیزوں میں اسلامی پہلو ہے جو بیسوں مضامین و مقالات اور کتابیں ان کے قلم کی مرہون ہیں۔ ان میں مثلاً ایک اسلامی معاشیات کیا اپنے موضوع کے خاص نقطۂ نظر سے کسی ہم پلہ کتاب کے مقابلہ میں کم وزن ہے۔ یوں بھی بالعموم ان کے نوشتوں میں جدید مواد و معلومات پر جتنی اطلاع ملتی ہے خود جدید تعلیم کے دعویداروں میں بھی کتنے مقابلہ کر سکتے ہیں[1]۔ پھر تحقیق و تنقید کے جدید معیار پر بھی ان کی کتنی چیزیں ایسی ملیں گی، جن کے اخذ و استفادہ کے بل پر یورپ و امریکہ کی یونیورسٹیوں سے ڈاکٹریٹ نہ حاصل کر لی جا سکتی ہو۔ خود اپنے شاگردوں سے آخر خود ہی ریسرچ کا کام لے اور کرا کے کتنوں کو ڈاکٹر بنا ہی دیا۔

ایسا نہیں کہ مولانا کو اپنے ان بے شمار وہبی و کسبی کمالات کا کوئی احساس

---

[1] حتیٰ کہ خود ان کے ایک انگریزی داں رشید شاگرد (ڈاکٹر غلام محمد حیدرآبادی ثم کراچوی سلمہٗ) کو مغالطہ ہو گیا کہ وہ مولانا انگریزی کتابوں کا بے تکلف مطالعہ فرما لیتے تھے۔ اس لیے ان کی جدید معلومات اور ان پر تنقید معتبر تھی۔ (المقالات احسانی صفحہ...) حالانکہ بے تکلف کیا با تکلف بھی اور کتابوں کیا، چار سطروں کا بھی مطالعہ نہیں فرما سکتے تھے۔ ۱۲

وشعور نہ تھا، اتنے ذہین وذکی اتنے بے حس وبے شعور کیسے ہوتے، ذہنی وعلمی اپنی برتری کا بھی شعور تھا، اپنی کتابوں، مضمونوں وغیرہ پر اعتراض ونکتہ چینی کو بھی محسوس فرماتے، گراں خاطر بھی ہوتے، جواب بھی دیتے، لیکن تمام کمالوں سے بڑھا ہوا کمال ان کا یہی تھا کہ وقتی وطبعی تاثر کے سوا قلب کی سلامتی میں کوئی مستقل فرق نہ آنے پاتا۔ یعنی کسی کی طرف سے کسی ظلم وزیادتی کے باوجود دل میں کوئی گرہ دو چار دن کیلئے بھی نہ پڑتی نہ وہ "غل" کیفیت پیدا ہوتی جس سے بچتے رہنے کی قرآن نے خاص طور پر دعا کی تعلیم فرمائی، ——— ربنا لا تجعل فی قلوبنا غلا للذین آمنوا ——— نہ ملنے جلنے، خط وکتابت وغیرہ کسی چیز میں اپنی دینی ودنیوی علمی وذہنی برتری یا دوسروں کو ان کی کمتری محسوس کراتے بلکہ خوردوں شاگردوں تک کو اتنا بڑھاتے کہ بزرگوں بڑوں کے لیے زبان ولغت جواب دے جاتے۔ حضرت حالی کی طرح حضرت گیلانی نے بھی کہنا چاہیے "اپنی خاکساری" کا مستقل کام ہی یہ بنا رکھا تھا کہ ہر حال وقال سے "ہر ادنیٰ کو اعلیٰ" بناتے رہیں ؎

خاکساری اپنی کام آئی بہت ہم نے ہر ادنیٰ کو اعلیٰ کر دیا

لہ طالب علمی کے زمانہ کی ایک زیارت میں حضرت حالی کا خود اس طالب علم کو یہ تجربہ ہوا کہ گویا وہ معمولی طالب علم ہیں۔ اور یہ طالب علم کوئی بڑا عالم یا ان کا استاد وبزرگ ہے۔ ۱۲

سالہا سال روزمرہ ہر طرح کے نجی سے نجی اور قریبی سے قریبی تعلقات ومعاملات کا سابقہ رہا۔ ایک بات بھی یاد نہیں جس میں بات کی پچ یا نفس ونفسیات کی ضد اور ہٹ کا کوئی نام ونشان ملا ہو۔ بلکہ دوسروں کی سخن پروری وخود رائی کے سامنے خود ہی سپر ڈال دیتے مزاحمت ومقابلہ طبیعت میں تھا ہی نہیں، فنا ہی فنا کا غلبہ رہتا، اس فنائیت کی قدر پوری طرح جب ہوتی ہے کہ علم وقلم دین ودنیا کی کوئی بڑائی رکھنے والے خصوصاً ان کے ہم عصروں کے رنگ روش کا اس پہلو سے مقابلہ پڑتا ہے۔ اس لحاظ سے مولانا کو اپنے ہم چشموں میں فرد فرید ہی پایا۔ یاد رہے کہ دنیوی جاہ ومال میں بھی ان کا سر اللہ تعالیٰ نے اونچے اونچے ہم سروں سے نیچا نہیں رکھا تھا، لیکن نمونہ وہ دنیا کی پوری زندگی میں "اللھم احینا مسکینا" والی مسکنت ہی کا بنے رہے۔ طالب علمی سے عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ دینیات کی صدارت تک اس مسکنت میں ذرہ برابر فرق کسی دیکھنے والے نے نہ دیکھا ہوگا۔ بنگلہ میں رہ اور موٹر میں چل کر بھی وہ دیوبند کے حجرہ میں رہنے والے اور اس کی گلیوں میں چلنے والے "مسکین" طالب علم ہی معلوم ہوتے رہے۔

یہ سارے مظاہر وشیون اس کے تھے کہ کفر کے بعد قلب کے سب سے بڑے شیطانی مرض کبر کا حضرت مرحوم کے قلب میں کوئی شائبہ جگہ نہ پا سکا تھا۔ کبر وجاہ کا یہ ایمان لیوا مرض ہوتا ہی ایسا ہے کہ ایمان بچ بھی جائے، بلکہ انسان عند بقیت

کے درجہ کو بھی پہنچ جائے، تب بھی مشہور ہے کہ صدیق کے قلب سے بھی یہ مرض سب سے آخر ہی میں نکلتا ہے۔ ۳۳-۳۴ سال اس دُنیا میں ان سے دُور و نزدیک کے تعلقات کی سعادت حاصل رہی۔ ان میں بھی قریباً چوتھائی صدی کی طویل و مسلسل قیام و طعام خِلوت و جلوت، سفر و حضر، صحت و مرض وغیرہ کے ہر حال میں شب و روز کی یکجائی و رفاقت کی بدولت جس طرح جتنا موقع ان کے علمی و عملی، دینی و دنیوی، ظاہری و باطنی احوال کو قریب سے دیکھنے کا نصیب رہا، یقیناً اس خوش نصیبی میں کوئی دوسرا شریک نہیں۔ آج ان سطروں کو سپردِ قلم کرتے اور از سرِ نو اس طویل و مدید معیت و رفاقت کا پوری احتیاط کے ساتھ جائزہ لیتے ہوئے ذمہ داری کے پورے احساس کے ساتھ شہادت ادا کر رہا ہوں کہ مولانا مرحوم میں جو بھی کمزوریاں رہی ہوں —— اور معصوم کون بشر ہوتا ہے —— لیکن جہاں تک دِل کا تعلق ہے کہنا چاہیے کہ اس کی تمام بیماریوں سے ان کو پاک ہی پاک پایا۔ بغض و حسد، انتقام و عداوت ریا و نفاق، نمود و نمائش، حرص و ہوس، طولِ امل وغیرہ کے نفسانی جذبات کا کوئی داغ دھبہ یاد پڑ رہا ہو، ایسے بھی، ان کے آئینۂ دِل پر پڑتا خصوصاً ٹھہرتا قطعاً یاد نہیں پڑتا۔ ہمارے عِلم و قلم کے نیچے اونچے نام والے صُلحا بھی ذرا ٹھنڈے دِل سے خود اپنے دلوں کا محاسبہ فرما دیکھیں، تب ہی دِل کی ان بیماریوں کی ہمہ گیری اور گیلانی جیسے صاحبِ علم و قلم کی ان سے اتنی

استغنائی و کنارہ کشی دُوری کی قدر و قیمت معلوم ہو گی۔

سارے اخلاقی رذائل یا باطنی و قلبی امراض سچ پوچھیے تو کبر و نخوت، خود بینی و خود پرستی ہی کی شیطانی ذریت یا انڈے بچے ہوتے ہیں مگر مولانا کی ہر شان پر غالب خود فراموشی یا فنائیت تھی، کچھ تو پیدا ہی مست و فانی ہوئے تھے، کچھ ذہانت و ذکاوت کی افراط کا لازمہ بھی عموماً کچھ نہ کچھ مستی و ربودگی ہی دیکھی جاتی ہے۔ پھر وجودی توحید جو مولانا کا خاص مذاق تھا یہ نام ہی صحیح معنی میں "خودی" سے گذر جانے یا اس کے فنا ہو جانے کا ہے۔ سونے میں سہاگہ حیدر آباد میں ان کو ایک مرشد بھی اس رنگ میں شرابور رہتے[1] حال و قال سب کے مست ہی مست، بیداری کا ہر لمحہ سُرور و مستی کا دیکھا جس کی آنکھوں میں خدا کی عظمت و کبریائی، کیا اس کی ہستی اتنی سما گئی ہو کہ اپنی پرائی کوئی دوسری ہستی ہستی ہی نہ دکھائی دیتی ہو، اس کو من و تو یا اپنی کبریائی اور بڑائی و دوسروں پر چھا جانے کا ہوش کیا رہ سکتا ہے۔ خود فراموشی کا عالم مولانا کی ظاہری زندگی پر بھی اتنا چھایا رہتا کہ کھانا پینا، سونا جاگنا ہر چیز کسی نظم و انتظام سے قطعاً آزاد رہتی، خود تو کیا تہہ فرماتے نوکر بھی آزاد رہتا، اگر وہ بھی تہہ نہ کرتا تو دن رات بستر تک الجھا ہی پڑا رہتا، بس ہر شی کا وہی حال جو ان کی تصانیف کا، کہ تصنیفی موضوع تک کے قید و بند سے آزاد! لکھنے کا بھی یہی حال کہ نہ لکھتے تو مہینوں سالوں کچھ نہ لکھتے، اور لکھنے پر آجاتے تو دن رات ایک کر دیتے، رات رات بھر

[1] حضرت مولانا محمد حسین رحمۃ اللہ علیہ کا ذکرِ خیر اس مکتوب الیہ کے نام کے مکتوبات میں جا بجا ملے گا۔ ۱۲

پلک نہ جھپکاتے، پہلو میں تکیہ دبائے، نیم دراز پلنگ ہی پر لیٹے لیٹے اور اکثر پنسل ہی سے ہفتوں کیا دنوں میں سیکڑوں صفحات کی کتاب پوری کر ڈالتے۔

اس خود فراموشی میں خود فروشی و خود پرستی کی سمائی تو کہاں سے ہوتی، معمولی خودداری تک سے بے نیازی کا ہمارے مولانا کا ایک بالکل خاص بہت ہی عجیب نادیدہ و ناشنیدہ استثنائی حال پایا۔ کسی چھوٹے بڑے بلکہ ادنی سے ادنی نوکر چاکر تک کی ادنی سے ادنی ناخوشی کا تحمل مطلق نہ فرما سکتے۔ راقم گستاخ نے تو حیدر آبادی رنگ کا ایک مستقل خطاب ہی "خوش کرن" دے رکھا تھا۔ اپنی معذوری و معذرت کا ایک دلچسپ عنوان پاکر خود بھی اس سے فائدہ اٹھاتے، بعض مکتوبات میں بھی ناظرین کو "بد خوش کرنی" کے دامن میں پناہ لیتے ملیں گے۔ ایک مرتبہ کسی معاملہ میں خود راقم نالائق کو شاید کچھ زیادہ ناخوش محسوس فرما کر تو غضب ہی فرما دیا کہ دھڑ سے پیروں پر گر پڑے، گھبرا کر ان کے سر کو اٹھا کر سینہ سے لگا لیا۔ اور دونوں لپٹ کر خوب روئے، خیر میرا شمار تو پھر بھی بظاہر برابر والوں میں تھا۔ بارہا ہر کس و ناکس کے ساتھ اپنے دینی و دنیوی اور علمی مرتبہ و مقام سے کیا معمولی انسانی خودداری تک سے اتنا اتر آتے کہ ان کی اس خاص افتادِ طبع سے ناواقفوں کو خوشامد کا شبہ ہونے لگتا۔ کبھی کبھی مجھ سے دیکھا نہ جاتا اور ناگواری سے کہتا کہ آخر ساری خدائی کو خوش رکھنا آپ نے کیوں اور کیسے اپنے اوپر فرض ٹھہرا رکھا ہے۔ اور اس میں کیسے کامیاب ہو سکتے ہیں؟

مگر واقعہ یہ ہے کہ وہ کرامتی حد تک کامیاب ہی کامیاب تھے۔ اور سب سے بڑی کرامت اس سلسلہ کی بالکل متضاد فطرت والے دن رات کے ساتھی راقم احقر کے ساتھ سالہا سال تک نہایت کامیاب ہی نہیں بڑا خوشگوار و دلنواز نباہ رہا۔ شاید دو ایک بار سے زائد کسی ایسی کشیدگی و شکر رنجی کی نوبت نہ آئی ہو جس کا اثر دو چار دن کیا دو چار گھنٹے بھی رہا ہو۔ یا ایک آدھ خط سے آگے بڑھا ہو۔ باقی مولانا کا دائرہ تعلقات صرف یونیورسٹی تک محدود نہ تھا، پورے حیدر آباد کے عوام و خواص، علماء و مشائخ، امراء و وزراء، افسروں، ماتحتوں، بڑے چھوٹے تاجروں و دوکانداروں، ہر طبقہ تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کے باوجود شاید ایک مثال بھی کوئی بتا سکے کہ کسی طبقہ کا کوئی ایک فرد بھی مولانا سے ناراض رہا ہو، ناراض کیا سب ہی بڑی عزت و محبت کرتے تھے۔

لیکن قیمت بھی اس کی جان و مال، وقت و صحت سب کی صورت میں بے حساب ادا فرمانی پڑتی۔ ایک مستقل ڈیپارٹمنٹ سفارشوں کا تھا، ایک طرف مولانا کی یہ محبوبیت و مقبولیت کہ ان کی سفارش کو بہ مجبوری ہی کوئی رد کرتا، دوسری طرف خود کسی سے انکار فرما کر اس کی ناخوشی کیسے پسند فرماتے۔ چھوٹا بڑا جو آتا، جس چھوٹے بڑے کے ہاں چاہتا پکڑ لے جاتا۔ مملکتِ آصفیہ کے صدر الصدور نواب صدر یار جنگ بہادر (مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی رحمۃ اللہ علیہ) خصوصیت سے مولانا کے بڑے قدر شناس تھے۔ بڑی [illegible]

ومربیانہ شفقت فرماتے۔ غایت محبت و بے تکلفی سے اکثر صرف "مولوی ہے"
یاد فرماتے۔ بڑے عہدہ داروں میں مولانا کا آنا جانا سب سے زیادہ ان ہی کے ہاں رہتا۔ کبھی کبھی صورت دیکھتے ہی فرما دیتے "کس کی خدمت (سفارش) کا حکم لائے ہیں۔"

ایک اور ڈپارٹمنٹ مولانا کی حیدرآبادی زندگی کا عرصہ تک خصوصاً میلادی وعظوں اور تقریروں کا رہا۔ اور شاید اسی نے دمہ کے اس پرانے مریض کے مرض میں بھی مولانا کو شریک کر کے لفظاً و معناً "ہم دم" بنا دیا تھا۔ ورنہ شدتِ مرض میں تو ان تقریری بھرماروں کا بھرپور حصہ تھا ہی، یوں سلسلہ کم و بیش سال بھر چلتا رہتا۔ لیکن میلادی موسم کے دو تین مہینوں میں اتفاقاً ہی کسی دن دم لینے کا موقع ملتا ہوگا۔ عموماً یہ جلسے رات کو ہوتے اور رات بھر تک بھی چلتے رہتے۔ جلسہ بازوں کو اپنی مجلس آرائی سے مطلب، عارض کی کچھ تکلیف ہوتے بھی نہ وہ مولانا پر رحم فرماتے نہ ان کی خوشی کے مقابلہ میں خود مولانا اپنا و پر لے جانے والے۔ کبھی کبھی واپسی میں سواری سے بھی بے فکر ہو جاتے۔ ایک مرتبہ پاپوش مبارک تک کا پتہ نہ رہا۔ اور مولانا کچھ دور ننگے پاؤں چل کر کرایہ کی سواری پر آدھی رات کے بعد گھر پہنچے، نتیجہ بارہا ہوتا کہ واپسی پر پورا دورہ پڑ جاتا۔ جو کئی کئی دن کی خبر لیتا۔ پھر کبھی ایک دورہ سے پوری طرح سنبھل نہ پاتے کہ کسی نہ کسی نئے جلسے کا دورہ پڑ جاتا۔ کالج کے فرائض منصبی کے روزانہ کئی کئی

لکچروں کے ساتھ وعظوں اور تقریروں کے اس تسلسل سے مولانا کی صحت پر آخر ایسی بن آئی کہ شب و روز کے اس نیازمند کے لیے دیکھتے رہنا برداشت سے باہر ہو گیا۔

حیدرآباد میں میلادی جلسوں کا یہ زور اس کے شروانی صدر الصدور کے ذوق و زور سے زیادہ بڑھ گیا تھا۔ ہر نمایاں جلسہ میں خود شریک ہوتے۔ اکثر صدر بھی ہوتے۔ اور مولانا کے بغیر اپنے کو بے شہ بالا پاتے۔ مولانا جب ماوشما کی ناراضی گوارا نہ فرماتے تو ممدوح تو ان کے بڑے شفیق محسن و مربی تھے۔ ان کی خاطر شکنی پر کیسے راضی ہوتے۔ اس لیے میں نے خود ممدوح کو مولانا کی گرتی ہوئی صحت کی طرف توجہ دلائی، بالآخر ان ہی کے مشورہ بلکہ حکم سے کچھ ایسی صورت طے پائی کہ مولانا اس باب میں اقرار صالح کے ساتھ اپنے کو دن و رات کے اسی "ہمزاد" کی "اتالیقی" میں دیدیں۔ یعنی بلا اس کی وساطت و اجازت کے وعظ و تقریر کی کوئی دعوت قبول نہ فرمائیں گے۔ جب وہ دوسروں کی خاطر بیماری تک خرید لیتے تھے، تو پھر صحت کے لیے اس "ہمدم" اور اس سے بڑھ کر شروانی صاحب جیسے اپنے محسن عظیم کی دل شکنی و حکم عدولی کیسے خرید فرماتے۔ غالباً اس معاہدہ کا کوئی اعلان بھی باہر برآمدہ میں آویزاں کر دیا گیا تھا کہ وعظ و تقریر کی کسی درخواست کو مولانا اب براہِ راست خود قبول نہ فرمائیں گے۔

اس طرح الحمد للہ مولانا کو غالباً ۵، ۶ مہینے آرام کا مسلسل موقع مل گیا۔ مرض میں

نمایاں خفت سے خود ان کو قدرے عافیت معلوم ہوئی اور اب مہینہ میں ایک دو بار کسی خاص جلسہ یا خاص تعلق کی صورت ہی میں نوبت آتی۔ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔ جلسوں کا زور بھی کہاں تک رہتا۔ ان میں بھی کمی آ گئی۔ کچھ اتحاد المسلمین کے سیاسی و نیم سیاسی جلسوں اور سرگرمیوں نے ان کی جگہ گھیر لی تھی نیز حسنِ بیان و خطابت میں نواب بہادر یار جنگ مولانا کی جانشینی کا حق پورا ادا کرنے لگے تھے۔ بلکہ اپنے کو مولانا ہی کا شاگرد جانتے اور کہتے تھے۔

مالی جرمانہ یعنی "خوش کرنی" کی مد میں البتہ مولانا کو زیادہ ادا فرمانا پڑتا، بڑی وجہ یہ کہ بڑے تنخواہ دار ہونے پر بھی عملاً مالدار کبھی نہ ہونے پاتے۔ خدا بھلا کرے ان کے چھوٹے بھائی اور بڑے منتظم و کارگزار میاں سید مکارم احسن سلمہٗ کا کہ وہ گیلانی شریف میں کاشتکاری یا باغبانی وغیرہ کے سلسلہ میں منصوبے پر منصوبے برابر پیش ہی کرتے رہتے۔ اور مولانا کے معمولی مصارف سے جو کچھ بچتا اور اچھا خاصا بچتا، جمع نہ رہنے دیتے۔ بلکہ بارہا قرض تک کی نوبت آ جاتی۔ ان منصوبوں میں کچھ اس طرح کے بھی ہوتے کہ "ہماری فلاں زمین کے پاس فلاں زمین بِک رہی ہے یا مل سکتی ہے بڑے موقع کی ہے" مولانا نے ان کا غالباً ایسا ہی کوئی خط دکھایا یا مشورہ سنا کر فرمایا کہ "اس طرح تو پورا کرۂ ارض ہی ہماری زمین کے پاس آتے آتے گیلانی میں سما جائے گا" پھر بھی ساری دنیا کو خوش رکھنے والے مولانا خود اپنے بھائی کو کیسے ناخوش فرماتے۔ تاہم اگر کبھی اتفاق سے کچھ بچ جاتا تو تھوڑا بہت اپنے برائے قرض ورض

کے نام سے وصول کر لیتے، پھر دینے کا نام لینے والا شاذ و نادر ہی کوئی اللہ کا بندہ ہوتا ہوگا۔ خصوصاً جب مولانا کی طرف سے کوئی تقاضا کیا یاددہانی کا معمولی اشارہ تک دشوار تھا، ایک مرتبہ کوئی بڑی رقم غالباً ہزار پانسو کی اپنی ضمانت پر کسی کو دلوا دی۔ جو فرماتے تھے کہ بالآخر خود ہی ادا فرمانا پڑی۔

مولانا کی زندگی کا ایک اور گوشہ خوش طبعی و مزاح پسندی کا تھا۔ جو کبھی کبھی مزاح کے حدود سے بہت آگے بڑھ جاتی۔ بلکہ اگر کوئی اس ڈھب کا بزِ خفش ہاتھ لگ جاتا تو اس کو کھلا پلا کر مستقلاً تفریحِ طبع کا تختۂ مشق بنائے رکھتے۔ حیدرآباد کے آخر زمانہ میں "بزِ خفش" کا یہ منصب سالہا سال تک خود اپنی مسجد الحجی کے امام کو عطا رہا۔ یوں بھی کوئی موقع پا جاتے چوکتے ہرگز نہ۔ ہم دونوں کے ایک اچھے دوست نے کسی تعلیم یافتہ مطلقہ خاتون سے شادی کر لی۔ جو ساتھ کچھ اولاد بھی لائیں۔ وظیفہ یاب ہو کر مولانا وطن میں تھے، تاہم یہ خبر پا کر ضبط نہ فرما سکے کچھ اشعار دوست کے نام سے موزوں فرما کر تنفر کی مبارکباد پہنچا کر رہے۔ اور ایک نقل بطور نقل مجھ کو بھی بھیج دی۔ دو شعر یہاں بھی ملاحظہ ہوں۔ ؎

فقط کھیتی نہیں ہے فصل بھی ساتھ
تمہیں اس فصل کی لیوی مبارک
"رہن بستہ" کا قصہ تھا نہ آپ کا
"کھلے منہ" کی ہو یہ "شی شی" مبارک

"ذہن لبستہ" کے بعد "شی شی" کی دہری تلمیح غضب کی ہے۔

خیال کرنے کی بات یہ ہے کہ اس سے بھی بڑھ بڑھ کر مولانا کھل کھیلتے دوسروں کی ایسی تفریح اور دل لگی پر لوگ لوٹ پوٹ پڑتے مگر مولانا کی اس حد سے گذری خوش طبعی کا بھی بُرا نہ مانتے، اسی طرح کبھی کبھی کسی پر غصہ زور و شور سے آتا۔ جو ہوتا کچھ مصنوعی سا، اور جس پر آتا وہ اس سے ایک محبوبانہ ادا کا سا لطف ہی اٹھاتا۔

ان کو آتا ہے پیار پر غصہ

ہم کو غصہ پہ پیار آتا ہے

شاعری نہیں واقعہ ہے کہ مولانا کے غصہ پر بھی لوگوں کو ہنستے یا پیار آتے ہی دیکھا۔ وجہ ایک ہی سمجھ میں آئی کہ نفس نیت کی کوئی خرابی دور دور تک کسی کو نظر نہ آتی۔

زندگی کے ایسے گوشوں کو منظرِ عام پر لانے میں طبیعت جھجک سی رہی تھی مگر خدا بھلا کرے خود مولانا ہی کے قلم نے اس کی بڑی سند عطا فرما دی۔ وفات کے بعد "مقالات احسانی"[۱] کے نام سے ان کا جو مجموعہ شائع ہوا ہے۔ اس میں بڑے جلیل القدر تابعی اور تاریخ اسلام کے مسلم اولیائے کاملین میں محمد بن سیرین رح کے بعض شانِ بے تکلفی کے حالات میں فرماتے ہیں کہ:۔

۱؎ مرتبہ مولوی غلام محمد صاحب ؒ۔ شائع کردہ مجلس علمی کراچی صفحہ ۲۵۶-۵۷

"مزاح و طیبت میں کہاں تک بڑھ جاتے تھے:۔ جو یریہ نامی ایک صاحب اپنا قصہ اس سلسلہ میں خود یہ سناتے ہیں کہ میں نے ایک دفعہ ابن سیرین سے ذکر کیا کہ جو چھوکری (جاریہ) میں نے خریدی ہے، اس کے ہونٹ بہت بڑے اور موٹے ہیں،

کہتے ہیں کہ سننے کے ساتھ اُن کی زبان سے نکلا کہ بوسہ لینے میں زیادہ سہولت ہوگی۔

ان (ابن سیرین) کے دیکھنے والوں اور ان کی مجلس میں شریک ہونے والوں نے اس سلسلہ میں ایک بڑی داستان چھوڑی ہے۔ بے تکلفی کی حد یہ تھی کہ ایسے اشعار جن میں شراب، محبوب، ساقی وغیرہ ساری چیزوں کا ذکر ہوتا لوگوں کو سناتے ہوئے مصلّے پر پہنچ جاتے۔ اور عربی کا ایک شعر جس کا ترجمہ ہے کہ مجھے اطلاع ملی ہے جس لڑکی کے ساتھ میری منگنی ہوتی ہے اس کی انگلیاں اتنی لمبی ہیں جیسے رمضان کے دن، ادھر شعر ختم ہوا راوی کا بیان ہے کہ "تعالیٰ اللہ اکبر" یعنی اس کے بعد اللہ اکبر کہتے ہوئے نماز کی نیت باندھ لیتے۔"

ہو بہو ہمارے مولانا بھی اسی طرح عین ہنسی دل لگی کی باتیں کرتے کرتے نماز کی نیت باندھ لیا کرتے، بالکل اپنا ہی نقشہ کھینچ دیا ہے۔ کتابوں پر نظر اُن کی ایسی وسیع تھی کہ خاص اپنے مزاج و مذاق کی باتیں بھی ان کو مل ہی جاتیں۔ اور

«گفتہ آید در حدیثِ دیگران» کے پردہ میں خود اپنی بھی خوب خوب ترجمانی فرما جاتے۔ حضراتِ صحابہ رض میں حضرت مرحوم کی اپنی جذبی کیفیت ہی نے غالباً ان کے قلم کو پہلے پہل حضرت «ابوذر غفاری رض» کی شانِ جذب کی طرف کھینچا اور اس زندگی کی ایسی دلکش موثر تصویر کھینچی ہے کہ اس کی کشش سے کوئی پڑھنے والا غیر متاثر نہیں رہ سکتا۔

غالباً خود ہی ذکر فرماتے تھے کہ حضرت حکیم الامۃ علیہ الرحمۃ نے بھی حضرت ابوذر غفاری رض کی اس ترجمانی پر بہت داد دی تھی، اور خصوصیت کے ساتھ فرمایا تھا کہ ایسے جلیل القدر صحابہ میں اہل جذب حضرات اہل اللہ کی ایک بڑی سند مل گئی۔

جو حضرات حضرت گیلانی رح کو صرف ان کے قلمی کارناموں سے پہچانتے ہیں یا ان کی نجی زندگی کے رنگ و بو سے زیادہ آشنا ہونے کا موقع نہیں پایا، وہ اس کا عکس ان ہی کے قلم کے تیار کئے ہوئے «ابوذر» اور «ابن سیرین» دونوں آئینوں کو سامنے رکھ کر دیکھ سکتے ہیں۔

مجھ کو تو خاص طور پر زیادہ تر دکھانا یہ ہے کہ باوجود ہنسی مذاق ہونگی و خوش طبعی کی بظاہر ثقاہت و سنجیدگی سے گذری ہوئی ان باتوں کے، تھیں ایسی باتیں بس ظاہر ہی ظاہر تک، بلکہ نفسیاتی نظر سے دیکھا جائے تو تکلف و تصنع سے پاک یہ شان ان کے باطن یا قلب کے ہر فساد اور نفس کی ہر نفسانیت سے

پاک ہی پاک ہونے کی بجائے خود ایک مستقل شہادت تھی، ورنہ یہ سراپا نفس و نفسانیت راقم خود اپنے ۴۳-۴۲ سال کے ہر طرح کے تعلقات و معاملات پر مبنی ان کے تجربات کو سامنے رکھ کر پوری ذمہ داری و ایمانداری سے شہادت دیتا ہے کہ ایک مرتبہ بھی کبھی ان کی کسی بات سے دل کی کسی کھوٹ یا اندر کے کسی دنی و خسیس جذبہ کا اثر پڑا نہ خود اپنے اوپر قطعاً یاد ہے، نہ کسی دوسرے پر زیادہ سے زیادہ یہ کہ بس کچھ وقتی طبعی اثر ہو گیا۔

اوپر کی سطریں ختم ہوتے ہی اتفاقاً ۲۶ر نومبر ۱۹۵۰ء کے ایک مکتوب پر نظر پڑ کر ایک اور گوشہ مولانا کی زندگی کا سامنے آ گیا، «ویک گونہ بے خودی» یا جذب و مستی کا رنگ تو ان میں اتنا نمایاں تھا کہ تھوڑا واقف کار بھی اس سے ناواقف نہ رہتا، لیکن بہتوں کو مغالطہ «جذباتیت» کا رہتا۔ انسان کی نفسیات بھی بڑی پیچیدہ۔ ایک عام و عالمگیر جذبہ محبت و نفرت کا لازمۂ بشریت ہے۔ ہر کسی کو کسی نہ کسی شخص یا شی سے نفرت بھی ہوتی ہے اور کسی سے محبت بھی، مولانا کو کسی شی سے رہی ہو تو رہی ہو، لیکن کسی بھی شخص کی طرف سے ان کے سینہ میں کبھی کسی نفرت کا سراغ نہ ملا اسی طرح کسی کی محبت سے بھی ان کا دل خالی ہی پایا۔ ایک ہی گھر میں سال سال بھر ایسی رفاقت بھی حاصل رہی کہ ان کے گھر والے بھی ساتھ تھے، مگر کسی بچے کو گود میں اٹھانا کیا معنی محبت سے پاس بٹھاتے یا پیار کرتے تک نہیں دیکھا۔ ایسے بے تعلق رہتے کہ گویا یہ ان کا بچہ ہی نہیں۔ اور آگا و [illegible]

مال ہو کر اس کمال میں باپ سے بھی آگے تھیں۔ خود بھی ان کے جو اوصاف بیان فرماتے راوی وہ خود نہ ہوتے تو یقین کرنا مشکل ہوتا کہ کسی عورت کا دل بھی اس درجہ جذبات سے خالی ہو سکتا ہے! اس معاملہ میں اللہ تعالیٰ نے دونوں کا جوڑ خوب ہی ملایا تھا۔ جب بال بچوں ہی سے مولانا کو کوئی جذباتی وابستگی نہ تھی تو مخلوق میں اور کس سے ہوتی، کھل کر کبھی پوچھنے کا موقع و خیال نہ آیا لیکن اغلب یہی ہے کہ "درجوانی چنانچہ افتد دانی" والے جذبات جوانی کی "افتاد" سے بھی اللہ تعالیٰ نے ان کو بالکل بچائے ہی رکھا ہوگا۔

خاکسار نے اپنے ایک عریضہ میں کچھ ایسی شکایت کی تھی کہ حیدرآباد سے جدائی و دوری کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ دل سے بھی اس نالائق کو بالکل دور ہی فرما دیا گیا ہے۔ جواب میں فرماتے ہیں:۔

"اس میں شک نہیں کہ سب سے زیادہ ان عقیری نفسیات کا علم آپ کو بخشا گیا ہے۔ پھر بھی "عقلیت" کے سوا "جذباتیت" کا اس شخص کے وجود میں قطعاً کوئی حصہ نہیں، جسے دنیا صرف جذباتی اور کرتی ہے، پھر بھی آپ کا یہ فیصلہ شاید ظلم کے حدود سے باہر نہیں۔ کیا آپ جیسے بزرگوں کی یاد بھی دل سے نکل جاتی ہے۔ اتنا بے توفیق تو نہیں ہوں"

یقیناً طویل و مدید اور طرح طرح کے ذاتی و صفاتی روابط و علائق کے طفیل میں اس نیازمند کو کچھ نہ کچھ خدمات کی توفیق میسر آتی رہی اور مختلف

قسم کے حسنِ ظن بھی مولانا کو پیدا ہو گئے تھے، جن کی بنا پر وہ کسی معاملہ میں اس سے بے نیازی و بے رخی تو بلاشبہ نہ فرماتے تھے، اور اس کی یاد بھی یقیناً بقول ان کے دل ——— یا زیادہ صحیح معنیٰ میں دماغ ——— سے نکلی ہوگی۔ ساتھ ہی یہ بھی بالکل یقینی ہے کہ جس کو طبعی وہ "جذباتی" یا قلبی تعلق انس و محبت کا کہا جاتا ہے وہ جب اپنے بال بچوں ہی سے مولانا کو نہ تھا، تو مجھ سے یا کسی اور سے کیا ہوتا۔ اور اس حیثیت سے حرف حرف یہ درست ہے کہ "عقلیت" کے سوا جذباتیت کا ان کے وجود میں کوئی حصہ نہ تھا۔ راقم سطور بھی طبعی محبت سے خالی ہی اپنے کو پاتا ہے۔ تاہم مولانا کے مقام "عقلیت" سے اپنے کو ہمیشہ بہت نیچے ہی پاتا رہا۔

مولانا کی زندگی کا سب سے کمزور پہلو عمل کا تھا۔ کمالات علم کے جتنے بڑے دھنی تھے، عمل میں اتنے ہی درجہ صفر تک کے کمال کو پہنچے ہوئے۔ انتہا یہ کہ علم و عمل دونوں کے اس نالائق و عاجز کو بڑا اعلیٰ خیال فرماتے رہے۔ جو کسی حد تک ان کے صفری درجہ کے مقابلہ میں بجا بھی تھا۔ باقی مولانا کا حال تو یہ تھا کہ اگر کھانے پینے کا بھی پورا بندوبست باورچی سے لے کر دستر خوان تک کوئی دوسرا نہ کر دیتا تو فاقہ ہی فرماتے۔ یا مضطر ہوتے تو بازار کے چنوں اور لونگ پر قناعت فرما لیتے۔ سفر حج میں لفظ لفظ ہی آنکھوں کے سامنے آیا۔ عرفات کے میدان

میں اپنی مستی و بے خودی کے عالم میں جو کھوئے گئے تو دوسرے دن ہی رہی جانے کے کسی مقام پر بھنے چنے ہی کھاتے پائے گئے۔ کھانے کی کسی دوکان یا ہوٹل تک جانے کے اہتمام سے یہی آسان جانا۔ سفر تنہا بہ مشکل اور شاید ہی کبھی فرماتے۔ سامان تو سامان خود اپنے وجود کی دیکھ بھال دشوار تھی۔

پھر بھی ذہن و دماغ کی رسائیوں کے تو ماشاء اللہ کیا کہنے ہی۔ خالی علمی منصوبوں یا اسکیموں تک ذہن خوب پہنچتا، وفات کے بعد جب ان کی یادگار کا بعض "صدق" زبانوں پر نام آیا۔ تحریں نے ان کی وقت کی ایک ایسی ہی بڑی اہم علمی تجویز کی طرف "صدق"[1] ہی کے ذریعہ توجہ دلائی۔ مگر ادلاً تو زبان و قلم سے آگے ——— جس میں شعوری غیر شعوری طور پر نام و نمود کی بھی کچھ غذا نقدا نقد مل جاتی ہو ——— ہم مسلمانوں کے قدم شاذ و نادر ہی آگے بڑھتے ہیں، خصوصاً کسی ایسے ٹھوس علمی کام کے لیے جس میں کم از کم ابتداء میں کام ہی کام زیادہ ہو اور نام کا چٹخارا برائے نام۔

مولانا پڑھے تو "دیوبند" میں تھے، لیکن پیدا "ندوی" ہوئے تھے۔ اس کو دیوبند میں قدم رکھنے سے بہت پہلے ٹونک میں ان کے استاد مولانا برکات احمدؒ نے ایسا بھانپ لیا تھا کہ خود مولانا ہی مزہ لے کر ان کا یہ فقرہ نقل فرمایا کرتے کہ "شبلی کا یہ انڈا یہاں کہاں سے آ گیا"! ندوہ سے باہر خالص دینی تعلیم و تربیت والوں میں شاذ و نادر ہی ایسے افراد ملیں گے، جن کو حضرت اکبر کی

[1] ہفت روزہ صدق جدید لکھنؤ، ۲۳ اگست ۱۹۵۶ء

زبان میں ندویوں کی سی "زبان ہوشمند" ملی ہو یا جن کی زبان سے دین کی وکالت و حمایت کی بات، جدید تعلیم کے دنیا دار کان لگا کر سننا پسند کرتے ہوں۔ مولانا ان شاذ و نادر افراد میں فرد فرید کا درجہ رکھتے تھے۔ بلکہ مولانا دریا آبادی مدظلہ کے بقول "ہر بڑے سے بڑے ندوی سے بڑھ کر ندوی تھے۔"

حضرت مرحوم کی اس "موہوب ندویت" کے لیے واہب العطایا جل مجدہ نے عثمانیہ یونیورسٹی کا میدان بھی خوب ہی خوب عطا فرما دیا تھا۔ اس اسٹیج پر ان کے خصوصی کمالات کا پہلا نظارہ سالہا سال تک دینیات لازم کی کرسی سے ہوتا رہا۔ اس میں ایک طرف انٹر سے لے کر بی۔ اے و بی۔ ایس۔ سی آرٹ و سائنس کے سیکڑوں ہزاروں طالب علموں کے جدید ذہنی سانچہ اور اس میں ابھرنے والے دینی شکوک و شبہات کے جاننے پہچاننے کا بھرپور موقع ملا۔ دوسری طرف ان کے ازالہ و امالہ کا جدید تعبیرات و اصطلاحات ہی کے ذریعہ اپنی وہبی قابلیتوں سے خوب خوب کام لینے کا۔

نہ جاننے والے اندازہ ہی نہیں کر سکتے کہ جدید علوم و فنون کے معلمین، ان کی تعلیم گاہیں اور ان میں تعلیم و تربیت کا ماحول سب مل ملا کر دین حق میں ایسے سم قاتل کا حکم رکھتے ہیں کہ کوئی بہت بڑا "بطن سعید" ہی علم تو علم ایمان کو بھی صحیح سلامت لے کر ان سے باہر آ پاتا ہوگا۔ لیکن جاننے والے یہ بھی جانتے ہیں کہ حضرت گیلانی کے زیر درس دینیات لازم کے ان سیکڑوں

طالب علموں میں کوئی بہت بڑا "باطنی شقی" ہی ہوتا ہوگا جو ہر روز ان کے تازہ بتازہ درسوں سے تازہ بتازہ ایمان لے کر نہ باہر آتا ہو۔ خود مجھ کو فلسفہ کے ۴۰-۵۰ طالبعلموں کی بی۔ اے کی جو جماعت پہلے پہل وہاں ملی تھی، اس کا پہلا تجربہ یہی ہوا تھا کہ ان میں شاید ہی کوئی رہا ہوگا جس کے ایمان کی کوئی نہ کوئی چول ہل نہ رہی ہو۔ لیکن پھر الحمدللہ ۳۲ سال میں اس تمام کے "بدنام" ندوی کو بھی کوئی ایسا طالب علم معلوم نہیں، جو ایمان دشمنی کے لیے "بدنام فلسفہ" خصوصاً مغربی فلسفہ ——— سے ایمان ہی کا کوئی نہ کوئی سبق لے کر نہ نکلا ہو۔ بعض غیر مسلمان طلباء کی زبان سے تو یہاں تک سنا گیا، کہ اسلام کی حقانیت میں ہم کو کوئی خلش باقی نہیں رہی، البتہ وقتی مجبوریوں اور مصلحتوں سے اعلان کی ہمت نہیں۔ مغربی و اسلامی فلسفہ کے علاوہ سال دو سال مولانا کی جانشینی میں دینیات لازم کے لکچروں کا بھی تجربہ ہوا۔ اس سے اور بھی اندازہ ہوا کہ دین اسلام کی اس ایک نصرت و خدمت کی بدولت آج وہ اسلام کے خدا اور رسول دونوں کے حضور کیسے سُرخ رو ہو رہے اور کیسی رضا اور رحمتوں سے ان شاء اللہ نوازے جا رہے ہوں گے۔

ملنا جلنا اور ربط و ضبط بھی مولانا کا جدید علوم و فنون کے اساتذہ سے زیادہ رہتا۔ اور سب ہی کو ان کی ذہنی و علمی برتری کا لوہا ماننا پڑتا۔ یونیورسٹی کے باہر بھی مولانا کے افادات کا تعلق زیادہ تر نئی تعلیم و روشنی والوں ہی سے رہتا۔

مختلف قیام گاہوں کی قریبی مساجد میں درسِ قرآن کا جو سلسلہ وقتاً فوقتاً جاری رہتا۔ اس سے مستفید ہونے والے تو قریباً سارے کے سارے نئے تعلیم یافتہ ہی ہوتے، اور ان کے مجمع میں مولانا کی طبیعت و زبان دونوں خوب کھلتی۔ بخلاف اس کے بقول خود "ہم پیشہ مولویوں" سے ڈرتے رہتے اور اپنے خصوصی افکار و خیالات کا عام تقریروں تحریروں اور مجلسوں میں بہت بند بند ہی اظہار ہوتا۔

مضامین و مقالات اور تصانیف میں تدوین حدیث و تدوین فقہ جیسی خالص دینی چیزوں تک کا خاص ہدف دین کے باب میں نئے نئے وساوس و خطرات والوں ہی کو پائیں گے۔ ہر پھر کر مطلب و مدعا یہی ہوتا کہ معنی و عبارت عنوان و معنون ہر راہ سے گھیر گھار کر نام نہاد اپنے روشن خیال بھائیوں کو "ظلمات بعضہا فوق بعض" کی تہ بہ تہ تاریکیوں سے کسی نہ کسی طرح گھسیٹ کر عملاً[۱] نہ سہی کم از کم ایمان کی روشنی میں تو لا کھڑا کر دیں۔ غرض یہ کہنا مبالغہ

۱؎ ایک عجیب تجربہ مولانا خود بیان فرماتے کہ "میں ایسا عقیم ہوں کہ ایک فرد مجھ کو نہیں معلوم جس نے میرے کہنے سے نماز پڑھی، حق تعالیٰ سبحانہ کی اس خاص شان کے سوا اس کو کیا کہا جائے کہ بعض حضرات انبیاء (علیہم السلام) کا ایک امتی بھی نہ تھا۔ ہدایت و ضلالت کے باب میں مشیت الٰہی (انک لا تہدی من تشاء ولٰکن اللہ یہدی من یشاء) کے قانون کی گرفت و پابندی آسان نہیں۔ ۱۲

نہ ہوگا کہ مولانا گیلانی نے اپنی تحریری و تقریری پوری زندگی کا سب سے بڑا مشن اپنے نئے بھٹکے ہوئے بھائیوں کی دستگیری کو بنا رکھا تھا۔

البتہ زبان و قلم کی بے پناہ طاقت کے ساتھ دست و بازو کے کمزور ہونے کی معذوری سے اس فن اور جذبہ کی کوئی عملی یادگار نہ چھوڑ سکے یا ایک عملی تجویز یا اسکیم ایسی چھوڑی ہے جو جدید تعلیم کے زہر کا نہ صرف سب سے آسان اور ارزاں ساتھ ہی کارگر تریاق ہے۔

جس طرح نئی تعلیم اور اس کی تعلیم گاہوں، اسکولوں، کالجوں وغیرہ کے سیلاب کو روکنا ناممکنات سے ہے، اسی طرح عملاً یہ بھی قطعاً ناممکن ہے کہ ان کے مقابلہ میں مسلمانوں کے لیے ہر جگہ ایسے کالج و اسکول قائم کیے جا سکیں جن میں جدید علوم و فنون کے ساتھ دینی تعلیم و تربیت کا کوئی معتدبہ و موثر انتظام ہو سکے اس کے بجائے بدرجہا آسان و ارزاں مولانا کی یہ تجویز تھی کہ نفس اس تعلیم کے لیے تو مسلمان طلبہ کو جہاں تک ہو سکے سرکاری اور غیر سرکاری تعلیم گاہوں ہی میں گھسنا چاہیے۔ باقی نام کے مسلم اسکول و کالج یا "مسلم یونیورسٹی" پر مسلمانوں کا لاکھوں کروڑوں روپیہ برباد ہونے کے مقابلہ میں انفرادی و اجتماعی زور ہر جگہ چھوٹے بڑے اور ممکن حد تک ارزاں سے ارزاں اسلامی اقامت خانے (ہاسٹل) قائم کرنے کرانے پر لگانا چاہیے۔ یہ نئی تعلیم اب نہ گنے چنے چند اغنیاء و امراء کی اولاد تک محدود رہ سکتی ہے۔ لہٰذا کم استطاعت

اور غیر مستطیع طلبہ کی قریب قریب ساری بھیڑ چار و ناچار ان اقامت خانوں میں پناہ پانے پر مجبور ہوگی۔ ان میں ممکن حد تک بقدر ضرورت دینی تعلیم اور اس سے بڑھ کر بہتر حتی المقدور دینی تربیت کی فضا و ماحول کا انتظام کرنا چاہیے۔ خود ہاسٹل میں مقیم ان کے نگراں کے علاوہ بھی ان کا ملنا جلنا، اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا جہاں تک ہو سکے کچھ نہ کچھ ایسے افراد اور جماعتوں کے ساتھ ہوتا رہے جو ایمان اور عملِ صالح کی زندگی کا خود ذرا اچھا زندہ نمونہ ہوں، اور بات چیت بھی ان سے ان کے ذہنی میلانات و رجحانات کو جان پہچان کر کرا سکتے ہوں۔ کتابی تعلیم کا بار زیادہ نہ ہو۔ روزہ اور نماز باجماعت کی پابندی تو لازم ہونا ہی چاہیے۔ اس کے ساتھ زیادہ زور معاملات اور اخلاق کی اصلاح پر ہے۔ کتابی تعلیم میں بس آدھ گھنٹہ نماز فجر کے بعد ہی قرآن مجید کا ترجمہ و تفسیر۔ اس کے علاوہ حدیث کا ایک ایسا انتخاب جس میں ایمانیات کے ساتھ اعمال صالحہ اور ان میں خصوصاً حقوق عباد ——— معاملات، اخلاق اور معاشرت ——— پر زیادہ توجہ دلائی گئی ہو۔ اور ایک روزمرہ پیش آنے والے ضروری فقہی مسائل کا مجموعہ کوئی مناسب وقت ان دونوں کے لیے کم و بیش ایک گھنٹہ سے زیادہ نہ ہو۔ باقی عام مطالعہ کے لیے سیرت کی کتابوں (خود مولانا گیلانی، مولانا دریابادی (خصوصاً صدق کی فائلوں) مولانا نعمانی، مولانا علی میاں سلمہم کی کتابوں اور جماعت اسلامی کے لٹریچر کے ساتھ حضرت حکیم الامت علیہ الرحمہ کے

ملفوظات ومواعظ، اسی طرح دوسروں کی جو بالخصوص جدید ذہنوں کے لیے
مفید و مناسب کتابیں ہوں، ان کا ذخیرہ اقامت خانہ کے عام دار المطالعہ میں
موجود رہے۔ اور کچھ ماہنامے وغیرہ بھی ایسے ہی فراہم کیے جاتے رہیں۔ نیز
تعطیلوں میں ذرا ایسے نمایاں حضرات سے جو نئی ذہنیت والوں میں معروف
ومقبول ہوں ان کے خطاب عام و خاص سے مستفید ہونے اور اپنے شکوک
وشبہات دور کرنے کے مواقع بھی وقتاً فوقتاً جو حاصل ہو سکیں حاصل
کیے جاتے رہیں۔

ابتدا ان اقامت خانوں کی ایسے طالب علموں سے ہو جو اپنے دینی ایمانی
عادات واخلاق میں زیادہ بگڑے نہ ہوں اور نسبتہً زیادہ تربیت پذیر ہوں
تعدادی غلبہ ہمیشہ ایسوں ہی کا رہے، بہت بگڑے ہووں خصوصاً تربیت ناپذیر
غیر مطیع وسرکش طبیعت والوں ایک کو بھی جگہ نہ دی جائے۔ گو ایسی تہائی
مثالیں استثنائی ہوں گی۔ تاہم احتیاط اسی میں ہوگی کہ ابتدائی داخلہ مہینہ دو
مہینہ کی مدت کا عارضی و امتحانی ہر طالب علم کا رکھا جائے۔

خیر یہ جزئیات تو اس جذباتی فطرت والے راقم کے ہیں۔ جو اور بھی بہت
سے دماغ میں بھرے ہوتے ہیں۔ خیال تھا کہ کسی طرف عملی قدم اٹھایا گیا تو
پیش کر دیے جائیں گے لیکن بے عملوں کی کل بات سنی جا سکتی تو خود حضرت مرحوم
کی زندگی ہی میں کیوں ان سنی رہتی۔ ورنہ جدید تعلیم کی عالمگیر و بائی مرض کا

یہ اصلی کلی و عملی علاج زبان و قلم سے بار بار سننے اور سمجھنے میں مرحوم ہی سے آتا رہا۔
پوری دنیا کے پورے ادیان و مذاہب کی تاریخ میں شاید نہیں، یقیناً
دین و مذہب کے حق میں کوئی شر و فساد اپنی شدت و وسعت کے اعتبار سے تعلیم
جدید، اس کے علوم و فنون، اس کی لائی پھیلائی ہوئی معیشت و معاشرت
تہذیب و ثقافت، حکومت و سیاست سے بڑھ کر کیا اس کے لگ بھگ
بھی تک معلوم نہیں۔ وسعت کا یہ حال کہ جن ملکوں میں اس تعلیم کے افراد گنتی
میں ابھی انگلیوں پر گنے جاتے یا دو چار فی صد سے زیادہ نہیں، سیاست و
معاشرت سب پر عملاً حاوی و قابض وہی ہیں۔ خالص مسلمان ملکوں اور حکومتوں
تک میں دین اور دینی تحریکوں پر ظلم و زیادتی، مخالفت و مزاحمت کی جو بلا آتی
ہے بالواسطہ یا بلاواسطہ نازل ان ہی گنے چنے افراد یا ان کے جراثیم کا وبائی
تعدیہ ہوتی ہے۔

اور کیوں نہ ہو کہ گھر کے یہ بھیدی تو "مسلمان" بن کر لنکا ڈھاتے اور اسلام
کی جڑوں پر تیشہ چلاتے ہیں۔ اسلام کا کوئی کافر سے کافر کھلا دشمن بھی اتنا خطرناک
نہیں ہو سکتا، جتنا مسلمانوں میں گھسے رہنے والے یہ ماڈرن منافق و مرتد، اسی
کا نتیجہ ہے کہ عام مسلمانوں کی نسلوں کی نفاقی و ارتدادی چالوں اور چالاکیوں
پر پڑتی ہی نہیں، عوام کیا دین کے خواص، ہمارے علما تک ان کے ارتداد سے
انجان بے خبر ہیں کہ "یدخلون فی دین اللّٰہ افواجاً" کے بجائے فوج کی فوج

دین سے ان خارج والوں پر ان کی اتنی نظر اور اتنی فکر بھی نہیں جتنی ابھی ایک نسل قبل کچھ عیسائی یا شدھی ہو جانے والے مسلمانوں کی پڑ گئی تھی۔

خدا بھلا کرے فرعون کے گھر میں پلے ہوئے ایک موسیٰؑ کا کہ نئی اعلیٰ تعلیم ہی کے ایک گھریلو بھیدی نے اپنے گھر والوں کو اس ارتدادی "طوفان" پر جس طرح کھل کر آگاہ کیا۔ اس نے اس حقیقت کو اور بھی واضح کر دیا ہے کہ اس کے مقابلہ کے لیے صرف زبان وقلم کی کوئی تقریری و تحریری جد و جہد ہرگز کافی نہیں، جب تک اس کا توڑ اس کی پیدائش کے گھروں ہی سے نہ ہوتا رہے۔ یعنی ایک طرف جس طرح کالجوں یونیورسٹیوں کے دوران تعلیم میں یہ زہر طالب علموں کے ذہن کو آہستہ آہستہ متاثر کرتا ہے۔ اسی طرح دوسری طرف ساتھ ساتھ ہی گیلانی اقامت خانوں کی تعلیم و تربیت سے اس کا سد اور ازالہ

لہ مصنف "قرآن اور علم جدید" (ڈاکٹر رفیع الدین ادام اللہ علاہ وفیوضہا) جدید علوم کے وسیع و عمیق مطالعہ کے ساتھ ساتھ کتاب شاہد ہے، کہ ماشاء اللہ دل و دماغ دونوں کے پرجوش مومن بھی ہیں۔ البتہ جوش ایمان ہی نے شاید اس غلط فہمی تک پہنچا دیا کہ کھینچ تان کر مغربی رنگ ہی کا کوئی فلسفہ خود قرآن سے تیار کر کے اپنوں کو اسی ارتداد سے بچایا اور غیروں کو مسلمان بنا لیا جا سکتا ہے۔ اس فلسفہ سازی کی دھن میں نیک نیتی کے باوجود قرآن کی غیر محتاط تاویلات سے بچنا بھی ممکن نہ تھا۔ کاش طبع ثانی میں کسی مستند مشورہ سے نظر ثانی کی توفیق پائیں۔

ہوتا رہے۔ "سر چشمہ باید گرفتن بہ میل" بہرحال گھر والے (شهد شاهد من اهله) کی یہ شہادت یا خطرہ کا الارم خود اس کی زبان سے ہے، بڑے عبرت کے کانوں سننے کے لائق۔

"نہایت وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس نوعیت اور اس پیمانہ کا فتنۂ ارتداد اسلام کی ساری تاریخ میں کبھی رونما نہیں ہوا۔ لیکن اس کے باوجود شاید مسلمان کبھی کسی تخریبی خطرہ سے اتنے بے پرواہ بھی نہیں ہوئے جس قدر اس سے......

اب کفر وارتداد ایک اور لباس میں اسلام کے مقابلہ پر آیا ہے۔ اس دفعہ اس کا لباس (آریہ یا عیسائی) مذہب کا نہیں بلکہ فلسفہ (یا علم وعقل) کا لباس ہے، اسی لباس میں وہ اسلام ہی کو نہیں، سارے مذاہب کو ملیا میٹ کر دینا چاہتا ہے،...... اس نے (عیسائیت وغیرہ باطل) مذاہب کی طرح صرف چند نہیں لاکھوں مسلمانوں کو مرتد بنایا ہے۔ اور اس کی فاتحانہ یلغار برابر جاری رہی ہے"......

بڑے پتہ کی بات کہ باطل مذہب عیسائیت وغیرہ۔

"براہ راست اور بلا واسطہ اسلام کے مقابلہ پر آتا تھا.... (بخلاف اس کے) باطل فلسفہ علم وعقل کے نام سے اس کا مقابلہ کرتا ہے۔ وہ جب اسلام کی تردید کرتا ہے تو اسلام کا نہیں۔ بلکہ اسلام سے اس کی (غلط تعبیر) نا

کرتا ہے، گویا اس کو معلوم ہی نہیں کہ اسلام اس کے حریف کی حیثیت
سے دنیا میں موجود ہے...... بلکہ وہ علمی تحقیقی و عقلی استدلال کے بل
بوتے پر انسان اور کائنات کی ایسی تشریح کرتا ہے جس میں خدا اور
رسالت اور دین کے لیے کوئی گنجائش نہیں رہتی۔.....

ماشاء اللہ وجزاہ اللہ خوب خوب چوٹ پکڑے ہیں، اچھا ہی پتہ کی اور سنیے۔

"باطل مذہب جب اسلام کی مخالفت کرتا تھا تو ہماری غیرت دینی
جوش میں آتی تھی، ہمارا جائز غصہ بھڑکتا تھا...... ہمیں ذرہ بھر شک نہیں
ہوتا تھا کہ اس کا ماننا اسلام کا انکار ہے...... لیکن باطل فلسفہ جب
اسلام کی مخالفت کرتا ہے تو ہماری غیرت دینی کا جوش کم ہوتا ہے...
جب ہم اس (باطل فلسفہ) کے فریب میں پھنستے ہیں تو بے علمی و جہالت
قبول کرتے ہیں۔ لیکن نام اس کو علم کا دیتے ہیں،...... ہم اس کی باتوں
کو (اس طرح) جانتے ہیں کہ ہمارے دل میں یہ بات کھٹکتی (تک) نہیں کہ ان
کے اثبات سے اسلام کی نفی ہوتی ہے..... ہم اس کو دشمن نہیں دوست
سمجھتے ہیں، اور اس سے تعاون کرتے ہیں،...

"باطل مذہب کے اثر سے جب کوئی مسلمان اسلام کو ترک کرتا تھا،
تو وہ مجبور ہوتا تھا کہ کسی گرجا یا مندر میں جا کر شدھی یا بپتسمہ کی رسمی کارروائی
سے گذرے۔ اس کے بعد وہ مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہو پاتا تھا۔

اللہ اس کا کفر الم نشرح ہو جاتا تھا۔ اسلام سے اس کی دشمنی آشکارا ہو جاتی
تھی اور مسلمان اس کی طرف سے ہوشیار اور بیدار ہو جاتا تھا۔"

اور بھی بڑا فتنہ یہ ہے کہ :-

"اسلام کے اس نئے دشمن نے اپنے پرستاروں کو اجازت دے
رکھی ہے کہ تم مذہب سے بے پرواہ ہو کر خدا اور رسول کے دشمن بن کر رہو تو
..... بھی اسلام کے دائرہ کے اندر ہو، چنانچہ ایسے دشمن دین اسلام
سے رشتہ جوڑنے والے آج نصف سے بھی زیادہ مسلمان ایسے ہیں جو یا
تو خدا کے منکر ہیں یا وحی کے، یا رسالت کے، یا حیات بعد الموت کے،
یا جزاء و سزا کے، یا ان سب کے،

ان مسلمانوں میں بعض ایسے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ اسلام اس زمانہ میں
ناقابل عمل ہے اور بعض کا خیال ہے کہ سارا مذہب ایک ڈھکوسلہ ہے
..... پھر ان میں کوئی اسلام کے معاشی نظام کو فرسودہ و بے کار سمجھتا
ہے کوئی اسلامی ریاست کو مضحکہ قرار دیتا ہے، کوئی جنسی تعلقات
پر اسلام کی عائد کی ہوئی پابندیوں کو ایک غیر فطری، غیر حقیقی عمل کی ناجائز،
مضر صحت، حد خارج از وسعت رکاوٹ سمجھ کر انکار و استخفاف کرتا ہے،
کوئی اسلام کی عبادت کے طریقوں کو بے معنی سمجھتا ہے۔ کوئی زکوٰۃ کو
موقوف کرنا چاہتا ہے، کوئی حج کو، کوئی قربانی کو، کوئی نماز کو، کوئی روزہ کو،

ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو اسلام ہی کے نام سے اسلام کی اساسیات تک کا انکار کرتے ہیں، اس کے بنیادی اصول کا مضحکہ اڑاتے ہیں، وہ اپنے غیر اسلامی تصورات کو اسلام کا نام دیتے ہیں، اور اکثر انھیں معلوم نہیں ہوتا کہ وہ اسلام سے الگ ہو چکے ہیں، بلکہ ایسی راہ اختیار کر چکے ہیں جو اسلام سے بالکل برعکس سمت میں جاتی ہے۔"

سب سے خطرناک پہلو اسلام سے ان نئے پھرے ہوؤں یا ارتداد پسندوں کا یہ ہے کہ:۔

"ان ساری باتوں کے باوجود یہ لوگ مسلمانوں کی جماعت میں مسلمان بن کر رہتے ہیں، ان سے شادی بیاہ کرتے ہیں۔ دوستی رشتہ داری، میل ملاپ اور کھانے پینے کے تعلقات قائم کرتے ہیں، بلکہ ان کے جنازے پڑھتے ہیں ان کی عبادتوں میں شریک ہوتے ہیں۔"

بلکہ بہتیرے خود نماز روزہ تک کے پابند ہوتے ہیں۔ مگر عقائد و ایمانیات میں خدا و آخرت وحی و نبوت تک کے تصورات بالکل من مانے اور اسلام کے مسلمات سے قطعاً بے گانے رکھتے ہیں، غرض یہ حرف حرف صحیح ہے کہ

"اس نوعیت اور اس پیمانہ کا فتنۂ ارتداد اسلام کی ساری تاریخ میں کبھی رونما نہیں ہوا"

خود کہا ہی کرتا ہوں کہ آج کی دنیا میں اس طبقہ کے ایک فرد کی بھی اصلاح

جتنی اور جس درجہ میں بھی ہو جائے وہ اہل و عیال، خاندان و برادری، گھر باہر، کچہری دفتر، سیاست و حکومت جہاں کہیں جس چھوٹے بڑے منصب پر ہوگا، اس سے پھیلنے والے وبائی جراثیم کا مار دینا یا کم کر دینا دین کی خدمت ہرگز نہیں، سیف و قلم یا کسی قوت کا کوئی دوسرا جہاد شاید ہی وقت کا اس سے بڑا اور ماجور جہادی عمل ہو سکے۔

"قرآن اور علم جدید" کے مصنف سلمہ سے اس ارتدادی فتنہ کا صرف ایک مگر بڑا متعدی اور خطرناک رخ شاید اتفاقاً و تسامحاً نظر انداز ہو گیا۔ "اسلام کے یہ "ماڈرن مرتد" فقط اپنی ذات ہی تک ایسی راہ نہیں اختیار کر چکے ہیں "جو اسلام سے بالکل برعکس سمت میں جاتی ہے" بلکہ اندھیر یہ مچا رکھا ہے کہ ماڈرن سیاست و حکومت اس کی کونسلوں، اسمبلیوں، وزارتوں وغیرہ کی اونچی سے اونچی کرسیوں اور منصبوں تک پہنچ کر اسلام کے یہ نادان دوست یا چھپے دشمن اسلام کی علانیہ نمائندگی کے نہ صرف خود دعویدار بن جاتے ہیں، بلکہ اسلام کے کھلے دشمن ان کو اپنی اسلام دشمنی کا بہترین نمائندہ پا کر بڑے جوش و خروش سے ان کا استقبال کرتے ہیں۔

اس اتفاقی تسامح کے سوا حق یہ ہے کہ مصنف کے قلم سے اللہ تعالیٰ نے اس ہولناک ارتدادی فتنہ کے ایک ایک خط و خال کو چند سطروں میں نمایاں کرا کے پوری امت، خصوصاً علماء امت کی آنکھیں کھولنے

کے لیے اتمام حجت کا پورا حق ادا کر دیا۔ (جزاہ اللہ عن الاسلام وامتہ) اسی سے زیادہ متاثر ہو کر ہمارے مولانا علی میاں سلمہ ——— بارک اللہ فی برکاتہم ——— اس "نئے طوفان کے مقابلہ"[1] میں بے تابانہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ لیکن اس طوفان کے زور کو روکنے اور توڑنے کے لیے نرے "تحقیقاتی و نشریاتی" لٹریچر کا طوفان اٹھا دیا جائے تو بھی ہرگز کافی نہیں، دگانہ کیفا۔ بلاشبہ فرض کفایہ کے درجہ میں ضرورت اس کی بھی ہے۔ لیکن کفایت کے درجہ میں کارگر قطعاً نہیں اولاً تو اس سے مستفید و متاثر ہونے والے سو میں دو چار ہی ہوتے ہوں گے۔ دوسرے اس کی نوعیت زیادہ تر کلامیاتی ہے یعنی وقت کے ذہنی و عقلی رجحانات و تصورات کی زبان

[1] "نیا طوفان اور اس کا مقابلہ" نام کے رسالہ میں مولانا سلمہٗ کے زور قلم نے "قرآن اور علم جدید" کے مصنف کی بروقت تنبیہات کو اور زیادہ پر زور و موثر بنا دیا ہے، لیکن موصوف سے بڑھ کر کسی سے ایسی حقیقت کو سمجھنے کی توقع کی جانی چاہیے کہ ایمانی حقیقت و بصیرت کی رو سے یہ طوفان الحاد بھی بداہتہً خود ہم مسلمانوں کی شامت اعمال یا خدا کی نافرمانیوں سے۔ اور اس کا مقابلہ از سر نو انابت و استغفار یا ایمان و عمل صالح۔ بالفاظ دیگر خدا و رسول کی اطاعت و اتباع کی انفرادی و اجتماعی زندگی سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ از سر نو راضی ہوں گے۔ اور تب ہی ان کی نصرت لٹریچر وغیرہ کی ظاہری تدابیر میں بھی شریک ہوگی۔ ورنہ خالی لٹریچر کے پروپیگنڈے یا طوفان میں اہل باطل نہ آج اہل حق سے پیچھے ہیں۔ نہ آئندہ ہوں گے۔

ان دینی و اسلامی تعلیمات کی لسانی و قلمی تفہیم و ترجمانی۔ یا جیسا کہ ندوہ کا روز
ول سے ایک بڑا نصب العین وقت کے لسانی و قلمی رازی و غزالی پیدا کرتا
رہا ہے، اور کچھ نہ کچھ پیدا کیے بھی۔ لیکن مولانا دریا آبادی سلمہ جیسا کہ بار ہا
دفتروں کا فیصلہ نقروں میں فرمایا کرتے ہیں ایک مراسلہ کے سلسلہ میں عین
ان سطروں کے دوران تحریر میں ان کا جواب یہ ملا کہ "اگر الفاظ کے زور سے
سب کو قائل کر دینا ممکن ہوتا تو امام رازیؒ کے عہد کے بعد دنیا میں
کوئی ملحد یا دہریہ باقی ہی کیوں رہ جاتا"[1]
پھر ندوہ نے جتنے "رازی" قریباً پون صدی میں پیدا کیے ہوں گے ان
سے بہت زیادہ اور زیادہ کامیاب مولانا مودودی یا جماعت اسلامی نے چوتھائی
صدی ہی میں پیدا کر دیئے۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ عصری کلامیات کے لیے جیسا سینہ
حق تعالیٰ نے اس جماعت کے اہل علم کا کھول دیا ہے اور "تحقیقاتی و نشریاتی"
لٹریچر کی حد تک ہندوستان و پاکستان کی جماعت اسلامی کے رازیوں نے
اس فرض کفایہ کا جیسا حق ادا کر دیا اور کر رہے ہیں اس کی مثال کسی دوسری
جماعت کیا شاید ہی کسی دوسرے مسلمان ملک میں ملے۔
اب اگر زیادہ ضرورت ہے تو ندوی و مودودی وغیرہ رازیوں نے جو

[1] صدق ۲۹ جولائی سنہ ۱۹۶۰ء

لٹریچر پیدا کر دیا ہے۔ اس کو انگریزی، ہندی، بلکہ عربی وغیرہ دوسری زبانوں میں منتقل کرانے کی۔ باقی جان سخن وہی ہے کہ نہ خالی الفاظ کا زور پہلے "رازیوں" کا کافی تھا۔ نہ نئے "رازیوں" کا ہو گا۔

کیونکہ دین اپنی حقیقت میں نام ہے ظاہر سے بہت زیادہ باطن یا قلب کے انقلابات کا۔ بلکہ معتبر اس کا ظاہر بھی صرف وہی ہے جو جس قدر باطن کا پرتو ہو۔ زبان وقلم کی متکلمانہ سخن سازیوں سے کچھ زبانوں کو تو خاموش کر دیا جاتا ہے، گو نہ خاموش ہونے والی زبانیں اس راہ سے بھی خاموش نہیں کی جاسکیں۔ عقل بیچاری ایسا دو کیلا نہ حربہ یا دو دھاری تلوار جو دونوں طرف چلتی ہے۔ اس سے دینی حقائق کو جس طرح ثابت کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح باطل بھی کیا جاسکتا ہے۔ یہ موقوف وکیل کی وکالت وذہانت پر ہے کہ وہ مقدمہ کے کس پہلو کی تائید و تردید کرنا چاہتا ہے۔ کہا ہی کرتا ہوں کہ عقل جج نہیں وکیل ہے۔ جیسا مقدمہ اس کو دے دو گے اس کے مطابق وکالت کر دے گی۔ رہا راسخ و پائدار قلبی انقلاب، اس کی صحیح راہ چھوٹے بڑے کسی پیمانہ پر بھی "تحقیقاتی و نشریاتی" نہیں، انبیائی یا اہلِ قلوب کی راہ ہے۔ ورنہ نفس ہدایت تو انبیاء کے بس میں بھی نہیں۔ نبی الانبیاء تک کو تنبیہہ رہی ہے کہ "انک لا تھدی من احببت ولکن اللہ یھدی من یشاء" اور ہماری بندگی کا فریضہ دین و دنیا کے سارے معاملات میں ایمان وعمل صالح کے اسباب کو اختیار کرنا اور نتائج کو مسبب الاسباب

کے حوالہ کرنا۔

اس لیے ظاہری اسباب و تدابیر کی حد تک ۔۔۔۔ بھی کلامیاتی لٹریچر کے فرض کفایہ کے ساتھ زیادہ ٹھوس تدبیر گیلانی اقامت خانوں ہی کی ہے۔[1] ان کے نظام کو اعلیٰ تعلیم کے ارتدادی فتنہ یا "نئے طوفان" کے مقابلہ میں شہر شہر اس طرح پھیلایا جائے جس طرح آج نام کی نامذہبی (سیکولر) تعلیم کے فتنہ کے مقابلہ میں دیو۔ پی میں خصوصاً گاؤں گاؤں ابتدائی اسلامی مکاتیب پھیلانے کی ضرورت شدت سے محسوس ہو کر کچھ کچھ کام بھی چل نکلا ہے۔ وفقنا اللہ لما یحب ویرضیٰ۔

تاہم ظاہر ہے کہ گیلانی اقامت خانوں کی تجویز بھی ایک ظاہری تدبیر ہی ہے۔ اور بذات خود کوئی ٹھوس قلبی انقلاب رونما کرنے کے لیے ناکافی۔ لہٰذا اس قلب

---

[1] اور اب تو سفر یورپ سے واپسی پر ماشاءاللہ خود ہمارے علی میاں اس کفرستان تک تعلیم پانے والے مسلمان طلبہ کیلئے یہ تاثر و پیام لے کر آئے ہیں کہ جہاں تک مسلمان طلبہ اور نوجوانوں کا تعلق ہے، جو یہاں لاکھوں کی تعداد میں انگلستان، فرانس، جرمنی اور اسپین میں زیر تعلیم ہیں ان کی اصلاح و تربیت اور ان کی استقامت کی حفاظت کے لئے سب سے بہتر نسخہ وہ ہے جو ہندوستان کے لئے مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے تجویز کیا تھا اور اب ہمارے مولانا عبدالباری ندوی اس کے علمبردار و داعی ہیں۔ یعنی طلبہ کے لئے اقامت خانوں کی تاسیس اور ان میں اچھے نگراں اور مربی کا انتظام، پھر کیسے چراغ تلے اندھیرا!

صدق جدید، ۷ر جنوری ۶۴ء"

وقالب دونوں کے نابکار راقم کے نزدیک ان اقامت خانوں کے لیے بھی کسی نہ کسی معتد بہ درجہ تک کچھ نہ کچھ اہل قلوب کا تعلق اور ان کی ہمت و توجہ کو حاصل کرتے رہنا ضروری ہے۔ خواہ وہ بجائے خود زبان و قلم کے اکن یا کتابی و ظاہری علم کے اعتبار سے بالکل امی ہوں۔ ایسی ایک غیر معروف لیکن بڑی عجیب و نادر زندہ مثال آپ الفرقان[1] کے صفحات میں "اللہ کا ایک بندہ" کے عنوان سے پاسکتے ہیں، قرآن کا مطالبہ بھی علم و قلم یا الفاظ کے زور سے "قرآن کی داد دینے" سے بھی پہلے "اللہ کا بندہ ہی بندہ" بننے بنانے کا ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ، اللہ کے اس جیسے بندہ قلبی کی توجہ و دعا کیا اس کو محض آنکھوں سے دیکھتے رہنا ہی انشاء اللہ وہ کام کرے گا جو زبان و قلم کے دفتر کے دفتر نہیں کر سکتے۔

بات میں بات نکلتی اور دراز نفسی بڑھتی چلی جارہی ہے۔ لیکن موقع پا کر عرض کئے بغیر نہ رہ گیا کہ صاحب مکتوبات حضرت گیلانی کی زبان و قلم کے زبانی و قلمی ہزاروں عقیدتمندوں میں شاید کوئی صاحب عمل بھی ایسا نکل آئے، جس کو حضرت مرحوم کی اس ٹھوس عملی تجویز کو عمل میں لانے کی توفیق مل جائے۔ کسی پیمانہ پر بھی اگر ایک عملی نمونہ سامنے آگیا تو انشاء اللہ آگے کا راستہ کھل جائے گا۔ ورنہ بظاہر مرحوم کے ساتھ

---

[1] الفرقان ماہ جولائی سنہ [illegible]ء

ان کی یہ تمنا بھی مرحوم ہی ہو چکی ہے!

آخر ۱۹۵۵ء (۱۱ر نومبر) کے ایک مکتوب گرامی میں بھی اس تمنا کے بار بار اظہار کو اس طرح ظاہر فرما گئے ہیں کہ:۔

"میں اپنے بزرگوں اور کام کرنے والے ارباب ہم سے عرض کرتا رہتا ہوں کہ اسلامی اقامت خانوں کے قیام سے یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ جہاں کہیں سرکاری اسکول و کالج ہیں کوشش کی جائے کہ وہاں مسلمانوں کے اقامت خانے قائم کئے جائیں۔ جن میں اسلامی زندگی کی عملاً اور قرآنی ادب کی تعلیماً۔ بس ان دو باتوں کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ سادہ کھانا، سادہ قیام گاہ۔ کم از کم مصارف مدارس و مکاتب کے مقابلہ میں جہاں تک میرا خیال ہے، اقامت خانوں کا نظام موجودہ حالات کے لحاظ سے غالباً زیادہ نتیجہ خیز ثابت ہو۔

لیکن تجویز کے سراہنے والے تو مل جاتے ہیں، لیکن عملی جد و جہد میں جو مشغول ہیں ان کو بھی نمونہ کی حد تک اس تجویز کو عملی قالب میں لانے کی توفیق نہیں ہوتی"[1]

راقم عاجز کو حرف حرف اپنے تجربات ہوتے، دل کو لگی۔ یہ تجویز ایسی لگی تھی کہ نوکری سے رہائی پاتے ہی چاہا تھا کہ ابتدائی تجربہ و نمونہ کے طور پر کسی نہ کسی طرح

---

[1] مکاتیب گیلانی ص

آغاز ہو جائے، لیکن خود کسی ایسی عملی خدمت کیا عملی تعلقات ہی کے سرے سے
نالائق ہوں، ایک جوان صالح جوان ہمت صاحب علم و عمل آمادہ بھی ہوئے،
پھر یاد نہیں کیا صورت یا کیا معذوری ان کو پیش آئی کہ خیال خواب ہو کر رہ گیا۔
مولانا کی وفات پر خصوصاً جب بعض ان کے عقیدت مندوں نے ان کی یادگار کا ذکر
چھیڑا تو یہ خواب از سر نو یاد آ گیا۔ ظاہری اسباب بھی فراہم نظر آئے، بڑا مسئلہ مکان
کا ہو سکتا تھا، خاکسار خود اپنا خاصا بڑا مکان کامل تملیک کے ساتھ پیش کر لے
کو تیار تھا۔ تائید و تقویت فرمانے والے مولانا دریا آبادی۔ مولانا نعمانی، مولانا علی میاں
اور (ناظم ندوہ) ڈاکٹر مولانا سید عبد العلی سلمہم جیسے حضرات تھے۔

مگر کمند ٹوٹی کہاں جا کر کہ ایسے اقامت خانہ میں قیام و انتظام کے لیے
موزوں نگراں دستیاب یا تیار نہ ہوا۔ حالانکہ ضرورت نہ اس کے لیے قدیم و جدید
علوم و فنون کے کسی فاضل کی ہے۔ نہ کسی بڑے خطیب و مقرر، مصنف و انشا پرداز
کی، احکام دین کے بقدر ضرورت علم کے ساتھ ایمان و عمل صالح کی معتدبہ عملی زندگی
کافی ہو سکتی ہے۔ البتہ جدید تعلیم والوں کے ذہنی رجحانات سے اتنا ضرور مانوس
ہو کہ ان کی رعایت کے ساتھ ان کی نگرانی کی خدمت انجام دے سکے۔ بلکہ خود
جدید تعلیم والوں ہی میں سے ہو تو کیا کہنا۔ اور بڑے شہروں خصوصاً ان کے
اسکول و کالج کے اساتذہ میں بعض افراد ایسے نظر بھی آتے رہتے ہیں۔ ان کے
لیے اگر قیام وغیرہ کی کچھ سہولتیں فراہم ہو جائیں تو غالباً کوئی نہ کوئی آسانی

ے تیار ہو جائے۔

یوں تو کچھ نہ کچھ مشکلات سے چھوٹا کون سا کام خالی ہوگا۔
لیکن اس جدید ہولناک ارتدادی فتنہ و طوفان کے مقابلہ کے لیے اسلامی
اقامت خانوں کی گیلانی تجویز ہی سب سے زیادہ کارگر ہونے کے
ساتھ عملی و آسان بھی ہے۔ تاہم تجربہ ہندوستان سے لے کر پاکستان
تک مولانا گیلانی والا ہی ہوتا رہا کہ "تجویز کے سراہنے والے تو
مل (کیا بہت مل) جاتے ہیں۔ لیکن عملی جدوجہد میں جو جو مشغول
ہیں (مثلاً جماعت اسلامی، جماعت تبلیغی، اور جمعیۃ العلماء) ان کو بھی نمونہ
کی حد تک اس تجویز کو عملی قالب میں ڈھالنے کی توفیق نہیں ہوئی"۔ بات وہی
ہے کہ یہ کام ہے زیادہ تر خالص ٹھوس عمل اور پتہ ماری کا، اور ہمارے اندر
بے نام کے کام کی عملی صلاحیت بالعموم اور بھی روز بروز زوال پذیر ہے سو آئندہ
علی گڑھ، حمایت الاسلام، جامعہ ملیہ وغیرہ جو ایک صدی کے اندر کی عملی
یادگاریں ہیں اب وہ بھی الا ماشاء اللہ اپنی رہی سہی اصل روح و مقصد
سے بڑی حد تک دور ہو چکی ہیں۔ اگر کہیں کچھ ہو بھی رہا ہے تو زیادہ تر ظاہری
و نمائشی یا کمی و عددی طور پر۔ اندر کی جب کچھ خبر ملتی ہے تو عموماً دردناک
و دل شکن ہی ملتی ہے اس "ہر روز تیرگی بیشم" کے دیکھتے جہاں کہیں کچھ صحیح
کام ہو رہا ہے غنیمت ہی غنیمت معلوم ہوتا ہے۔ اور اہل اخلاص کا اجر

انشاء اللہ یہ مآل یقینی ہے۔

صاحب مکتوبات کی اقامت خانوں کی تجویز کچھ تفصیل سے اس لائحہ میں شریک مکتوبات کر دی کہ شاید کسی صاحب اخلاص و عمل کو نمونہ کی حد تک ہی عمل میں لانے کی توفیق مل جائے۔ اللہ مرحوم صاحب مکتوبات کی یہ "مرحوم" آرزو عملی زندگی پاکستان کے اور صاحب توفیق، دونوں کے لیے بہت بڑے خیر جاری کا سرچشمہ بن جائے ورنہ اس سراپا نصیحت ناکارہ و تباہ کار کے لیے زبان نصیحت ہلانا بھی شرمناک ہے۔ کبر مقتاً عند اللہ ان تقولوا ما لا تفعلون۔ زشت باشد روئے نازیبا و ناز!

والسلام علی من اتبع الھدیٰ

مکاتیب

مکتوب بنام

اہلیہ مولوی سید محمد یعقوب صاحب وکیل

مولوی سید محمد یعقوب صاحب وکیل استھانواں ضلع پٹنہ کے رہنے والے، بہار شریف میں بڑی کامیاب وکالت کرتے تھے، علامہ گیلانی کے حقیقی ماموں، اور وکیل صاحب کی اہلیہ مولینا کی رضاعی ماں بھی تھیں۔ وکیل صاحب کو محل اولیٰ سے لڑکیاں ہی تھیں، اس لیے موصوف مولانا سے بیٹے کی طرح محبت کرتے تھے اور مولینا بھی اپنے بچپن میں اکثر استھانواں یا بہار شریف میں رہتے تھے۔

مولینا کا یہ خط وکیل صاحب کی اہلیہ کے نام ہے جس کی ہر سطر سے گہرا ارتباط اور محبت نمایاں ہے۔ فاضل گیلانی کے بچپن کا صرف یہی ایک خط ہے جو ہمیں ڈاکٹر جلیل المظفر صاحب کٹنی کول ضلع مونگیر (مولانا کے بھانجے) سے دستیاب ہوا۔ یہ خط آج سے ۶۰ سال پہلے لکھا گیا تھا، اس وقت مولینا ریاست ٹونک میں پڑھتے تھے، اور ان کی عمر کا سولہواں سال تھا۔ خط پر مولانا کے قلم سے لکھی ہوئی تاریخ ۵ عید الضحیٰ روز جمعہ سنہ ۱۳۲۵ھ ہے۔ اور ڈاکخانہ کی مہر میں ۱۱ جنوری سنہ ۱۹۰۸ء درج ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جناب ممانی صاحبہ قبلہ ظلہا تسلیم عرض ہے

واہ! جناب واہ!! خوب جواب خط دیا، کیوں نہیں، آپ کو ہمارا خط گویا ملا ہی نہیں ممانی صاحبہ! یہ بھی کوئی شرط انصاف ہے۔ دو قطعہ کارڈ ترسیل خدمت اقدس کر چکا ہوں لیکن بدقسمتی اور بدنصیبی کی مارے خط کا جواب مارا پڑ گیا میں یقین کر کے لکھتا ہوں کہ آپ کی ذات سے ایسی امید ہے کہ مفصلاً جواب خط سے مجھے سرفراز فرمایا ہوگا۔ لیکن ہماری قسمت ایسی پھوٹی ہے کہ ڈاکیہ خط کو راستے میں نہ معلوم کہاں کی بغض للّٰہی رکھ کر پھاڑ دیتا ہے (یہ تقدیر کی خوبی ہے)۔ اب بتائیے کہ آپ کے مزاج اقدس اچھے نہ ہیں۔ ماموں صاحب استھانواں گئے ہیں یا نہیں، سنا ہے کہ غضب کی گرانی اور قحط پورب میں پڑی ہوئی ہے۔ کیا سبب ہے غلہ کے نرخ سے بھی مطلع فرمائیے گا۔ جناب نانی صاحبہ سے تسلیمات عرض ہے۔ آپ بھی سکوت کے عالم میں کیوں ہو گئیں۔ مجھے معلوم ہے جس وجہ سے آپ نے خط کے جواب میں سستی فرمائی۔ خیر مجھے چنداں ضرورت نہیں صرف آپ کے دل کا اندازہ دیکھنا تھا جس کا اندازہ مجھے بخوبی معلوم ہوگیا۔ گو بقرعید بھی قریب ہے، لیکن مجھے ضرورت نہیں۔ اللہ یکفینی : مجھے اللہ کفایت ہے، اور جو شخص کہ میرے حال کو دریافت کرے انھیں میرا سلام کہہ دیجئے گا۔ خاص کر چھوٹی نانی صاحبہ و بڑی نانی صاحبہ کو۔ اور اگر ماموں صاحب آئے ہوں

تو ان کو ہمارا اسلام علیکم کہہ دیجئے گا۔ اور فرما دیجئے گا کہ عدیم الفرصتی کی وجہ سے آنحضور کی خدمت میں خط نہ لکھ سکا۔ بہار کا مکان طیار ہوگیا۔

سیّد محمد مناظر احسن ضیاء گیلانوی

از ٹونک تاریخ ۵ عید الضحیٰ روز جمعہ ۱۳۲۵ھ

مکتوب بنام

مولانا حکیم یوسف حسن خاں صاحب سوری رحمانی

بہار شریف

اعلیٰ حضرت قبلہ مدظلہ العالی   السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میں نے "القاسم" ذی الحجہ اور "الرشید" بھیج دیا ہے، ملا ہوگا۔ اسی میں بیماری کی بھی خبر تھی۔ حضور تردد نہ فرمائیں۔ اب اچھا ہوں۔ بانکی پور سے خط آیا تھا جواب میں نے دیدیا۔ آپ نے توکل کرنے کے لئے کہا ہے۔ متوکل ہوں، اور انشاء اللہ تعالیٰ اس سال دیوبند ہی رہوں گا۔ تیس روپے سے زیادہ تنخواہ ملنی ناممکن ہے۔ کھانا بھی اب نہیں ہو سکتا۔ حضور نے جو خط لکھا ہے اس کا پیش کرنا کسی طرح سودمند نہیں۔ بلکہ ایک حد تک مضر ہے، آئندہ خداوند تعالیٰ میرے لئے کیا صورت پیدا فرماتا ہے اسے معلوم۔

کھانے پینے، کپڑے، دوا دارو، میں ملاکر گویا اس وقت تک میں اس قدر کما سکا کہ تیس روپیہ مدرسہ کا قرضہ ادا کیا۔ اور رہا ذی الحجہ کی تنخواہ، تو اس میں کرتے پائجامے، جاڑے کے کپڑے، تین مہینہ کا کھانا سب شمار کیجئے۔ محرم کی تنخواہ سے بیس تو گیلانی روانہ کیا گیا۔ دس روپیہ میں کھانا صفر کا، اور تمام اخراجات مع ادویہ وغیرہ کئے ہیں۔ بھائی عبدالعزیز صاحب کو بھیجنے کی نوبت نہیں آئی۔

شاہ صاحب کی شادی ایک سیدہ سے گنگوہ میں ہوگئی ہے۔ ان کی تنخواہ پچھتر ہے مقرر ہوئی، شادی کے بعد تنخواہ لینی منظور کی ہے۔ اپنے ہیں اور بیوی، پچھتر بہت ہے۔ حافظ احمد صاحب کے یاں دونوں میاں بیوی کھانا کھاتے ہیں اور انھیں کے گھر میں رہتے ہیں۔ آپ کے مضمون کے متعلق انھوں نے کچھ لکھنے کیلئے کہا ہے لیکن شادی کی مصروفیت کے باعث موخر

بہت کم وفا ہوتے ہیں۔

میں نے گزشتہ خط میں لکھا تھا کہ مجھے طحال ہوگئی ہے۔ اب اس میں بحمداللہ تخفیف ہے۔ تین مسہل ہوئے۔ بلغم امزاج کے غلبہ سے سارا جھگڑا کھڑا ہوا تھا۔

بانکی پور سے پھر ناجو وغیرہ کا خط آیا ہے۔ لیکن میں جواب دیدوں گا، جب حضور کی یہی مرضی ہے کہ خواہ آرام ہو یا تکلیف، دیوبند ہی رہنا چاہیے تو مجھے کیا عذر۔ لیکن ابتک سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر حضور نے میرے لئے کیا حشر قرار دیا ہے۔

ملانوں کے مدرسوں میں غایت سے غایت پچاس سے آگے مل نہیں سکتا، اور میں اتنی تنخواہ کے لئے اپنے آرام کو قربان نہیں کرسکتا۔ خیر جو مرضی اقدس ہو۔ میں تو یہاں پڑا ہوں، زیادہ کیا عرض کروں۔ ہر طرح خیریت ہے، دیوبند میں تو میرا جی نہیں لگتا۔ فقط

مناظر احسن عفی عنہ

مکتوب بنام

مولانا محمد زکریا صاحب محمودی

مولانا زکریا محمودی، قصبہ ہیاگھاٹ ضلع دربھنگہ میں ۱۳۱۲ھ میں پیدا ہوئے متوسطات تک مدرسہ امدادیہ دربھنگہ میں پڑھا۔ اور ۱۳۳۰ھ میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی۔ توضیح تلویح میں فاضل گیلانی کے رفیق درس رہے۔ ہم وطنی اور طبعی مناسبت کی وجہ سے دونوں میں گہرے روابط رہے، فراغت کے بعد مولینا زکریا صاحب مدرسہ امدادیہ لہریاسرائے، مدرسہ اسلامیہ ڈھاکہ، جامعہ رحمانی خانقاہ مونگیر وغیرہ میں مدرس رہے۔ بہت دنوں تک جمعیۃ علماء صوبہ بہار کے نائب ناظم رہے؛ تالیفات میں رسالہ "نجات" شائع ہوا۔ اور ترغیب الزکوٰۃ غیر مطبوعہ ہے۔ آخر میں بہت ضعیف و کمزور ہوگئے تھے۔ امراض نے لاچار کردیا، اور مکان پر ہی اللہ کی یاد میں مشغول رہے۔ ۱۹۶۱ء میں وفات پائی اور اپنے وطن میں مدفون ہیں۔

برادر محترم بھائی ابو یحییٰ محمد زکریا صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آپ کا اور نہ صرف آپ کا بلکہ دربھنگہ کے احباب میں سے محض پہلی دفعہ آپ کا عنایت نامہ آیا ہے لیکن خنجروں اور نشتروں سے بھرا ہوا۔ برادرِ من میں نے علماء کی جماعت سے کنارہ کشی اختیار کی لیکن کیوں؟ ؎

"دلم از صومعہ بگرفت خرقہ سالوس | کجاست پیرِ مغان و شراب ناب کجا"

مستی اور جنون؛ نہ جانے آپ کا کہاں خیال ہے؛ اسی کی تو کمی ہے کہ میں اب تک مجنون کیوں نہ ہوا۔ سب کچھ ہو کر دیکھا لیکن مزہ کسی میں نہ آیا میں نے اب ارادہ ؎

عشق می ورزم و امید کہ ایں فنِ شریف | چوں ہنرہائے دگر موجبِ حرماں نشود

اور جس کسی سے ملتا ہوں، جس سے کچھ کہتا ہوں وہ یہی مسئلہ ہے۔

معلوم نہیں اس خط سے آپ کی غرض کیا تھی۔ مولوی لطف اللہ[1] صاحب کو آپ کا

---

[1] حضرت مولینا سید شاہ لطف اللہ صاحب حضرت مونگیری علیہ الرحمہ کے صاحبزادے تھے۔ ۲۸ رمضان ۱۳۲۰ھ میں کانپور میں پیدا ہوئے تعلیم مونگیر ہی میں حاصل کی۔ درس نظامی کی ساری کتابیں حضرت مولینا مفتی عبد اللطیف صاحب سے خانقاہ ہی میں پڑھیں اس کے بعد حضرت والد ماجد علیہ الرحمہ سے بیعت کی، اور انھیں کی تربیت میں رہے ۱۳۴۶ھ بمطابق ۱۹۲۷ء میں حضرت مولینا مونگیری علیہ الرحمہ کے وصال کے بعد پہلے جانشین اور صاحب سجادہ منتخب ہوئے۔ اور کامل پندرہ سال تک خانقاہ رحمانی میں شمع معرفت آپ ہی کے دم سے روشن رہی۔ آپ ہی نے جامعہ رحمانی ۱۹۲۷ء میں قائم فرمایا، جو ۱۹۳۴ء کے ہولناک زلزلہ کے بعد بند ہو گیا

(باقی ص ۸۹ پر)

خط دے دیا تھا۔ خدا جانے انھوں نے روپیہ کا کیا بندوبست کیا۔ یا کیا کیا۔

یہ سنکر کہ بہار کے قطب حضرت مولینا شاہ بدرالدین[1] صاحب اپنے مالک سے جا ملے، صدمہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ کسی کو ان کا سچا جانشین بنائے۔ علماء سے اصلاح و تربیت کی امید فضول ہے۔ کچھ اللہ والوں سے توقع ہے۔ خدا کرے کوئی اپنے مخلوق کا نہیں اپنے خالق کا بندہ ہو

(بقیہ حاشیہ ص ۸۸) اور ۱۹۳۲ء میں پھر کھولا گیا۔ حضرت مولینا لطف اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ۲۲ اکتوبر ۱۹۴۲ء کو رحلت فرمائی۔ مزار مبارک خانقاہ رحمانی کے احاطہ میں ہے۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

[1] حضرت مولانا سید شاہ بدرالدین صاحب قادری قدس اللہ سرہٗ جمادی الاخریٰ ۱۲۶۱ھ کو پھلواری شریف ضلع پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ درسیات اپنے والد ماجد مولینا شاہ شرف الدین اور مولانا شاہ محمد علی حبیب نصر سے پڑھیں۔ اور پھر مولینا شاہ محمد علی حبیب نصر سے بیعت کی۔ اور تصوف کی تعلیم بھی حاصل کی تینتیس ۳۳ سال تک خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف ضلع پٹنہ کے سجادہ نشین رہے۔ ۱۳۳۹ھ میں آپ صوبہ بہار و اڑیسہ کے امیر شریعت منتخب ہوئے۔ حضرت موصوف اپنے وقت کے مشہور شیخ طریقت اور صاحب فیض بزرگ تھے۔ علم باطن کے ساتھ حق تعالےٰ نے علم ظاہر سے بھی حصہ وافر عطا فرمایا تھا جس کی شہادت آپ کے ملفوظات علمیہ سے ملتی ہے اور جو "لمعات بدریہ" کے نام سے چند حصوں میں شائع ہو چکی ہے۔ آپ نے چھہتر سال کی عمر پائی اور صفر ۱۳۴۳ھ میں وصال فرمایا۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

مولینا المحترم المخدوم حضرت مولوی عبدالوہاب[1] صاحب کی خدمت میں سلام فرما دیجئے اور یہ کہ دعا کا خواستگار ہوں ــــــ مولوی عبدالرحیم[2]،

[1] حضرت مولانا عبدالوہاب صاحب علیہ الرحمہ کا وطن بلاسپور ضلع دربھنگہ تھا، ولادت ۱۲۹۰ھ میں ہوئی۔ مڈل پاس کیا اور تجارت میں لگ گئے، لیکن خدا کو منظور کچھ اور تھا۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا اور دینی تعلیم کی طرف غیر معمولی رجحان ہوگیا۔ ابتداءً مدرسہ امدادیہ دربھنگہ میں اور پھر دارالعلوم دیوبند جاکر حضرت شیخ الہندؒ سے علوم دینیہ کی تکمیل کی۔ زمانۂ تعلیم ہی میں اپنی ذکاوت و فطانت کے سبب ساتھیوں میں ممتاز تھے۔ قطب العالم حضرت مولینا مونگیری علیہ الرحمہ سے بیعت حاصل تھی۔ اور تیس چالیس سال تک مدرسہ امدادیہ دربھنگہ میں ابتداءً مدرس کی حیثیت سے پھر شیخ الحدیث اور مہتمم کے منصب پر رہے۔ ملک کی تحریک آزادی میں بڑا حصہ لیا اور اس سلسلہ میں آپ حضرت شیخ الہندؒ کے خاص خادموں میں تھے متعدد بار گرفتار ہوئے۔ اور ایک دفعہ تقریباً ڈھائی سال تک رانچی جیل میں قید و محن کی مصیبت برداشت کی جیل میں بھی مولینا کا مشن جاری رہا اور درس قرآن دیتے رہے علم و فضل، تقویٰ اور دیانت، درس و تدریس، وعظ و خطابت کے جامع تھے۔ جون ۱۹۴۸ء میں رحلت فرمائی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔ ۱۲

[2] آپ مہراج گنج شہر دربھنگہ میں ۱۳۰۸ھ میں پیدا ہوئے اللہ تعالیٰ نے فہم و ذکاوت سے حصۂ وافر عطا فرمایا۔ مدرسہ امدادیہ، انجمن نعمانیہ شاہی مسجد لاہور، میڈھو، ٹونک، اور دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کی۔ ٹونک اور دیوبند میں مولینا گیلانی کے رفیق درس رہے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ، مولانا مدنی علیہ الرحمہ، مولینا مرتضیٰ حسنؒ، مولینا ماجد علی اور مولانا برکات احمد صاحب رحمہم اللہ آپکے اساتذہ تھے ۱۳۳۷ھ میں

(باقی حاشیہ صفحہ ۹۱ پر)

مولوی عبدالحفیظ[1] الصدیق، مولوی عبدالودود، قاری احسن[2] اور دوسرے یاد فرماؤں کو سلام فرما دیجئے۔ کیا کہوں دربھنگہ آنے کو جی چاہتا ہے لیکن ژولیدہ بالی نے کہیں کا نہ رکھا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۰) فارغ ہوئے معقولات میں مہارت تامہ حاصل تھی۔ فراغت کے بعد سے آخر تک مدرسہ امدادیہ سے منسلک رہے۔ افسوس ہے کہ مولانا مرحوم اپنی طویل علالت کے بعد بمرض کینسر ۳۱ جولائی ۱۹۶۰ء مطابق ۶ صفر ۱۳۸۰ھ کو اس دار فانی سے رحلت فرما گئے اور اس طرح قوم اپنے ایک مخلص خادم سے محروم ہوگئی۔ رحمہ اللہ وغفرلہٗ۔

[1] حضرت مولینا مفتی عبدالحفیظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مولد سلیم پور رسیڑھولی، ضلع دربھنگہ ہے۔ ۱۳۰۸ھ سال ولادت ہے۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ امدادیہ میں حاصل کی۔ پھر دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے۔ اور ۱۳۳۳ھ میں فارغ ہوئے۔ حضرت شیخ الہند، علامہ کشمیری، حضرت شیخ الاسلام مولینا مدنی رحمہم اللہ آپ کے اساتذہ میں سے ہیں۔ تقریباً پینتالیس سال تک مدرسہ امدادیہ دربھنگہ میں فقہ، اصول فقہ اور دوسرے علوم کا درس دیتے رہے، اور افتاء کا کام انجام دیا۔ اللہ نے فقہ میں بڑا ملکہ عطا فرمایا تھا جزئیات فقہ نوک زبان پر تھیں، منکسر المزاج اور مہمان نواز تھے، اشعار کا بڑا ذوق تھا دواوین کے حافظ تھے۔ ۱۳۸۰ھ میں کینسر جیسے مہلک مرض میں مبتلا ہو کر واصل بحق ہوئے، رحمۃ اللہ علیہ۔

[2] مولوی قاری محمد احسن صاحب نسبتہ ضلع دربھنگہ میں پیدا ہوئے عربی کی تعلیم مدرسہ امدادیہ دربھنگہ اور دارالعلوم دیوبند میں حاصل کی اور فن تجوید و قرأت کی تکمیل کیلئے ایک عرصہ تک مولوی قاری ضیاء الدین صاحب اور مولینا قاری عبدالرحمٰن صاحب الہ آبادی کی خدمتوں میں رہے تقریباً پوری زندگی تجوید کی تعلیم و اشاعت میں گذری۔ مدرسہ امدادیہ دربھنگہ، مدرسہ خانقاہ کبیریہ سہسرام، مدرسہ امدادیہ مرادآباد اور سیوہارہ ضلع بجنور میں

(باقی صفحہ ۹۲ پر)

ہاں! سنئے تو سہی۔ آپ کے شہر میں سنتے ہیں کہ آموں کے قلم ملتے ہیں۔ اخباروں میں بھی دیکھتا ہوں۔ میرے والد صاحب گیلانی میں ایک باغ لگا رہے ہیں۔ لگائے کیا ہیں، پرانے باغ میں کچھ زمین خالی ہے اس کو بھرنا چاہتے ہیں۔ کیا آپ سے امید کر سکتا ہوں کہ چند قلموں کا انتظام کر دیجئے۔ آپ نہیں، مولوی عبدالوہاب صاحب، کوئی صاحب۔ سنا ہے کہ وہاں پنجسالہ قلم بھی ملتا ہے کیا یہ واقعہ ہے؟ اور کیا ایسا قلم دوسری جگہ جا کر کتنے دن میں پھلتا ہے صرف لنگڑا کی ضرورت ہے، اگر تکلیف نہ ہو تو ان سوالوں کا جواب دیجئے۔

مناظر احسن گیلانی

ترب بازار، جام نگر، حیدرآباد دکن

(بقیہ حاشیہ صہ ۹۱) اسی فن کے مدرس رہے۔ اخیر میں جامع مسجد لہریا سرائے دربھنگہ کے امام مقرر ہوئے اور نومبر ۱۹۵۷ء میں وفات پائی۔ رحمہ اللہ۔

ا؎ فاضل گیلانی علیہ الرحمہ کے والد بزرگوار کا اسم گرامی حافظ ابوالخیر صاحب تھا۔ حافظ صاحب کی عمر چودہ سال کی تھی کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ اس لئے حفظ اور فارسی کی تعلیم سے آگے نہ بڑھ سکے اور گھر کی زمینداری اور کاشتکاری کے کاموں میں مشغول ہو گئے۔ حافظ صاحب کے یہاں تین صاحبزادے اور متعدد صاحبزادیاں ہوئیں۔ لڑکوں میں سب سے بڑے مولینا مناظر احسن، صاحب مکاتیب ہیں۔ دوسرے مولوی مکارم احسن صاحب جو اس وقت اپنے وطن گیلانی ہی میں مقیم ہیں۔ تیسرے مسٹر مظہر احسن جو اس وقت حیدرآباد کے ایک کالج میں معاشیات کے استاد ہیں۔

حافظ صاحب کی ایک صاحبزادی خان بہادر مولینا عبدالعزیز صاحب مرحوم مقیم

(باقی صہ ۹۳ پر)

(بقیہ حاشیہ صہ ۹۲) صاحب گنج سے منسوب ہوئیں۔ دوسری مولوی مظاہر حسن صاحب پیشکار، کمشنری کول، ضلع مونگیر سے اور تیسری راقم الحروف کے برادر بزرگ حضرت مولینا سید لطف اللہ صاحب علیہ الرحمہ سے۔

حافظ ابوالخیر صاحب بڑے سادہ لوگوں میں سے تھے۔ گاؤں والوں کی سی زندگی گذارتے تھے۔ کبوتروں سے بڑا شوق تھا۔ گیلانی میں اپنی مردانہ بیٹھک کے سامنے کبوتر خانہ بنوا رکھا تھا۔ اس عاجز کے ساتھ بڑی محبت سے پیش آتے۔ ایک مرتبہ بڑے اصرار سے گیلانی لے گئے۔ وہ زمانہ راقم کے بچپنے کا تھا۔ بڑی شفقت سے پیش آئے، کبوتر دکھلاتے بھی تھے اور کھلاتے بھی۔

سنہ ۱۹۲۹ء میں راہی ملک بقا ہوئے۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

مکاتیب بنام

مولوی محمد یعقوب صاحب ڈپٹی کلکٹر

مولوی محمد یعقوب صاحب کا وطن گیلانی ہے۔ غریب گھر میں پیدا ہوئے محض اپنی محنت اور کوشش سے تعلیم حاصل کی، بے سروسامانی سے پڑھا لیکن بی، اے کے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی، ڈپٹی مجسٹریٹ ہوئے۔ اور عہد برطانیہ میں مختلف مقامات پر انتظامی اور عدالتی کام کرتے رہے۔ مزاج میں دینداری شروع سے تھی۔ بھٹہ ضلع گیا میں شادی ہوئی اور وہیں بس گئے۔ رشتے میں فاضل گیلانی کے دادا تھے، اور مولانا سے بڑی محبت فرماتے تھے۔

۱۹۵۷ء میں راہی ملک بقا ہوئے۔

گیلانی (بہار)

۱۹ / مئی ۱۹۲۰ء

مخدوم و محترم! دامت عواطفکم العالیہ و عنایاتکم الغالیہ۔

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ،

جن بلند و برتر لفظوں میں آپ نے اس ناچیز کا اور اس کی ایک حقیر خدمت کا تذکرہ اپنے گرامی نامہ میں فرمایا ہے اس نے مجھے شرمندہ کر دیا۔ آپ نے مجھے چھپرہ آنے کی دعوت دی ہے۔ دعوت رد نہیں کی جاتی۔ اور پھر جس پیرایہ میں آپ نے بلایا ہے اس کے جواب میں بجز "لبیک" کے اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔

لیکن انسانی گردشوں اور زمانی مخمصوں کا کیا علاج ہے۔ ایک تو ابتدا سے میں معذور تھا، بیمار تھا، پھر سرکاری امتحانات کے پرچے آئے ہوئے تھے، ان کے جانچنے میں مشغول کہ یکایک غیب سے ایک جلالی تجلّی ظاہر ہوئی، نذر میری بڑی لڑکی اچانک بیمار ہوئی۔ آپ کا گرامی نامہ اس کی بیماری کے دوران میں ملا۔ جواب دینے کی فکر میں تھا کہ یہ بیماری اس مرحومہ بچی کی آخری بیماری ثابت ہوئی اور پانچ سال کی عمر اس دنیا میں گذار کر اس دنیا میں پہنچ گئی جہاں اس کے ماں باپ سے زیادہ مہربان مالک موجود ہے اور یہاں بھی وہ اسی کے ساتھ تھی "انا للہ وانا الیہ راجعون"۔ یہ بچی صورت و سیرت میں کچھ ایسے امتیازات رکھتی تھی کہ باوجود اطلاقی تعلقات کے مجھے اس تعین سے خاص انس تھا۔ دوسرے مرحوم عم محترم کی پروردہ اور آغوش گرفتہ تھی۔ بہرحال اس کو ان کی یادگار

سمجھتا تھا لیکن خدا کی یاد کے سوا کسی دوسری یاد میں مبتلا ہونا ایک خاص مشرب میں شرک سے کچھ کم رتبہ نہیں ہے۔ انا نرث الارض ومن علیہا، کا مدعی اپنے دعویٰ میں سچا ہے۔ اور اسی کے قول کو سچ ہونا چاہئے۔ بہرحال میں اپنی خود غرضی سے کچھ ہی کیوں نہ کہوں لیکن واقعہ یہ ہے کہ گنہگار ہو کر مرنے سے یہ زیادہ مناسب ہے کہ انسان معصوم ہی روانہ ہو کیا پیغمبروں کے سوا یہ فضیلت کسی اور کو حاصل ہے؟ دنیا کی زندگی کچھ ایسی دلچسپ تو ثابت نہیں ہوئی کہ میں واقعی کسی دوسرے کے لئے برضا و رغبت اس زندگی میں زیادہ دیر تک ٹھہرنے کی آرزو کروں۔ پس جس کا ملک ہے جس کا "لہ ما فی السمٰوات والارض" ہے وہ جو کچھ چاہے کرے ہم تو تماشا دیکھتے ہیں۔ آنے جانے والے نئی نئی شانوں کے ساتھ آرہے ہیں جارہے ہیں اور کسی قافلہ کے ساتھ میں بھی تماشا بن جاؤں گا۔ میرے آنے کا تماشا ہو چکا ہے اب جانے کا تماشا باقی ہے۔ بہرحال دل بھرا ہوا تھا اس لئے چند الفاظ بیساختہ قلم سے نکل گئے۔

میں ابھی امتحانات کے پرچوں کے جانچنے میں منہمک ہوں ابھی دس پندرہ دن تک اس سے فرصت ملنی مشکل ہے اسکے بعد اگر فرصت ہوئی تو میں انشاء اللہ تعالیٰ اعظم گڈھ[1]

[1] جہانگیری دور میں ایک راجپوت راجہ آگرہ جاکر مسلمان ہوگیا۔ جہانگیر نے اس کی بڑی قدر و منزلت کی اور دولت خاں کے خطاب سے نوازا۔ اور ۲۴ پرگنوں کی ریاست بھی عطا کی جن میں زیادہ تر اعظم گڈھ میں واقع تھے۔ دولت خاں لاولد فوت ہوگئے وہ اپنے بعد اپنے ہندو بھتیجے ہربنس کو ریاست کا مالک بنا گئے تھے آگے چل کر اس خاندان کے نامور راجہ بکرماجیت نے اسلام قبول کیا

(باقی ص ۹۷ پر)

لکھنؤ وغیرہ جاتے ہوئے چھپرہ بھی ایک آگ دن کے لئے ہو لوں گا۔

لوگ وعظ کیوں سنتے ہیں۔ کیا موت سے بھی بڑا واعظ کوئی اس عالم میں ہے؟ اور اس کی پہونچ ہر گوشہ تک ہے۔

فقر و علم کے شیدائی، مولوی صالح حسین صاحب کی ذات سعادت ازلی سے حظ یافتہ معلوم ہوتی ہے۔ ان کی تحریر جو اس خاکسار کی کتاب کے متعلق ہے میں نے اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ البتہ اس کا وہ حصہ جس میں انھوں نے میرا تذکرہ فرمایا ہے اس میں ان کو مغالطہ ہوا ہے۔ دیکھ لینے کے بعد ان کو معلوم ہو جائے گا کہ میرا "شنیدہ" "دیدہ" سے بہتر تھا میرا نیاز مندانہ سلام ان کی خدمت میں پہونچا دیجئے۔ اور آپ نیز مولوی صالح حسین صاحب سے صرف ایک آرزو ہے کہ میرے انشراح صدر اور خاتمہ بالخیر کی آپ لوگ دعا فرمائیں

"اللھم ارنا الحق حقا والباطل باطلا" ستارے، چاند، سورج، نباتات و جمادات، حیوان و انسان سب میں حق حق ہو کر اور باطل باطل ہو کر نظر آئے۔ علم کی تصحیح کا دوسرا نام ایمان ہے۔ عمل علم سے پیدا ہوتا ہے۔ درخت پانی سے بڑھتا ہے عمل علم سے اگتا ہے۔ غلط علم غلط عمل کو پیدا کرتا ہے، پہلے علم کی تصحیح ہونی چاہئے۔ یہی اصل راہ ہے

(بقیہ حاشیہ ص ۹۶) اس کے دو بیٹے پیدا ہوئے۔ اعظم خاں اور عظمت خاں۔ اعظم خاں نے ۱۶۶۵ء میں اعظم گڈھ کی بنیاد ڈالی اور عظمت خاں نے عظمت گڈھ کی جو اب تک اسی نام سے اسی ضلع میں آباد ہے۔

یہ ضلع اپنے مردم خیز قصبات اور نامور علماء و فضلاء کی وجہ سے مشہور ہے۔

"امنوا" کے مقام کی شرح ہوئے تو "عملوا الصلحت" خود انسان کو لپٹ جاتا ہے میرا ایک
رسالہ "کائنات روحانی" دیوبند میں ملتا ہے۔ مولوی صالح حسین صاحب اس رسالہ کو ضرور
پڑھیں۔ آپ کی راہ میں میں نے اُنس کو پایا۔ واللہ یہدی من یشاء الی الصراط المستقیم

نیاز مند

مناظر احسن گیلانی

۱۱ر شوال ۱۳۴۸ھ، ۱۳ مارچ ۱۹۳۰ء

حیدرآباد دکن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ، والصلوۃ والسلام علی النبی الکریم

حضرت قبلہ جناب دادا صاحب! مدظلہ العالی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

"درر الجواہر" کتابوں کا پیکٹ مع دستی رقعہ کے کیا ملا میری آرزو ملی، تمنا ملی، میں نے جو چاہا تھا، آسمان میں اس کا حکم ہوا، زمین پر پورا ہوا۔ وجہ کچھ بھی ہو لیکن گیلانی کو اسلام کے غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کوئی نسبت ضرور ہے۔ مگر گیلانی والوں کو حضرت سے بے تعلق پاکر دل ملامت کرتا تھا، پوچھتا تھا کہ آخر یہ کون لوگ ہیں، اس گاؤں میں کہاں سے کیوں آئے ہیں آپ اسکو اختراعی یا وقتی خیال تصور نہ فرمائیں کہ بار بار جی چاہا کہ گیلانی میں ایک مطبع قائم ہو اور اس کو اس کے لئے مخصوص کر دیا جائے کہ جب تک بن پڑے حضرت سیدی شیخ جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی تالیفات قیمہ، مواعظ بلیغہ اور حالات عالیہ اس کے ذریعہ سے

اُردو زبان میں شائع کئے جائیں۔ میرے پاس حضرت کی کتابیں ہیں، مواعظ ہیں۔ آپ کے حالات کے متعلق ایک ذخیرہ ہے۔ میں جن دنوں بائیبل کی ان کتابوں کو پڑھتا تھا جن میں انبیاء بنی اسرائیل کے خطبات اور مقالات ہیں تو دل پر خاص اثر ہوتا تھا۔ قرآن حدیث تو بڑی چیز تھی ان کے سوا دل ڈھونڈھتا تھا کہ ہمارے یہاں بھی کیا ایسی چیزیں مل سکتی ہیں؟ خدا نے جب حضرت غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ کی کتابوں کے مطالعہ کا موقع نصیب کیا تو اچھل پڑا۔ اور اس کے بعد سلسلۂ صوفیا کے مکتوبات ومقالات ملفوظات سب کو میں نے بنی اسرائیل کی ان کتابوں کا قائم مقام خیال کیا۔ البتہ ترجمہ کرنے میں خاص سلیقہ کی ضرورت محسوس ہوتی تھی سوچتا تھا کہ جس طرح بن پڑے گا، ہو سکتا ہے کہ اس کام کو حق سبحانہٗ تعالیٰ اس ذرۂ حقیر سے انجام دلائے، جو عرب، عراق نہیں مصر و شام نہیں، کفرستان ہند کے ایک دور افتادہ صوبہ کفر بہار کے ایک کوردہ گاؤں کا رہنے والا ہے۔ اور اس کو بڑی نعمت شمار کرتا تھا کہ کفر کی اسی تاریکی میں کم از کم لفظی طور پر ایک ایسا نام تو ملا ہے جو آسمان اسلام کا ایک "نیر درخشاں" ہے۔ میرا اشارہ گیلانی کی طرف تھا۔ اور اس لئے میں نے اس لفظ میں تھوڑی سی ترمیم کرکے اپنے نام کے ساتھ گیلانی کی نسبت قائم کرلی۔ ؎

بلبل ہمیں کہ قافیۂ گل شود بس است

لیکن "وما توفیقی الا باللہ" اتنے عظیم کام کے لئے ہر بوالہوس کا انتخاب نہیں ہوتا ہے الجھا دیا گیا حیدرآباد کی نقرئی زنجیر میں قید کیا گیا، قید ہوں، کچھ بن نہ آیا۔ اور اب تو

زندگی کی آخری گھڑیاں گذر رہی ہیں۔ جوش شباب، عزم وعمل کا وقت گذر گیا۔ خیالات افسانے بن کر رہ گئے۔ اس یاس وناکامی میں اللہ اللہ حق کردگار کا شکریہ کن لفظوں میں، کن جذبات کے ساتھ ادا کروں کہ مرنے سے پیشتر "محمد یعقوب گیلانی" کے مطبوعہ دستخط سے میں نے اس کتاب کو دیکھ لیا۔ جو سیدی الامام غوث الانام گیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حالات طیبہ سے آراستہ کی گئی ہے، سنا تھا ع

اگر پدر نتواند پسر تمام کند

لیکن دیکھا کہ "اگر پسر نتواند پدر تمام کند" فهنيئاً لكم يا جدي ثم هنيئاً لكم طوبیٰ لکم وحسن مآب، سچ ہے۔ ع

طعمۂ ہر مرغکے انجیر نیست

آپ نے جس آستانہ سے اخلاص وعقیدت کا رشتہ قائم کیا تھا، مبارک ہو کہ آپ کی عقیدت کام آئی۔ گیلانی کے مطلع سے اس صبح کے تباشیر کو ان آنکھوں نے دیکھ لیا جس کا خیال صرف دل کے گوشہ میں گھٹ گھٹ کر رہ جاتا تھا۔ اللہ اس کتاب کو آپ کی دینی ودنیوی فلاح کا ذریعہ بنائے۔ اور اس کی توفیق مرحمت فرمائے کہ ثقلین کے غوث نے توحید کے جس مقام بلند پر آشیانہ قائم کیا تھا اسی راہ پر آپ بھی زندگی کے سعید دنوں کو گذاریں "فتوح الغیب"[2] منظر سے گذری ہوگی اس کا فارسی ترجمہ شیخ عبد[3] الحق محدث دہلوی کا

[1] یعنی درر الجواہر۔ [2] حضرت غوث الاعظم شیخ عبد القادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مشہور ومعروف کتاب ہے جو چھوٹے بڑے اسی مقالات پر مشتمل ہے کتاب کیا ہے اسلامی تعلیمات کا

(باقی صفحہ ۱۰۱ پر)

شائع بھی ہو چکا ہے۔ صحیح قادریت وہی ہے، ایک زمانہ میں تو تقریباً اس کتاب کی تلاوت کرتا تھا۔ سفر وحضر میں ساتھ رکھتا تھا۔ بہتر ہوگا کہ اس کتاب کے ساتھ ساتھ لوگوں کو اس کی بھی ہدایت کیجئے کہ وہ حضرت کی راہ چھوڑ کر خود اپنی بنائی ہوئی راہوں پر نہ چلیں یا کم سے کم

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۰۰) عطر، اور اخلاقِ محمدی کا خلاصہ ہے۔ کتاب کے جامع حضرت غوث الاعظم کے صاحبزادے الشیخ الامام شرف الدین ابو محمد علیہ الرحمہ ہیں۔ حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے فتوح الغیب کی شرح لکھی ہے، شرح کے دیباچے میں لکھا ہے اور صحیح لکھا ہے۔

"لاریب ایں کتابیست مجموعۂ معارف الٰہی وکاشف استار محبوبان بزم دوام آگاہی، ماخذ او کتاب ربانی، مستنبط او آیات فرقانی، سرمایۂ او احادیث نبویہ ومقال آتش مطابق الہامات جلیہ"۔ یہ شرح کتب خانہ رحمانیہ خانقاہ مونگیر میں موجود ہے۔

[3] شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ بماہ محرم ۹۵۸ھ مطابق ۱۵۵۱ء دہلی میں پیدا ہوئے، سنہ ولادت "شیخ اولیا" سے نکلتا ہے۔ علوم دینیہ کی تکمیل کے بعد مکہ معظمہ کا سفر کیا۔ وہاں دو سال مقیم رہ کر حضرت عبد الوہاب المتقی رحمۃ اللہ سے استفادہ کیا۔ حضرت شیخ موسیٰ قادری سے بیعت کی۔ اور انہیں کے مجاز ہوئے، علوم ظاہر وباطن کے جامع تھے، ہندوستان میں علم حدیث کی اشاعت آپ ہی کی جد وجہد سے ہوئی، شعر وشاعری سے بھی مناسبت تھی۔ اور حقی تخلص فرماتے تھے چھوٹی بڑی تصنیفات کی تعداد تقریباً ایک سو ہے مشکوٰۃ شریف کی شرح لمعات اور اشعۃ اللمعات، شرح سفر السعادہ، مدارج النبوۃ زاد المتقین، ماثبت بالسنہ، اخبار الاخیار وغیرہ، ان کی مشہور تصانیف ہیں۔ لمعات کا قلمی نسخہ

(باقی صفحہ ۱۰۲ پر)

حضرت کے خدا کو چھوڑ کر خود حضرت کو خدا بنانے کی سعی نہ کریں۔

ما کان لبشر ان یوتیہ اللہ الکتاب	کسی آدمی کے لئے یہ نہیں ہے کہ اسے اللہ کتاب یا قوت
والحکم والنبوۃ ثم یقول	فیصلہ یا نبوت دے۔ پھر وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کو
للناس کونوا عبادا لی من دون	چھوڑ کر میرے پجاری بن جاؤ۔ لیکن اللہ والے اس
اللہ ولکن کونوا ربانیین بما	علم میں بنو کہ کتاب سکھاتے ہو اور اسے پڑھاتے
کنتم تعلمون الکتاب وبما	ہو اور نہ خدا اس کا حکم دیتا ہے کہ دیوتاؤں اور
کنتم تدرسون ولا یامرکم ان	پیغمبروں کو اپنا رب بناؤ۔ کیا وہ تمہیں پھر کفر کا
تتخذوا الملائکۃ والنبیین اربابا	حکم دے گا۔ جب کہ تم خدا کے آگے جھک چکے
ایامرکم بالکفر بعد اذ انتم	ہو۔
مسلمون۔	

لیکن جو "ربنا اللہ" پر استقامت کرتا ہے تو اس کی مدد کے لئے ملائکہ بھی آتے ہیں جیسا کہ بدر میں آئے، اُحد میں آئے۔ قرآن میں ہے تتنزل علیہم الملائکۃ ان لا تخافوا ولا تحزنوا۔ اور ملائکہ ہی نہیں اللہ چاہے تو ان کی امداد کے لئے ان ارواح طیبہ کو بھیجے جن کا رتبہ ملائکہ سے بھی بلند ہے۔ پس خدا کے برگزیدوں سے نفع اٹھانا اسی پر موقوف ہے کہ آدمی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) خدا بخش خان لائبریری پٹنہ میں موجود ہے۔ سنہ ۵۲ھ مطابق ۱۹۴۲ء میں رحلت فرمائی۔ سنہ وفات "فخر العلماء" سے نکلتا ہے۔ قطب صاحب کے مقبرہ میں حوض شمسی کے کنارے آسودۂ خواب ہیں۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

اس خدا کو تھامے جن کے وہ برگزیدہ ہیں۔ وہابیوں نے امداد انبیاء واولیاء کا انکار کیا اور جاہل مسلمانوں نے خود انبیاء واولیاء کے ساتھ تقریباً وہ رویہ اختیار کیا کہ شبہ ہونے لگا کہ ان میں اور خدا میں آخر کوئی فرق بھی ہے یا نہیں۔ فاتحہ کا راز بھی یہی ہے کہ بزرگوں کو جب آدمی ثواب پہونچاتا ہے تو وہ اس کے بدلے میں فاتحہ کرنے والے کے لئے دعا کرتے ہیں۔ درود شریف میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے امتی دعا کرتا ہے۔ دعا قبول ہوتی ہے حضور اس کے جواب میں امتی کے لئے دعا فرماتے ہیں۔

ہنود کا یہ اعتراض مسلمانوں پر صحیح نہیں ہے کہ وہ بھی فاتحہ کی شکل میں غیر اللہ کے آگے چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ وسلام بھیجتے ہیں۔ گویا ان کی عبادت کرتے ہیں۔ حالانکہ فاتحہ ہو یا درود دونوں صورتوں میں دراصل بزرگوں، بلکہ خود خاتم النبیین صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق مسلمان اس کا اظہار اپنے خدا کے آگے کرتا ہے کہ اے اللہ یہ بھی تیری رحمت وجود وکرم وعنایت چاہتے ہیں، ان پر رحم فرما، اور ان کو ثواب عطا کر (خدا جانے میں نے کیا لکھدیا)

پروفیسر الیاس برنی[1] میرے ہم مشرب دوست ہیں۔ بڑے شوق سے انہوں نے

[1] پروفیسر الیاس برنی بلند شہر یوپی کے رہنے والے، علی گڈھ کے ممتاز فاضل، معاشیات میں ایم، اے کرنے کے بعد وہیں لکچرر ہوئے۔ ۱۹۱۷ء میں مترجم کی حیثیت سے عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد آگئے۔ کالج کھلنے پر بحیثیت استاد معاشیات کالج میں منتقل ہو کر آئے۔ اور شعبۂ معاشیات کے صدر ہوئے۔ پھر ناظم سررشتہ ترجمہ کی حیثیت سے پنشن پا کر حیدرآباد میں رہ پڑے (باقی ص۱۰۴ پر)

آپ کی کتاب الی۔ حضرت غوث اعظمؒ کے متعلق کچھ کام وہ بھی کر رہے ہیں۔ والسلام۔

نیازمند

مناظر احسن گیلانی

---

۲۸ راپریل ۱۹۴۲ء

سیدی وجدی جعلکم اللہ من الذین جاہدوا وصابروا وصبروا ان اللہ مع الصابرین

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

دلی کے رسالہ" ندائے حرم" میں اچانک یہ پڑھ کر تعجب ہوا کہ حرم محترم کے مدرسہ صولتیہ کے سالانہ جلسہ میں گیلانی کی ایک عظیم شخصیت شریک ہے۔ اس زمانہ میں سفر حج کے لئے آمادہ ہوجانا صرف حج ہی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ کوئی چیز ہے۔ خیال تھا کہ موسم گرما

(بقیہ صفحہ گذشتہ) " بلند شہر" کا پرانا نام برن ہے اسی مناسبت سے اپنے نام کے ساتھ برنی لکھتے تھے۔ خاک گور آخر وقت میں اپنے وطن بلند شہر لے آئی اور ۲۵ رجنوری ۱۹۵۹ء کو ۷۹ سال کی عمر میں راہی ملک بقا ہوئے۔ رحمۃ اللہ علیہ۔ مرحوم معاشیات کے مشہور فاضل تھے اقتصادیات پر مبسوط اور مفصل کتابیں اُردو میں لکھیں۔ اتنی ضخیم کتابیں اس موضوع پر اب تک اُردو میں نہیں لکھی گئیں۔ اپنے فن کے علاوہ اسلامیات پر بھی اچھی اور وسیع نظر تھی۔ قادیانی مذہب پر نئے انداز میں ایک ہزار صفحات پر مشتمل ایک کتاب لکھی جو قادیانی مذہب کا آئینہ اور اپنی مثال آپ ہے۔ اس کے علاوہ مختلف موضوع پر کتابیں لکھیں۔ تصانیف کی تعداد ۴۹ ہے۔

کی تعطیل میں انشاء اللہ سعادت قدم بوسی حاصل ہوگی۔ لیکن پٹنہ میں اچانک معلوم ہوا کہ قبول استغفار کے بعض آثار[1] آپ کے سامنے پیش آگئے۔ بخاری میں ہے کہ قرآن کی آیت "من یعمل سوءاً یجز بہ" (جو برائی کرے گا اس کا بدلہ دیا جائے گا) نازل ہوئی تو صحابہ پر یہ آیت سخت گراں گذری۔ آستانہ نبوت میں حاضر ہو کر عرض کیا گیا کہ جب ہر سوء اور برائی کا بدلہ ہی ملے گا تو خدا کا قانون مغفرت وعفو کیا ہوا۔ جواب میں سمجھایا گیا کہ جب حق تعالیٰ کسی بندے کی دعا واستغفار قبول فرماتے ہیں تو اعمال کی جو سزا آخرت میں ہونے والی ہوتی ہے وہ دنیاوی مصائب کی شکل میں بدل دی جاتی ہے حتیٰ کہ بخار غم والم، فکر و تردد، سب ہی کے ذریعہ سے تخفیف سزا کا یہ قانون اس دنیا میں ظاہر ہوتا ہے۔ پس مجازات ومکافات کا قانون بھی باقی رہا اور مغفرت بھی ہوجاتی ہے۔ صوفیائے کرام کا خیال ہے کہ خواب تک کے مصائب کا سبب بھی قانونِ تخفیف وتحویل ہوتا ہے۔ مبارک ہو آپ کو کہ آپ کی اُخروی گرفت نے تخفیف کی شکل اختیار کی۔ خود اس فقیر کے ساتھ بھی یہی واقعہ پیش آیا۔ سفر حج سے جس دن واپس ہوا اس کے دوسرے دن والد مرحوم گھوڑے سے گرے اور اسی میں وفات ہوئی [illegible] کا قیاس صحیح نہیں۔ لیکن پھر بھی جن کی زندگی ہم ایمان والوں کے لئے نمونہ ہے اس کو نمونہ کیوں نہ بنایا جائے بدر کی مہم سر ہوتی ہے لیکن جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم میدانِ بدر کی کامیابی سے واپس ہوتے ہیں تو مدینہ کے دروازہ پر ایک جنازہ ملتا ہے یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی

[1] مکتوب الیہ سفر حج سے واپسی پر بیمار ہوگئے تھے اسی کی طرف اشارہ ہے۔

کا جنازہ تھا حضرت عثمان ان ہی کی تیمارداری کی وجہ سے بدر میں شریک نہ ہو سکے تھے۔ یہ دنیا خیر و شر کے ان ہی آثار سے معمور ہے پوری زندگی پھول اور کانٹوں سے بھری ہوئی ہے مسافر کو سفر جاری رکھنا چاہئے اس وقت تک جب تک "الحمد للہ الذی اذھب عنا الحزن ان ربنا لغفور شکور" کا مقام سامنے نہ آجائے۔

بندہ زادہ محی[1] الدین سلمہ کی تاریخ رخصتی ۶ مئی مقرر ہے آپ کو بجائے عام کارڈ کے یہ عریضہ لکھ رہا ہوں۔ امیدوار ہوں کہ اس امیدوار کو بھی سرفراز فرمایا جائے گا۔ فقط

نیازمند

مناظر احسن گیلانی

یکم فروری ۱۹۴۴ء

جدی امجدی! مدظلہ العالی، وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

والا نامہ آج ہی باعثِ سرفرازی ہوا۔ آج ہی جواب اس لئے دے رہا ہوں کہ دماغ کسی دوسرے مسئلے کی طرف اگر متوجہ ہوا تو پھر متوجہ ہی ہو جاتا ہے۔ سب بھول بھکوس جاتا ہوں شکر ہے کہ ابھی حالت اسی نوبت پر ہے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ

---

[1] مولینا علیہ الرحمہ کے اکلوتے صاحبزادے۔ پٹنہ میں انگریزی تعلیم مکمل کرنے کے بعد پاکستان چلے گئے اس وقت پاکستان میں ہیں اور وہیں اچھے منصب پر فائز ہیں۔

آئندہ کیا ہونے والا ہے۔ جی تو یہی چاہتا ہے کہ یہی حال طاری ہو جائے ؎

ما آنچہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم
الا حدیث دوست کہ تکرار می کنیم

"حدیث دوست" سے بات آگے بڑھ کر کاش صرف دوست کی "محویت" میں ڈوب جاؤں ڈوبا دیا جاؤں ایک ہی تمنا اب باقی ہے۔ ورنہ ؎

وقتِ طلوع دیکھا وقتِ غروب دیکھا
اب وقت آخری ہے دنیا کو خوب دیکھا

مولوی عثمان صاحب کے متعلق جو دریافت فرمایا گیا ہے سو اُن کے متعلق مجھے جو کچھ معلوم ہو سکا وہ یہی ہے کہ میرے آنے سے پہلے وہ اورنگ آباد تشریف لے گئے۔ اور وطن سے اپنے بھائی اور اپنے چھوٹے سالے کو اورنگ آباد ہی کچھ تجارت وغیرہ کے لئے بلایا ہے اس سے زیادہ اب تک کچھ معلوم نہ ہو سکا مولوی عثمان صاحب حقیقت یہ ہے کہ اپنے جوار کے ایک سرمایہ ناز نوجوان ہیں۔ لیکن قوم کا عشق ان کو بالآخر قوم والے کے عشق تک کاش لے آتا۔ وہاں سے تو پھر آگے کی راہ صاف ہے۔ ورنہ ؎

لیڈری چاہو تو لفظ قوم ہے ہماں نواز
گپ نویسیوں کو اور اہل میز کو راضی کرد

کیا عرض کروں کوئی نہیں ملتا جس سے ؎

سینہ دارم شرحہ شرحہ از فراق
تا بگویم شرح درد اشتیاق

آپ کا حال جو کچھ میں نے سنا تھا، اور پھر جو دیکھا تو دل نے مولانا[1] کے

---

[1] مولانا روم علیہ الرحمہ۔

ان اشعار کو دہرایا ؎

موزہ بر بودی[1] و من در ہم شدم | تو غم بردی و من در غم شدم
شکرِ حق را کاں دعا مردود شد | من زیاں پنداشتم آں سود شد

سچ فرمایا ہے ؎

بس دعا ہا کاں زیان ست و ہلاک | وز کرم می نشنود یزدان پاک

مبارک ہو وہ دولت جو بہر حال اسی کا نتیجہ ہے ؎

پردہ ہائے دیدہ را داروئے صبر | ہم بسوزد، ہم بسازد، شرح صدر

مناظر احسن گیلانی

---

[1] قصہ نقل کیا ہے کہ موزہ میں سانپ تھا۔ چیل لے بھاگی۔ اوپر سے جب گرا دیا تو معلوم ہوا کہ اس میں سانپ تھا۔ "گیلانی"

مکاتیب بنام

مولانا عبد الباری صاحب ندوی

حضرت مولینا عبد الباری صاحب ندوی ۱۴ ذی الحجہ ۱۳۰۷ھ مطابق یکم اگست ۱۸۹۰ء بمقام کرسی ضلع بارہ بنکی پیدا ہوئے۔ اصلی وطن قصبہ امیٹھی ضلع لکھنؤ تھا۔ ابتدائی تعلیم اردو فارسی قصبہ ستر کھ ضلع بارہ بنکی میں حاصل کی۔ پھر ابتدائی عربی کی تعلیم اپنے والد مرحوم اور چچا حکیم امجد علی صاحب (تلمیذ حضرت مولینا عبد الحی صاحب رح فرنگی محلی) سے حاصل کی۔ درمیان میں نگرام ضلع لکھنؤ کے نامور بزرگ مولینا محمد ادریس صاحب رح، صاحب "تذکرۃ العلماء" کے پاس بھیجدیئے گئے۔ جب علامہ شبلی مرحوم ندوہ تشریف لائے تو ندوہ میں داخلہ لیا۔ غالباً ۱۳۱۹ھ میں،

ندوہ کے زمانہ تعلیم ہی میں "المقتطف" اور دوسرے عربی رسائل کے ذریعہ جدید علوم و افکار کے پڑھنے کا موقع ملا۔ خاص کر فلسفہ سے طبیعت کو زیادہ لگاؤ رہا۔ اسی وجہ سے ندوہ سے فراغت کے بعد انگریزی زبان کی طرف توجہ کی تاکہ جدید فلسفہ؛ اور یورپ کے افکار و خیالات سے براہ راست واقفیت حاصل ہو سکے۔

اگست ۱۹۱۴ء سے مارچ ۱۹۱۵ء تک گورنمنٹ ہائی اسکول سلطان پور میں

عربی کے استاد رہے۔ اکتوبر ۱۹۱۵ء میں دکن کالج پونہ (بمبئی یونیورسٹی) کے "استاد فارسی" کی حیثیت سے بحال ہوئے پھر گجرات کالج احمد آباد میں تبادلہ ہو گیا۔ مارچ ۱۹۲۰ء میں ملازمت سے علیحدہ ہو گئے۔

ستمبر ۱۹۲۲ء میں عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد میں بحال ہوئے اور مسلسل تیئیس سال تک جامعہ عثمانیہ کے شعبہ فلسفہ اور آخر میں شعبۂ دینیات کی بھی خدمت کی۔ جولائی ۱۹۴۵ء میں ریٹائر ہو گئے۔ زمانۂ قیام حیدر آباد میں مولینا گیلانی علیہ الرحمہ کے ہم پیالہ و ہم نوالہ رہے ۱۹۲۹ء میں بمعیت مولینا گیلانی سفر حج کیا۔ راقم الحروف بھی ہمرکاب تھا۔

مولینا نے حضرت شیخ الاسلام مولینا سید حسین احمد المدنی نور اللہ مرقدہٗ سے شرف بیعت حاصل کیا اور ان کی تربیت میں رہے اور عجز و بے نفسی میں حصہ وافر پایا۔ اپنے مرشد کی اجازت سے حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی علیہ الرحمہ کی طرف رجوع فرمایا اور خلافت سے سرفراز ہوئے۔

مولینا ہندوستان کی ان منفرد شخصیات میں سے ہیں جنہیں قدرت نے علم و عمل دونوں میں ممتاز مقام بخشا ہے مولینا فلسفہ جدیدہ اور اسلامیات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ اور طرز بیان بہت سلجھا ہوا اور موثر ہے۔ فلسفہ جدیدہ پر برکلے کی تصنیف Principal of human knowledge کا ترجمہ مبادی علم انسانی کے نام سے کیا ہے۔ نیز برکلے نامی ایک کتاب لکھی ہے جس میں اس کے افکار و تصورات کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے اور اس کے فلسفہ پر تنقید کی گئی ہے۔

ڈیوڈ ہیوم David hume کی کتاب Human under standing کا ترجمہ "فہم انسانی" کے نام سے کیا۔ اردو میں معاشیات کے موضوع پر ایک قیمتی کتاب "تجدید معاشیات" کے نام سے لکھی پھر حضرت مولینا تھانوی رح کے علوم اور تصوف میں ان کے نظریات و افکار اور تجدید و اصلاحات کو نئے ڈھنگ سے متعدد کتابوں کے ذریعہ پیش کیا۔ اس طرح حضرت تھانوی رح کے علوم و افکار سے استفادہ کو سہل اور عام بنا دیا، جو ایک بڑی خدمت ہے۔

شہر لکھنؤ میں ہارڈنگ روڈ پر مکان بنوایا جس کا نام مولینا گیلانی نے "شبستانِ قدم رسول" رکھا۔ مولینا عبد الباری صاحب اب وہیں مستقلاً سکونت پذیر ہیں اور اللہ کی بندگی اور اس کے دین کی خدمت میں مشغول۔ حق تعالیٰ صحت و عافیت کے ساتھ رکھے کہ ایسے حضرات کا وجود خدا کی مخلوق پر خدا کی رحمت ہے۔

---

۲۳ مئی ۱۹۲۸ء مطابق ۱۲ ذی الحجہ ۱۳۴۶ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

ولن یؤخر اللہ نفسا اذا جاء اجلہا (حق سبحانہٗ تعالیٰ) (سورہ منافقون)

مخدومی و مطاعی! دام مجدکم العالی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

انا للہ وانا الیہ راجعون، گھڑیاں گذر رہی ہیں، ہم سمجھتے ہیں کہ فلاں زیادہ دن تک ٹھہرا، حالانکہ جو بھی ٹھہرا اور جتنے دن تک ٹھہرا، گیا اس صورتِ سرمدی[1] کے بعد اس کو ٹھہرنا کہہ سکتے ہیں۔ قال کم لبثتم فی الارض عدد سنین، قالوا لبثنا یوما او بعض یوم فسئل العادین، قال ان لبثتم الا قلیلاً لو انکم کنتم تعلمون (مومنون)

انسان کا تخمینہ ایک دن یا دن کے کچھ حصے کا ہوگا۔ لیکن دن اور رات بنانے والے نے یومی تشخصات کو حذف کرکے صرف "ان لبثتم الا قلیلا" کے ذریعہ سے واقعہ کا اظہار کیا، بس جو آیا بہت کم دن کے لئے آیا، واقعہ یہی ہے، باقی قلیل علم والا جہول اپنے کو علّامہ اور قلیل لبث والا میت اپنے کو طویل العمر خیال کرے تو اس کا کون سا فعل حمق سے خالی ہے، میرے لئے تو آپ کے اس گرامی نامہ میں عجیب لطف تھا وہی شان "غمزۂ خاص بہ ہر گبر و مسلماں داری" کا سامنے آگیا، کہاں مدینہ،

۱؎ مکتوب الیہ نے کسی کی وفات کی اطلاع دی تھی، یہ مکتوب اسی کے جواب میں ہے۔ ۱۲ (ع)

کہاں گدیہ[1]، گدیہ کی ایک بیمار عورت، لیکن اللہ اکبر اس شان رحمۃ للعالمینی کا کچھ ٹھکانہ ہے۔ مولانا، النبی اولیٰ بالمومنین من انفسہم[2] (احزاب) کی تفسیر میں اولیٰ کے معنی اقرب ہی کے علمائے ثقات نے لئے ہیں۔ قرب جسمانی یا قرب مکانی و زمانی کے سوا ایک اور قرب ایمانی بھی ہے۔ برزخ میں اس قرب کا ظہور ماتقول فی ھذا الرجل (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ذریعہ سے ہوگا۔ درود کی کثرت کیجئے، خوب کیجئے، ان کے لئے دعا کیجئے، وہ آپ کے لئے کریں گے۔ اپنے والد صاحب کی خدمت میں سلام فرما دیجئے، اللہ تعالیٰ ان بیماروں کو اچھا کرے اور اسی سے التجا کی ضرورت ہے۔ استغفار و حوقلہ بہترین اعمال ہیں۔

مناظر احسن گیلانی

۱؎ گدیہ (ضلع بارہ بنکی) اس وقت مکتوب الیہ کا وطن مالوف تھا، مکتوب الیہ اس وقت اپنے والدین کے ہمراہ حج کا ارادہ کر رہے تھے جو مارچ ۱۹۲۹ء میں فاضل گیلانی علیہ الرحمہ کے ساتھ پورا ہوا۔ (ع) مکتوب الیہ کی والدہ محترمہ کو زیارتِ نبوی حاصل ہوئی تھی۔ بیمار عورت سے اشارہ اسی طرف ہے، ۱۲

۲؎ ترجمہ، نبی مومنین کے ساتھ خود ان کے نفس سے بھی زیادہ تعلق رکھتے ہیں۔ ۱۲

۱۰ ذی الحجہ مطابق ۱۸ جون ۱۹۲۶ء

حیدرآباد دکن

حبیب صمیم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

کتنے روز ہوئے میں نے لکھا تھا کہ گھر جارہا ہوں۔ غالباً انشاء اللہ نہیں لکھا تھا، یا لکھا ہو تو مشیت کا ظہور ہوا کہ اسٹیشن سے سامان واپس ہوا۔ ٹکٹ ٹرافک منیجر کے پاس بھیجا گیا۔ سمیع[1] احمد صاحب امید میں سکندرآباد تک چلے گئے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ٹکٹ بھی وقت پر واپس نہ ہو سکا، خیر آخر کٹ گئی۔ لیکن جس طرح کٹی کاٹنے والا جانتا ہے۔ اور وہ بھی دیکھ رہا تھا جو عزائم کو اس زور و شور کے ساتھ توڑنے پھوڑنے پر آمادہ ہے۔ آہ! میں کیا تھا، کیا ہوں، خیر اگر اتنی اہمیت اس مار دافق کو دے دی گئی تو وہ کیا کرے۔ بس اب مٹی تھامے حیدرآباد میں پروفیسر مولانا عبدالباری کے آستانے پر ایک پتھر پڑا ہوا ہے اللہ کے لئے اس کے لئے دعا فرمایئے، مولینا عبدالماجد[2] صاحب کا حال آپ نے پھر نہیں لکھا۔ ایک لفافہ

---

[2] مولانا عبدالماجد دریاآبادی کا وطن دریاآباد ضلع بارہ بنکی ہے۔ مارچ ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے اردو، فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ ۱۹۰۸ء میں سیتاپور سے میٹرک پاس کیا مطالعہ کتب اور مضمون نگاری کا شوق اسی زمانہ سے تھا، اور آپ کے مضامین روزنامہ اودھ لکھنؤ، وکیل امرتسر، پیسہ اخبار لاہور وغیرہ میں شائع ہوتے رہتے تھے۔ عربی کا مضمون ساتھ لے کر کیننگ کالج لکھنؤ سے ۱۹۱۲ء میں بی، اے کیا۔ فلسفہ اور انگریزی (باقی اگلے صفحہ پر)

[1] یہ مولانا گیلانی کے ہم وطن اور نظام کالج کے دفتر میں ملازم تھے اور دفتری کاموں میں بڑی مدد دیتے تھے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) زبان دانی سے خاص دلچسپی تھی۔ پڑھنے کے زمانہ میں کثرت مطالعہ کا یہ حال تھا کہ کالج کے مشہور استاد ڈاکٹر کیمرن نے آپ کے سرٹیفکٹ پر یہ بھی لکھا کہ "لائبریری سے جتنا فائدہ آپ نے اٹھایا کسی اور طالب علم نے نہیں اٹھایا"۔

مولینا شبلی نے جب سیرۃ النبی کی تالیف شروع کی تو انگریزی سے ترجمہ کا کام آپ کے سپرد تھا کچھ دنوں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڈھ میں بطور لٹریری اسسٹنٹ بھی کام کیا۔ پھر دو سال دارالترجمہ حیدرآباد دکن میں ترجمہ کے کام پر مامور رہے، اسی زمانہ میں آپ کی مشہور کتاب فلسفۂ جذبات شائع ہوئی، اور آپ کے مضامین اردو اور انگریزی کے رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ اسی دور میں آپ کی ایک انگریزی کتاب "سائیکالوجی آف لیڈرشپ" لندن کے ایک مشہور ناشر نے شائع کی۔ جدید علم منطق پر آپ کی ایک کتاب "منطق" عرصہ تک عثمانیہ یونیورسٹی میں داخل نصاب رہی۔ ۱۸-۱۹۱۷ء تک آپ پر فلسفیت اور عقلیت کا غلبہ رہا۔ اس کے بعد آپ کے افکار و خیالات میں انقلاب عظیم ہوا، پروردگار نے اپنی معرفت کے دروازے کھولے۔ حضرت شیخ الاسلام مولینا مدنی علیہ الرحمہ سے بیعت کی، اور تعلیم و تربیت کا تعلق حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ سے رکھا، اور "پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے" کے مصداق بنے۔ ۱۹۲۵ء سے مولینا دریاآبادی ہفتہ وار دینی اور اصلاحی پرچہ "سچ" نکال رہے ہیں اسی کا نام ان دنوں "صدق جدید" ہے، جس کا سب سے بڑا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور انھیں مغربیت سے محفوظ رکھنا ہے، مولینا اردو میں جدید طرز انشاء کے موجد ہیں جو نہایت سادہ اور موثر ہے۔ آپ نے اردو اور انگریزی میں کلام اللہ کا ترجمہ کیا اور (باقی اگلے صفحہ پر)

مرتب کر کے آج میں نے لکھا ہے، بس نہ پوچھئے کہ کیا کیا گذری، کیا گذر رہی ہے۔
اب بھی نہ سمجھوں تو کب سمجھوں گا[1]۔ فقط

مناظر احسن گیلانی

یکم / جولائی ۱۹۲۸ء

مطابق ۱۱ / محرم ۱۳۴۷ھ

ذرّہ نواز (متمر بالعافیۃ) السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

ہاں! اثاقلتم الی الارض (توبہ) گر دلنے لگا۔ اپنی حماقت پر اب اس قدر پچھتا رہا ہوں کہ بار بار قبر کا خیال آرہا ہے، کہ کہیں اسی قسم کی طفلانہ ہوسوں میں دل کو بہلا بہلا کر آخرت کی جانب سے جو گذر رہا ہوں وہاں بھی ندامت نہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) تفسیر بھی لکھی ہے، جو شائع ہو چکی ہے۔

اب تک مولینا کے قلم سے مختلف موضوع اور علوم و فنون پر چھوٹی بڑی تقریباً ۳۰ کتابیں نکل چکی ہیں جن میں ترجمے بھی شامل ہیں۔ الحمد للہ سلامت باکرامت ہیں۔ خدا صحت و عافیت کے ساتھ اپنے دین کی خدمت کا موقع دے آمین ۱۲۔

[1] کسی بالکل ناگہانی وجہ سے سفر رک گیا تھا لیکن مولینا کی ذہانت و ذکاوت کی طرح احساس بھی بہت بڑھا ہوا تھا اسی وجہ سے اتنا زیادہ محسوس فرمایا ۱۲۔

(ع)

اٹھانی پڑے، اور یاحسرتیٰ علیٰ ما فرطت فی جنب اللہ[1] (زمر)
ایسے وقت نہ کہنا پڑے۔ حیث لا ینفع الندم (الحدیث)
شدید غلطی کا اعتراف ہے، اور دنیا میں اجتہاد کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہابیوں کی طرح مجھے بھی خمیازہ بھگتنا پڑا، جو عدم تقلید کی وجہ سے ان کو بھگتنا پڑے گا، مولینا عبد الباری کی نہ سنکر احمق مناظر احسن کی جو سے گا وہ اسی طرح تلملائے گا، جیسا کہ اس وقت میں تلملا رہا ہوں۔

واتبع سبیل من اناب الی[2] (لقمان)

اللہ کو جو ڈھونڈھتے ہیں ان کو چاہیے کہ منیب الی اللہ کی پیروی کریں، اور جو وطن کو ڈھونڈتے ہیں ان کو چاہیے کہ منیب الی الوطن کا دامن تھامیں۔ نہ تھامنے کا نتیجہ دیکھ لیا، خوب دیکھا، بھر پایا، توبہ ہے، استغفار ہے، کچھ نہ ہوا۔ الآن کما کان یہ تو میری خبر ہے، مبارک آپ کو آپ کی پیش گوئی، اس طرح غلط نہ ہوئی جیسا کہ قادیان[3] کے پیش گو کی ہوتی رہتی تھی۔ لیکن میرے لئے تو اچھا نہ ہوا[4]، میں نے کرنال والے

[1] ترجمہ، افسوس میری اس کوتاہی پر جو میں نے حق تعالیٰ کی جناب میں کی۔ ۱۲۔ [2] ترجمہ اس شخص کی راہ پر چلنا جو میری طرف رجوع ہو ۱۲۔ [3] مرزا غلام احمد قادیانی مدعی نبوت مراد ہیں ۱۲۔ [4] مولینا کی سیمابی طبیعت اور اپنے لئے ان کی رفاقت کی سعادت حاصل کرنے کے لئے مکتوب الیہ کی خواہش اور کوشش یہی ہوتی تھی کہ تعطیل میں وطن کا سفر ساتھ ہو اور اکثر یہی ہوتا بھی تھا۔ اتفاقاً اس کے خلاف ہوتا، اور مولینا کو کوئی پریشانی پیش آجاتی تو بہت پچھتاتے ۱۲ (ع)

معاملہ میں سب کچھ کہہ دیا، اب تو آپ آہی رہے ہیں۔ خواہ مخواہ کاغذ سیاہ کرنے سے نفع، کیا آم بھی ساتھ لائیے گا۔ ماجد میاں صاحب کا آپ نے کچھ حال نہیں لکھا ہے میں نے خط لکھا تھا، اپنے مجرم کو مخاطب بنانا بھی مناسب نہیں خیال فرماتے اپنے والد صاحب سے سلام فرما دیجئے۔

شروانی[1] صاحب کا معاملہ حد سے گذر گیا، اب وہ خود اور میں بھی

ومن کان یظن ان لن ینصرہ اللہ فی الدنیا والاخرۃ فلیمدد بسبب الی السماء ثم لیقطع فلینظر ھل یذھبن کیدہ ما یغیظ[2] (حج)

.... (اس جگہ خط میں کیڑوں نے ایسا کھایا ہے کہ بالکل پڑھا نہ گیا)

ہاں ایک شغل جدید شروع کیا ہے آکر دیکھئے گا۔

مناظر احسن گیلانی

---

[1] نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی رحمۃ اللہ علیہ رئیس بھیکم پور علی گڑھ شعبان ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء میں پیدا ہوئے۔ میٹرک تک انگریزی پڑھی، عربی کی تعلیم وقت کے مشہور صاحب درس حضرت مولینا لطف اللہ صاحب علی گڈھی سے حاصل کی۔ شیخ حسین یمنی مقیم بھوپال سے حدیث کی سند لی۔ حضرت مولینا شاہ فضل رحمٰن گنج مراد آبادی سے بیعت کی۔ علم و عمل کے جامع اور قدیم تہذیب و اخلاق اور وضعداری کے کامل نمونہ تھے۔ شعر و سخن سے بھی ذوق تھا۔ حسرت تخلص فرماتے تھے۔ ندوہ کی تحریک میں حضرت مولینا مونگیری رحمۃ اللہ علیہ کے شریک و مشیر رہے، بہت سے مضامین اور متعدد کتابیں لکھیں۔ علمائے سلف، نابینا علماء اور سیرت الصدیق نے سند قبول حاصل کی (باقی اگلے صفحہ پر)

گیلانی

۱۹ر مئی سنہ ۱۹۳۱ء مطابق یکم محرم سنہ ۱۳۵۰ھ

مخدومی و محترمی! زادکم اللہ سعادۃ وحنانا

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ بڑے انتظار کے بعد ملا، اور یہ پہلا احسان نہیں ہے جو ندوہ کے فلسفی درویش کی طرف سے دیوبند کے ایک شقی ملا پر ظاہر ہوا۔ فجزاکم اللہ خیر الجزا۔

آپ سے کیا عرض کر سکتا ہوں، وہاں مدینہ کی خوشبو کیوں نہ آئے گی جہاں حضرت[1] مدینہ کے عشق صادق کا مجسمہ جیتا جاگتا نگاہوں کے سامنے آتا ہے۔ آپ خوش بخت ہیں نفع اٹھائیے، صحبت اولیاء کو غنیمت شمار فرمائیے۔ خاکسار کے لئے تو گیلانی کا خلوت کدہ ہی لکھا گیا ہے۔

ادھر کچھ اچھا ہوا تھا، مونگیر[2] گیا، تاریکی اور سیاہی تھی۔ ان مباحث میں جن میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) تیرہ برس حیدرآباد میں صدر الصدور امور مذہبی رہے، اپنے نام پر ایک گاؤں حبیب گنج بسایا اور وہاں ایک نہایت قیمتی کتب خانہ قائم کیا۔ اگست سنہ ۱۹۵۰ء میں رحلت فرمائی۔

[2] جو شخص یہ گمان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ رسول کی دنیا اور آخرت میں مدد نہ کرے گا اس کو چاہئے کہ ایک رسی آسمان تک تان لے۔ پھر وحی کو بند کرا دے، پھر دیکھے کہ اس کی تدبیر اس کی ناگواری کو دور کر سکتی ہے۔

[1] یعنی حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رح۔ مکتوب الیہ اس وقت تھانہ بھون میں مقیم تھا۔ [2] مونگیر ہندوستان کا ایک قدیم اور تاریخی شہر ہے اس شہر کے (باقی اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) تین طرف دریائے گنگا بہتا ہے۔ اور ایک طرف خوبصورت پہاڑیوں کا سلسلہ ہے۔ اور آج بھی مونگیر سے بھاگل پور جانے والی ٹرینوں کو پہاڑی سرنگ سے گذرنا پڑتا ہے دریائے گنگا اور پہاڑی سلسلہ کے درمیان صرف چھ میل چوڑا ایک راستہ ہے جس سے مغرب کی طرف جایا جاسکتا ہے۔

مونگیر مسلم حکمرانوں کے زمانے میں ہمیشہ مرکزی مقام اور فوجی اہمیت رکھنے والا شہر رہا ہے۔ بارہویں صدی عیسوی بن بختیار خلجی کے دورِ حکومت میں اس شہر کو بڑی مرکزیت اور فوجی اہمیت حاصل تھی۔ شہنشاہ اکبر کے زمانہ میں سنہ ۱۵۹۰ء کے بعد سپہ سالار ٹوڈرمل نے مونگیر ہی کو اپنا ہیڈکوارٹر بنایا تھا۔

مسلمانوں کے زمانے کا قلعہ آج بھی اس شہر کی تاریخی اہمیت کو ظاہر کرنے کے لئے موجود ہے۔ میر قاسم کی انگریزوں سے جنگ اسی شہر میں ہوئی۔ آج بھی وہ پُل موجود ہے جسے میر قاسم کی فوج نے پسپائی کے بعد انگریزوں کے حملے سے بچنے کے لئے توڑ دیا تھا۔ جسے مونگیر کے لوگ "ڈکرے کا پُل" کہتے ہیں۔

یہ خوش منظر اور فوجی اہمیت رکھنے والا شہر آب و ہوا کے لحاظ سے بھی صحت بخش مقام ہے معلوم ہوتا ہے کہ سطح زمین سے دس بیس فٹ نیچے مختلف جگہ گندھک کی کانیں ہیں جہاں سے چشمے اُبلتے ہیں۔ ان کا پانی تیز گرم اور معدے کے تمام امراض کے لئے نہایت مفید ہے اور جلدی امراض کے لئے تو اکسیر ہی ہے۔ یہاں کے صاحب دل بزرگوں میں حضرت پیر شاہ نافعؒ حضرت شاہ لوہانی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت شاہ سلیم شہید رحمۃ اللہ علیہ (باقی اگلے صفحہ پر)

ہندوستان کے شہر مبتلا ہیں۔ تین دن میں اس کدورت کا ازالہ ہوا۔ اب بحمد اللہ دل صاف ہے لیکن جسم پر نزلہ کا پھر حملہ ہوا تھا، آج اس میں بھی افاقہ ہے غالباً آپ کے ساتھ آپ کی والدہ محترمہ اور اہلیہ عالیہ بھی ہوں گی۔ سب کی خدمت میں سلام۔

آج کل ہمالیہ تراشی یعنی پرچوں کی جانچ میں مصروف ہوں۔ فقط والسلام

مناظر احسن گیلانی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اور حضرت مولٰینا سید شاہ محمد علی رحمۃ اللہ رحمۃ اللہ علیہ بڑے نامور اور باکمالوں میں گذرے ہیں۔ اور آج بھی ان کے مزارات زیارت گاہ خلائق ہیں۔

حضرت مولٰینا سید محمد علی کی خانقاہ جو خانقاہ رحمانیہ کے نام سے موسوم ہے۔ اسی شہر میں واقع ہے۔

مونگیر کو صوبہ بہار میں "لیڈروں کا شہر" (City of the Leaders) کہا جاتا ہے۔ صوبہ بہار میں جو ملکی اور قومی تحریکیں چلی ہیں اس کی رہنمائی اسی ضلع کے افراد نے انجام دی ہے۔ آج ہی نہیں ایک عرصہ سے صوبہ بہار کی کانگریس کو اسی ضلع کے افراد کی سرپرستی حاصل ہے مسٹر سری کرشن سنہا جو سنہ ۱۹۲۳ء میں بہار کونسل کے اندر سوراج پارٹی کے لیڈر رہے اور سنہ ۱۹۳۷ء سے جنوری سنہ ۱۹۶۲ء تک بہار کے چیف منسٹر رہے۔ اسی ضلع کے رہنے والے تھے۔

مونگیر لوہے کی اور خاص کر بندوق سازی کی صنعت کے لئے ایک عرصہ سے مشہور مقام ہے۔ مجاہد جلیل حضرت سید احمد شہیدؒ بھی مونگیر تشریف لائے اور یہاں سے اسلحہ خرید کر لے گئے۔ تاڑ جو بہار کی ایک مشہور اور خاص چیز ہے اس کی چھتری اور اس کے (باقی اگلے صفحہ پر)

گیلانی

۲۲ر دسمبر ۱۹۳۱ء مطابق ۱۰ر شعبان ۱۳۵۰ھ

اخونا فی اللہ و رفیقنا فی سبیل اللہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

۱۹ر دسمبر کو گیلانی پہونچ گیا تھا۔ آنار سی میں ۹ بجے گاڑی خالی ملی، الہ آباد دس بجے کے بعد پہونچا، خوب سیر کی۔ ڈاکٹر صدیقی[1] صاحب اور آپ کے مولوی علوی[2] صاحب سے ملاقاتیں بھی ہوئیں، دس بجے چوکی آکر محی الدین[3] صاحب کی رفاقت میں وطن روانہ ہوا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) پتوں سے مختلف قسم کے سامان مثلاً پنکھا اور ہیٹ (انگریزی ٹوپی Hat) وغیرہ بھی یہاں کی مشہور صنعت ہے۔ ریلوے کا سب سے بڑا ورکشاپ اور امپریل ٹوباکو کمپنی کا سب سے بڑا کارخانہ مونگیر ہی میں ہے۔ اور راقم الحروف کا وطن مالوف بھی یہی شہر ہے ۱۲

[1] ڈاکٹر عبدالستار صدیقی ایم اے، پی، ایچ، ڈی سابق پرنسپل عثمانیہ یونیورسٹی کالج، اب الہ آباد یونیورسٹی میں عربی کے استاد تھے ۱ (ع) [2] مولوی ضیاء الحسن ندوی علوی کاکوروی مرحوم انسپکٹر مدارس عربیہ یو، پی۔ (ع) [3] الحاج مولوی سید محی الدین صاحب کا وطن استھانواں ضلع پٹنہ ہے۔ مولینا سید عبدالغنی وارثی صاحب نعمت عظمیٰ کے بڑے صاحبزادے ہیں۔ ۱۹۰۸ء میں علی گڈہ سے بی اے کیا۔ ولایت جاکر بیرسٹری پاس کی اور واپس آکر پٹنہ ہائی کورٹ میں پریکٹس کرنے لگے۔ پھر حیدرآباد گئے اور مددگار ناظم تعلیمات مقرر کئے گئے۔ آخر میں اسٹیٹ کے ناظم تعلیمات مقرر کئے گئے اور اسی منصب سے وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔ دینی اور تعلیمی ذوق بچپن سے تھا۔ تین دفعہ زیارت حرمین اور مقامات مقدسہ سے مشرف ہوئے۔ متعدد بار حکومت حیدرآباد کے (باقی اگلے صفحہ پر)

جن احتیاطوں کے ساتھ اب کی سفر کر رہا تھا، خیال تھا کہ دورہ نہ پڑے گا۔ لیکن گیلانی پہونچ کر شدید تو نہیں تاہم خفیف آثار سے گلو خلاصی نہ ہوئی۔ چلنا پھرنا دشوار ہوگیا تھا، بیٹھے رہنے میں تکلیف نہیں ہوتی تھی۔ کل سے بحمد اللہ طبیعت بالکل صاف ہے۔ افیڈرین خدا کی تائید ہے جس سے مدد ملتی رہی۔ معلوم نہیں کہ آپ کا کیا حال[1] ہوا۔ اب آج کل پرچوں کا ہمالیہ کاٹ رہا ہوں۔

اس دفعہ حیدرآباد سے میری روانگی ایک شدید باطنی کش مکش کے ساتھ ہوئی تھی جس کا اظہار نہ کسی سے کر سکتا تھا، نہ اب کر سکتا ہوں۔ اسی انقباض کا نتیجہ تھا کہ

(بقیہ صفحہ گذشتہ) نمائندہ کی حیثیت سے دارالعلوم دیوبند گئے۔ پہلے حیدرآباد ہی میں ایک بزرگ مولانا حبیب عیدروس سے بیعت حاصل کی۔ پھر شاہ مطلوب الرحمن برادر بزرگ حضرت مولینا شبیر احمد عثمانی سے منسلک ہوگئے۔ اب کراچی میں مقیم ہیں۔ ایک مسجد اور مدرسہ کی بنیاد ڈالی ہے اللہ کی یاد اور بچوں کی مذہبی تعلیم آخری زندگی کا مشغلہ ہے، بڑی خوبیوں کے آدمی ہیں اور ان چند اشخاص میں ہیں جنھیں فاضل گیلانی کے ساتھ خصوصی تعلق تھا

[1] حیدرآباد کے بیشتر زمانہ قیام میں مکتوب نگار و مکتوب الیہ کو صرف ہم قیامی و ہم طعامی ہی حاصل نہیں رہی۔ دمہ کے مرض میں "ہمدمی" بھی رہی۔ فاضل گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کو گرمیوں میں دورے پڑتے۔ اور مکتوب الیہ کو جاڑوں میں، افیڈرین سے بہت نفع ہوتا تھا۔

(عبدالباری ندوی)

چلتی ریل میں حاجی معین الدین[1] صاحب کان پوری کے نام عریضہ لکھا۔ ان کا جواب برسوں ملا جس سے بحمد اللہ اب طبیعت کو سکون ہے، اب اس قابل ہوا ہوں کہ انفس کی بجائے آفاق پر بھی نظر ڈالوں، سب سے پہلے آپ یاد آئے، عریضہ لکھ رہا ہوں۔ کچھ معلوم نہیں کہ ہمارے بھائی صاحب[2] نے ہمارے بعد کیا طرزِ عمل اختیار کیا۔ اورنگ آباد گئے یا نہیں۔ اچھو[3] سلمہ نے بھی کچھ نہیں لکھا، اس کی فکر سب سے زیادہ ہے۔ مجھ بدبخت کی وجہ سے آپ کو بھی ایک آزمائش میں مبتلا ہونا پڑا ہے۔ اللہ رحم کرنے والا ہے۔ خدا کرے کہ اس کو کسی عمل خیر کی توفیق ہوئی ہو۔

---

[1] یہ حاجی صاحب کان پور کے رہنے والے تھے پہلے غالباً اسسٹنٹ انجینیر تھے پھر تصوف کے رنگ میں دنیا سے دین کی طرف چلے، ایک مرتبہ دکن سے وطن آتے ہوئے مکتوب الیہ ان سے ملنے کے لئے کان پور اترے اور چند گھنٹے انھیں کے پاس ٹھہرے۔ حضرت مولانا عبد الباری کو ان کی درویشانہ اور مسکینی زندگی نے کافی متاثر کیا۔ پھر جب مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کا قیام حیدرآباد رڈہل کے بنگلہ میں تھا تو اسی زمانہ میں رڈہل ہی کی مسجد سے قریب حاجی صاحب بھی اپنے ایک عزیز کے ہاں مقیم تھے، ملنا جلنا زیادہ ہو گیا تھا اور حضرت گیلانی سے تعلقات بہت اچھے ہو گئے تھے۔ ۱۲

[2] یہ مولانا گیلانی کے رشتہ کے بھائی تھے۔ جو فکر معاش میں آپڑے تھے اور مولانا کے لئے ان کا طرزِ عمل کچھ پسندیدہ نہ تھا۔ (ع)

[3] حضرت مولانا عبد الباری صاحب ندوی کے چھوٹے بھائی محمد شعیب صاحب کا عرف "اچھو" تھا۔

اپنے اس انقباض کا کیا حال لکھوں، جس کا ذکر اوپر آیا۔ بھلا اتنی خبر تو آپ کو بھی دے سکتا ہوں کہ اس دفعہ رمضان میں یہ عزم صمیم تھا کہ اطلاق سے ہٹ کر پھر کسی تقییدی شکل کے اشغال میں اپنے کو داخل کروں۔ حضرت مولانا محمد حسین[1] صاحب کی ممانعت کے باوجود دل نے یہی فیصلہ کیا تھا۔ آنے سے تین چار دن پیشتر ایسے شدید باطنی شکنجے میں کسا گیا کہ بلا مبالغہ عرض کر سکتا ہوں کہ زندگی میں یہ تلخی اس سے پہلے کبھی نہیں چکھی تھی۔ "گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل" خدا جانے یہ کیسے ممکن ہوا کہ اس حال کی خبر خلاف عادت

---

[1] حضرت مولانا محمد حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ حیدرآباد کے ایک بڑے صاحبِ "حال وقال" (سماعی حال وقال مراد نہیں) بزرگ تھے۔ "دوام حضور" کا حال مقام بن گیا تھا۔ حیدرآباد میں گمراہ کن "وجودیت" کا بہت دور دورہ رہا تھا، لیکن حضرت ممدوح کو جس سلسلے سے تعلق تھا اس نے اس کی ایک خاص تعبیر و تعلیم اختیار کر کے گمراہیوں کی بڑی اصلاح کر دی تھی۔ اسی کی تعبیر و تعلیم حضرت کا دن رات کا "قال" ہی نہیں حال تھا، اسی کی دوسروں کو تفہیم و تلقین فرماتے رہتے۔ اور طریق صوفیا کی عام اذکاری و اشغالی تعلیمات کو اس "اطلاقی طریقہ" کے مقابلہ میں "اشغالی عقیدہ" فرماتے۔ اور اہل علم کے لئے خصوصاً پسند نہ فرماتے۔ دراصل یہ حضرت شیخ ابن عربی کے خاص فلسفیانہ تصوف و توحید کا مسلک تھا۔ اور حضرت گیلانی کو حضرت شیخ سے اتنی خلقی و فطری مناسبت تھی کہ حضرت مولانا عبد الباری صاحب ندوی تو انھیں وقت کا ابن عربی ہی کہا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ تحریری رنگ میں بھی مولانا ندوی کو "فتوحات" کی جھلک دکھائی دیتی۔ ۱۲

مولینا محمد حسین صاحب کو کردی۔ اور ریل میں جب انقباض بہت بڑھا تو حاجی صاحب کو بھی لکھا۔ حضرت کا تو کوئی خط نہیں آیا ہے لیکن حاجی صاحب کے خط سے بہت کچھ تشفی ہو گئی۔ میرا عزم تقلید ٹوٹ گیا۔ اب میرے لئے اطلاق کے سوا کوئی صورت زندگی کی نہیں ہے۔ غلط ہو یا صحیح قرآن پاک کے سوا اب اجازت نہیں پاتا کہ کسی اور طرف دیکھوں۔ ان اشغال کے فوائد کا منکر نہیں ہوں، لیکن غالباً اس طرز کا آدمی ہونا میرے لئے مقدر نہیں۔ ایک بڑھیا کے ایمانِ ساذج پر قناعت کرنا پڑے گا، شوق کرامات و آیات، کشف و اشراقات سے دست بردار ہوتا ہوں۔ ایک نیک غرض ہی کے لئے ان کا شوق تھا لیکن جب متعدی[1] ایمان کی تلاش میں لازمی ایمان کی حلاوت بھی ہاتھ سے

---

[1] فاضل گیلانی کی زبان وقلم نے "متعدی ایمان" یا "تقویۃ ایمان" کا نفع تو اللہ تعالیٰ نے بے شمار مسلمانوں خصوصاً جدید ذہنیت والوں کو پہونچایا ہوگا۔ البتہ عملی نفع کے باب میں ایک بار بڑی حسرت سے فرمایا کہ حیدرآباد کا شاید ہی کوئی محلہ وکوچہ بچا ہو جو میری تقریروں سے نہ گونجا ہو۔ مگر ایک بے نمازی بھی میرے علم میں ان سے نمازی نہیں بنا۔ رات دن ساتھ رہنے والوں کا کم وبیش یہی حال دیکھ کر فرماتے میں بالکل "عقیم" ہوں۔ بخلاف اس کے "بے زبان و قلم" سیکڑوں ہزاروں اہل اللہ (وہی اشغالی عقیدہ والوں) کے واسطہ سے اللہ تعالیٰ نے ہزاروں لاکھوں کو ایمان وعمل سب کی دولت بخشی۔ نماز، روزہ کیا اللہ جانتا ہے کہ کتنوں کو اسی راہ سے قرب وولایت کے بلند سے بلند مقامات تک پہنچایا۔

اپنی خداداد غیر معمولی "قوت" انشا پردازی وانشانگاری کے باوجود (باقی اگلے صفحہ پر)

جائے تو اس تلاش سے کنارہ کشی میں عافیت محسوس ہوتی ہے، اُف! کیسی سخت سوزش اور تلملاہٹ تھی جس میں ایک ہفتہ سرگرداں رہا۔ میری روشنی نے مجھ سے منہ چھپا لیا تھا، میری چٹان میرے پاؤں کے نیچے سے نکل گئی تھی۔ میرا العروۃ الوثقیٰ میرے ہاتھوں سے چھوٹ گیا تھا۔ "تاریکی اور اندھیریاں تھیں، جس میں میرے باطن کے لئے صرف گڑھنا تھا۔" اومن کان میتا فاحییناہ وجعلنا لہ نوراً یمشی بہ فی الناس کمن مثلہ فی الظلمت لیس بخارج منہا[1] (الانعام) مشبہ اور مشبہ بہ دونوں کو دیکھ لیا۔ اس تجربے کے بعد میری ساری جرأتوں کا خاتمہ ہو گیا، خدا جانے میں نے کیا لکھا۔ آپ کے اخلاص وصدق نے مجبور کیا کہ جو کچھ گذری اس کا اجمالی ماجرا عرض کر دوں وحسبی اللہ ونعم الوکیل۔

سید محی الدین صاحب سے ریل میں رفاقت کم نصیب ہوئی، وہ سیکنڈ میں تھے اور میں انٹر میں۔ دس بجے رات سے صبح تک ساتھ رہا۔ جو سونے کا وقت تھا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کبھی کبھی اس حقیقت کو مولینا مرحوم بڑی شدت سے محسوس فرماتے یہ رمضان مبارک غالباً اسی شدت کے بحرانی حال میں گذرا، مگر غالب بالآخر ذوق طبیعت ہی رہا۔ قل کل یعمل علی شاکلتہ فربکم اعلم بمن ھو اھدی سبیلا۔

[1] ترجمہ:۔ ایسا شخص جو مردہ تھا، ہم نے اس کو زندہ بنا دیا۔ اور ہم نے اس کو ایسا نور دے دیا۔ جس کے ذریعہ آدمیوں میں چلتا پھرتا ہے یہ اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے۔ جو اندھیرے میں ہو اور اس سے نکل ہی نہ پاتا ہو۔ ۱۲۔

اب انشاء اللہ اجتماع ہوگا۔ مکان کا بندوبست کر چکے ہوں گے، بحمد اللہ گیلانی[1] کا حال اچھا ہے۔ سب لوگ عافیت سے ہیں۔ برادرم مکارم[2] سلمہ آپ کو سلام عرض کرتے ہیں۔ رمضان کی رخصت کا مسئلہ اب میرے لئے نظری ہوگیا ہے۔ صرف تجارتی نقطۂ نظر سے اس کا فیصلہ کرنا پڑے گا۔ فقط والسلام

مناظر احسن گیلانی

[1] گیلانی ضلع پٹنہ کا مشہور گاؤں اور سادات کا مسکن ہے۔ سرکاری کاغذات میں "محی الدین پور گیلانی" لکھا جاتا ہے۔ ممکن ہے بزرگوں نے حضرت غوث الاعظم کے اسم گرامی سے برکت حاصل کرنے کے لئے یہ نام رکھا ہو۔ زمانہ قدیم سے گیلانی علم کا گہوارہ رہا ہے۔ یہی گاؤں فاضل گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا مولد و مدفن ہے۔ ۱۲۔

[2] علامہ گیلانی کے منجھلے بھائی اور کرتا دھرتا۔ مولینا پر اس قدر حاوی کہ شاید کوئی چھوٹا اپنے بڑے پر ہوگا جس طرح حضرت گیلانی نے اپنے آپ کو مولوی مکارم صاحب کے حوالہ کر دیا تھا، اس کی مثال تاریخ میں کم ملے گی۔ دونوں بھائیوں کے تعلقات بھی مولینا کی سوانح کا اہم حصہ ہیں جس سے مولانا کی سادہ دلی، بے نفسی اور دنیا سے بے تعلقی پوری طرح نمایاں ہوتی ہے۔ مولوی مکارم احسن صاحب نے اُردو فارسی کی تعلیم گھر پر حاصل کی پھر انگریزی میں لگ گئے، بی این کالج پٹنہ میں ایف اے تک پڑھا اور پھر زمینداری و کاشتکاری میں مشغول ہوگئے۔ آموں کے بڑے شائق اور باغبانی کے ماہر، ہندوستان کے کونے کونے سے آم منگوا کر متعدد باغ لگائے۔ بقول ڈاکٹر سید محمود صاحب ایم پی سابق وزیر تعلیم بہار، مکارم صاحب کی تصنیفات قلمی آموں کے باغات ہیں۔ ۱۲۔

۵ر جنوری ۱۹۳۲ء

مطابق ۲۵ر شعبان ۱۳۵۰ھ

رفیقی الشفیق عافاکم اللہ وشفاکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ابھی ابھی لفافہ گرامی سے سرفراز ہوا۔ سخت متردد ہوں کہ دمہ کے سوا اور کس مرض کو آپ نے محسوس کیا۔ دمہ کے دوروں کو دیکھتے دیکھتے تو اتنا عادی ہو چکا ہوں کہ اب اس کی فکر زیادہ ہوتی بھی نہیں۔ برادرم شعیب[1] سلمہ کو حکم دیجئے کہ واپسی ڈاک سے آپ کی خیریت سے مطلع فرمائیں۔ بحمد اللہ بُرے بھلے حالوں کے ساتھ صیام و قیام اس سال کا اب تک تو چل رہا ہے۔ آپ کے لئے میری تمام دعائیں ہیں اور ہر قسم کی دعائیں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب[2] مخدوم سے سلام فرما دیجئے۔ کیا ان کا یہ مشورہ ہے کہ میدانِ جہاد سے ہٹ کر امن کی آبادیوں میں قیام مسلم زندگی کے لئے بہتر ہے و بلوناھم بالحسنات والسیئات[3] (اعراف) یہ قانون انسان کے لئے ہے۔ انسان جہاں کہیں بھی رہے گا، اس کے لئے یہ ابتلاء ضروری ہے۔ انشاء اللہ یہ امتحان اسی وقت ختم ہوگا

[1] حضرت مولینا عبد الباری صاحب کے چھوٹے بھائی۔

[2] حکیم ڈاکٹر مولانا سید عبد العلی صاحب ۱۳۱۰ھ میں پیدا ہوئے۔ مولینا حکیم سید عبد الحی صاحب ناظم ندوۃ العلماء کے فرزند اکبر ہیں۔ ابتداءً علوم دینیہ عربی کی تعلیم دار العلوم ندوۃ العلماء کے اساتذہ مولینا سید علی زینبی، مولانا شیر علی صاحب حیدرآبادی رحمہما اللہ وغیرہ سے پائی۔ طب اپنے والد سے پڑھی۔ پھر دار العلوم دیوبند میں ایک سال قیام کر کے (باقی اگلے صفحہ پر)

جب کہ لوگ اعلان کریں گے کہ فلاں کی زندگی ختم ہو گئی ۔ حالانکہ حیاتِ حقیقی کا آغاز اسی وقت ہوگا ۔ والدہ صاحبہ کی خدمت میں سلام فرما دیجئے ۔

مناظر احسن گیلانی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی اور حضرت سید انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہما کے درس میں شریک ہو کر دار العلوم سے سندِ فراغ حاصل کی۔ پھر انگریزی کی طرف توجہ کی، اور بی۔ ایس۔ سی میں کیننگ کالج لکھنؤ (موجودہ لکھنؤ یونیورسٹی) میں فرسٹ آئے۔ حکیم محمد اجمل خاں صاحب سے استفادہ کے لئے دہلی گئے۔ اور اسی زمانہ میں ڈاکٹر انصاری صاحب مرحوم اور دوسرے بزرگوں کی صحبتیں اٹھائیں۔ لکھنؤ آکر میڈیکل کالج میں داخلہ لیا اور پانچ سال رہ کر طبِ جدید کی تکمیل کی۔ اس پورے دورِ تعلیم میں ان کی معاشرت اور وضع میں کوئی فرق نہیں آیا۔ پہلے ندوہ کے نائب ناظم رہے، پھر ناظم منتخب ہوئے۔ اور زندگی کی آخری سانس تک نظامت کے فرائض بحسن وخوبی انجام دیتے رہے۔ بیعت کا تعلق حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے تھا۔ مولانا گیلانی علیہ الرحمۃ کو ڈاکٹر صاحب سے خصوصی ربط تھا اور حذاقت وتشخیص کے ساتھ ان کی دعا پر بھی بڑا اعتماد تھا خطوط میں جابجا اس کی طرف اشارہ ہے۔

۲ اور ہم ان کو خوش حالیوں اور بدحالیوں سے آزماتے رہے ۔

۷؍ جنوری ۱۹۳۲ء

مطابق ۲۷؍ شعبان ۱۳۵۰ھ

مخدوم ومحترم مدمجدہ العالی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

دمہ ۔۔ دورہ ۔۔ اور اتنا سخت دورہ ۔۔ اس پر ٹائیفائڈ ۔۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کیا ہوا، کیوں ہوا۔ لاشفاء الا شفاءك ملفوظ نبی ہے۔ دعا کے سوا وہ کیا کر سکتا ہے جس کے ہاتھ میں صرف سوال ہے۔ معلوم نہیں اب آپ کس حال میں ہیں۔ اور حیدرآباد کب تشریف لے جائیے گا۔ رمضان کو دو دن باقی ہیں ابھی تک معلوم نہیں کہ یہ رمضان کہاں بسر ہوگا۔ آپ حیدرآباد پہونچ کر ضرور گرامی نامہ سے سرفراز فرمائیں۔ النصح لکل مسلم کے فریضے کو ادا کیجئے گا۔ میرے دل کا عجیب حال ہے ۔۔ قرآن کے سوا اور صحیح آثار کی روشنی کے سوا اور کہیں خنکی میسر نہیں ہوتی۔ کیا کروں معلوم نہیں دل کا آئندہ کیا حال ہوگا۔

برادرم مکارم سلمہٗ سلام عرض کرتے ہیں۔ گھر میں بھی سلام کہتی ہیں۔ محی الدین سلمہٗ اچھا ہے۔ حفظ کر رہا ہے۔ والسلام

مناظر احسن گیلانی

۱۴ر جون ۱۹۳۲ء

مطابق ۹ر صفر ۱۳۵۱ھ

سیدی الرغیبۃ فی الدنیا والآخرۃ — السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

منی آرڈر ٹیلیگرام کے انتظار میں تھا لیکن شیر کے منہ میں پتھر پھینکا گیا۔ کارڈ ہی سے ماتھا ٹھنکا، ہوش جا چکے تھے، تاہم اپنے کو سنبھالا اور اسی وقت ڈاک خانہ بلٹی کے لئے آدمی کو دوڑایا، وصیت کی کہ اگر مل جائے تو سیدھے موٹر لاری پر شیخپورہ پہونچ کر نازک بدنان لکھنو سے ملاقی ہو۔ کارروائی وقت پر ہوئی۔ لیکن جن عزیزیوں سے دو چار، دو چار مہینوں سے ہو رہا ہوں انھوں نے یہاں بھی ساتھ نہیں چھوڑا، یعنی ہمارے نمائندہ نے آپ کے ایک ٹوکرے کے ساتھ اور بھی آم کے پانچ ٹوکروں کو اپنا خیال کیا، اور موٹر و قلی کی مزدوری دے کر بجائے ایک کے چھ ٹوکریاں گیلانی شام کو پہونچیں۔ شام کو غیر کا مال اسٹیشن سے چھ کوس کے فاصلے پر میرے گھر آتا ہے، ابر گھرا ہوا ہے بارش بھی ہو رہی ہے۔ بجائے لکھنوی ٹوکری کے ساری توجہ ان اجنبی ٹوکریوں کی طرف مبذول ہو گئی۔ الغرض اسی وقت ایک دوسرے آدمی کے ساتھ ان قلیوں کے سر پر مال واپس کیا گیا۔ اس کے بعد نماز مغرب پڑھ کر دسہری اور سفیدے کی زیارت کی سعادت نصیب ہوئی۔ ان سارے قصوں میں کچھ بھی نہیں تھا بجز اس کے معطی نے چاہا کہ دے ولا کر لے لے۔ چند روپوں کا وارانیارا ہوا، ہوا جو کچھ ہوا۔ میاں مکارم انتہائی بے شرمی اور بے حیائی کے ساتھ آپ کے آم نوش جان کر رہے ہیں۔ اور میرے طنز و طعن

کے ساتھ کر رہے ہیں۔ وہ اس کا کیا جواب دیں گے میں نہیں جانتا۔ اب میں خود اپنے قابو میں نہیں ہوں۔ دوسروں کو کیا کہوں۔ آپ کے خطوط ان کو سنا دیئے ہیں۔ صرف یہی کر سکتا تھا وہ کیا، آپ کی فراخ دستی پر حسد نہیں غبطہ ہوا۔ ہاں اس کا رنج آپ سے نہیں بلکہ درویش نے اپنا قہر اپنے اوپر توڑا، کہ میرا کام فراخ دستوں کے بس سے بھی باہر ہو چکا ہے "اسبر باذل" کے بذل و نوال کے لئے غالباً ایک دفعہ کی اراقت ماءِ وجہ کافی ہے۔ اس سے زیادہ پانی اپنے چہرہ میں نہیں پاتا۔ اور اب لات سین مناص جب آپ سے نہ ہو سکا تو کس سے کچھ ہوگا۔ میں نے آپ کو آپ کے مہاجن ہی کے خیال سے لکھا تھا، لیکن جب آپ کو منظور نہیں تو خیر۔

نوازش علی[1] صاحب سے میری ملاقات ایسی نہیں ہے کہ ان کو براہ راست لکھوں ورنہ شاید اس کی جرأت کرتا اور آپ کو ضمانت میں پیش کرتا۔ آپ میرے لئے میرے نام سے صرف ایک ہفتہ کے لئے ان سے اپنی ضمانت پر دو سو روپے نہیں دلوا سکتے، آپ چاہتے تو ہو سکتا تھا، اور کاش! اگر میرے حال کا آپ کو واقعی علم ہوتا تو آپ یہ ضرور چاہتے لیکن غیب کا عالم تو وہی ہے جو غیب کا عالم ہے، اسی نے نہیں چاہا تو کسی سے کیا گلہ،

باقی آپ نے ترک وطن کا جو مشورہ دیا ہے وقت پر دیا ہے۔ اب ترک وطن ہی نہیں، بہتر ہوتا کہ ترک حیات ہی ہو جاتا تو انسب تھا، روحاً، دماغاً، قلباً، عقلاً، جسماً، مالاً، قرابۃً، وحُباً، ہر ہی پہلو سے جو جل رہا ہو۔ دعا کیجئے کہ اب یہ کوئلہ راکھ ہی ہو جائے۔

[1] مولانا عبد الباری صاحب ندوی مدظلہٗ کے برادر نسبتی، ۱۲

یہ جاہل کی آرزو ہے۔ والعلم عند عالمہ۔

آپ نے مجھے بار بار اپنے خطوط میں عنایت فرمایا ان اودھ و لکھنؤ کے اشتیاق کا ذکر فرماتے ہیں۔ آپ کی والدہ صاحبہ مدظلہا چونکہ مومنات غافلات میں سے ہیں ان کے لئے تو اس اشتیاق کے کچھ معنی ہو سکتے ہیں لیکن ان رجال حازمین و اولوالالباب پر ضرور تعجب ہے کہ جس سے ساری کائنات بیزار ہو چکی ہے حتیٰ کہ جس کی بیوی بلکہ خود اس کا نفس بیزار ہو چکا ہے اسے وہ ڈھونڈھتے ہیں[1]۔

رفیق کریم! اب کی حضرت[2] مدظلہ کے ساتھ جو چند گھنٹے نصیب ہوئے ان کے بعد ساری مالیخولیائی اولوالعزمیوں کا بھی خاتمہ ہو گیا، اور میری زندگی کا مدار صرف ان ہی چھوٹے ارادوں اور ناقابل عمل عزائم پر تھا اور اب تو کچھ نہیں ہے۔ اس لئے اب یہ سوال کہ حیدرآباد جاؤ گے یا نہیں پیدا ہی نہیں ہوتا۔ غالباً حیدرآباد ہی کی نوکری کے لئے پیدا ہوا تھا اور یہی کام کر کے مجھے دنیا سے جانا ہے۔ بڑی عمارت تھی جو دیکھا یک منہدم ہوئی اور اس طرح ہوئی کہ شاید اس راز کا کسی سے ذکر بھی نہ کروں گا۔ اسی لئے معین الدین[3] صاحب کے مکان کی خبر سے صدمہ ہوا۔ "داماذ" کا حجرہ کیا مل سکتا ہے؟ اکیلے ہی آیا ہوں، اکیلے ہی جاؤں گا

[1] فاضل گیلانی رحمہ "صاحب حال" تھے اور کبھی کبھی اپنے حال میں بہت دور نکل جاتے۔ (ع)

[2] مراد حضرت شیخ الاسلام حضرت مولینا سید حسین احمد مدنی علیہ الرحمہ ہیں (ع)

[3] حیدرآباد میں ایک ڈاکٹر معین الدین صاحب تھے۔ غالباً ان کے لئے کسی مکان کی کرایہ پر لینے کی گفتگو تھی جو طا نہیں۔ (ع)

یہی میری تقدیر ہے۔ مولینا سرور[1] صاحب کو میری ابلہی سے نقصان پہونچا، لیکن کس دوست کو نفع پہونچا، یہی میرا حال ہے، اور شاید یہی رہے گا۔ گیلانی میں قطعاً جی نہیں لگ رہا ہے، لیکن کہاں لگے گا۔ یہ بھی معلوم نہیں۔ شاید اب کہیں نہیں۔ ایک گوشۂ غربت تھا اس سے بھی رخصت ہوتا ہوں۔ شاید اس قریہ سے میری یہ رخصت آخری رخصت ہوگی۔ کچھ حالات ہی ایسے ہیں[2]۔

آپ کے آم ماشاء اللہ نہایت اچھی حالت میں پہونچے ہیں۔ ابھی ایک آگ ہفتہ تک وہ انشاء اللہ تعالیٰ آپ کی یاد دلاتے رہیں گے۔ فجزاکم اللہ منا خیر الجزاء۔

ڈاکٹر صاحب سے میرا سلام عرض کر دیجئے اور فرمائیے کہ اپنے اوپر دوسروں کو، شیر کو شیر پر قیاس نہ فرمائیں۔ کل یعمل علی شاکلتہ (بنی اسرائیل) مولینا مسعود علی صاحب[3] سے

[1] مولینا سرور صاحب دیوبند کے فاضل ایک صالح جوان تھے۔ مولانا ہی کے طفیل میں مکتوب الیہ سے بھی مراسم ہو گئے تھے، حیدرآباد کے اضلاع میں کہیں ملازم ہو گئے تھے۔ اب مدت سے کچھ معلوم نہیں کہ ان دنوں کہاں ہیں۔ (ع)

[2] سب "صاحب حال" کا حال ہے۔ (ع)

[3] بھیارہ ضلع بارہ بنکی کے رہنے والے ہیں، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے فارغ التحصیل۔ ۱۹۱۳ء میں مولینا شبلی کی وصیت کے مطابق دارالمصنفین کی تاسیس کے سلسلہ میں سید صاحب کے ساتھ اعظم گڈھ آئے اور ۱۹۱۵ء میں دارالمصنفین کے مہتمم مقرر ہوئے (باقی اگلے صفحہ پر)

بھی سلام و نیاز۔ ان کے اخلاص کے صلہ میں دعا کر سکتا تھا۔ لیکن آج کل اس سے بھی محروم ہوں۔

ایڈیٹر سچ[1] نے بھی بالآخر اپنے چھوٹے خادم کو چھوڑ دیا، شاید کوئی وجہ ہوئی اور وجہ تو ایک ہی ہے جس کے لئے بقا ہے۔ مولینا سرور صاحب کو سلام۔ آپ ہی ان کی مدد فرمائیں۔ میری مدد ہمیشہ غلط ہوگی۔ ہاں! والدہ صاحبہ مدظلہا کی خدمت گرامی میں میرا مخلصانہ سلام پہونچاتے ہوئے فرما دیجئے کہ آپ کا عرفانی بیٹا[2] ہوں۔ سب کے لئے جہاں فرماتی ہیں ایک کور بخت کے لئے بھی کچھ عرض کیجئے۔ برادرم شعیب سلمہ کو سلام۔ فقط

مناظر احسن گیلانی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اور آج تک اہتمام کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ سیاسیات میں بھی حصہ لیتے رہے ہیں۔ خلافت اور ترک موالات کی تحریکوں میں علی برادران اور گاندھی جی وغیرہ کے ساتھ مل کر خوب خوب کام کیا۔ بڑے زندہ دل اور نظم کی غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ ۱۲

۱؎ مولینا عبدالماجد صاحب دریا آبادی ۱۲ (ع)

۲؎ حضرت مولانا گیلانی، مولینا عبدالباری صاحب اور ان کے والدین سفر حج میں شریک تھے۔ اشارہ اسی طرف ہے۔

۲۲ر اکتوبر ۱۹۳۲ء روز دوشنبہ مطابق ۲۰ر جمادی الاول ۱۳۵۱ھ

لکھنؤ (شبستان سعادت)

سیدی الکریم عافاکم اللہ و حماکم — السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

اس سے پہلے ایک کارڈ بھیج چکا ہوں جس میں اطلاع دے چکا ہوں کہ بالآخر آپ کے مشکوی[1] عالی میں قیام کی اجازت حضرت ڈاکٹر صاحب[2] مدظلہ سے حاصل ہو چکی ہے الحمد للہ کہ اسی دن شام کو شعیب سلمہ مجھے اس مکان میں لے آئے۔ جس میں آنے کے بعد صرف جنت جانے کا شوق رہ جاتا ہے ورنہ زمین کے چہرے پر اتنی خوبیوں اور ماحول کی زیبائیوں کے ساتھ اس سکون اور راحت کی جگہ ملنی دشوار ہے۔ حالانکہ مجھے اپنے گیلانی پر ناز تھا۔ لیکن اس کی فضائیت اور خوشگوار کیفیت کا مقابلہ کون کر سکتا ہے۔ حیدرآباد کے پہاڑ اور جنگل، سبزہ زار، گنبد اور تالاب کسی میں اتنا لطف کبھی نہیں ملا جو اس مکان میں پا رہا ہوں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مدتوں کی ایک آرزو کہ کسی ایسی جگہ جا کر رہوں جہاں،

ہم نشیں کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

کی کیفیت حاصل ہوتی۔ لیکن اس چالیس سال میں اس کا موقع میسر نہ آیا۔ آیا تو اب آیا

۱؎ فاضل گیلانی بسلسلۂ علاج لکھنؤ تشریف لے گئے ہیں اور حضرت مولینا عبدالباری صاحب کے مکان میں فروکش ہیں۔ ۱۲

۲؎ ڈاکٹر حکیم سید عبدالعلی صاحب ۱۲ (ع)

شعیب سلمہٗ تو ڈاکٹر صاحب وغیرہ کے پاس آٹھ نو بجے چلے جاتے ہیں اور بندہ درگاہ ایک خاص قسم کے عالم خلوت میں مغربی حصے کے بالاخانے کے اندرونی کمرے اور برساتی کی چھت پر ایک خاص حال میں بسر کرتا ہے۔ بہرحال اگر میں کسی ہسپتال میں دس پندرہ روپے روز دے کر بھی رہتا تو ریسٹ کا یہ مقام ناممکن الحصول تھا۔ بہرحال حق تعالیٰ نے اس عالم پریشانی میں ایک خاص جمعیت کی جگہ پہونچا دیا۔ رہی میری حالت تو آپ کے مکان میں آئے ہوئے تین دن کامل ہو چکے ہیں آج چوتھا دن ہے۔ اس عرصے میں ورام تو بالکل اتر چکے ہیں، پیشاب کا رنگ صاف ہو گیا ہے لیکن پرہیز کی سختی کی وجہ سے ضعف بے حد ہے۔ پیشاب میں علاوہ البومن تحقیق سے ثابت ہوا کہ کچھ خون بھی آتا تھا آج پھر میڈیکل کالج قارورہ جانچنے کے لئے جاتا ہے۔ دیکھئے کیا رپورٹ آتی ہے، مطلع کروں گا پرہیز میں ڈاکٹر صاحب سخت ہیں اور میں بھی ان کی اتباع و اطاعت اس حیثیت سے کر رہا ہوں جیسے کسی طبیب کی نہیں بلکہ امام کی کرنی چاہئے۔ دوا بھی کچھ دے رہے ہیں، لیکن نہ مغربی ہے نہ مشرقی۔ لا شرقیۃ ولا غربیۃ (نور) بلکہ کچھ اور ہے، آپ کے مکان کا مفصل حال شعیب سلمہٗ لکھیں گے۔ نظر محمد آپ کا نوکر دو دن تو نیم حاضر باش رہا اس کے بعد بخار و درد سر میں اپنے کو مبتلا بتاتا ہے۔ اللہ میاں نے انتظام کر دیا ہے۔ ماجد میاں کو دیکھتا تھا کہ گو وہ محب علی[1] کو دے رہے تھے لیکن ان کے پروگرام پر اس کا اثر خاص طور سے

[1] مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی مدظلہٗ کا خادم خاص، حاجی محب علی مرحوم جن سے مولانا گیلانی علیہ الرحمہ بھی خوب مانوس تھے۔ (ع)

پڑتا تھا۔ خیر اللہ نے سب انتظام درست کر دیا ہے۔ لوگوں کی آمد و رفت بند ہے۔ لیکن کچھ لوگ ٹپک ہی پڑتے ہیں معلوم نہیں والدہ صاحبہ تشریف لے آئیں یا نہیں۔ سلام و نیاز عرض کر کے دعا کی درخواست خاص طور پر میری طرف سے دیجئے۔ گیلانی کی کوئی خبر اب تک نہیں ہے۔ فاللہ خیر حافظا وھو ارحم الراحمین (یوسف)۔ فقط

مناظر احسن گیلانی

لکھنؤ ہارڈنگ روڈ "شبستان سعادت"

۲۷ راکتوبر ۱۹۳۲ء مطابق ۲۵ جمادی الاول ۱۳۵۱ھ

سیدی وصدیقی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آج لکھنؤ پہونچے ہوئے ہم لوگوں کو گیارہ دن ہوئے ہیں۔ بجز مولوی صفی[1] کے کاٹنے کے اور کوئی خبر حیدرآباد کی آپ نے پھر نہیں دی۔ حالانکہ شعیب سلمہٗ اور خاکسار نے متعدد خطوط اس عرصے میں روانہ کئے ہیں۔ "اسابش خیر باد" یہ بھی معلوم نہیں کہ اب آپ کا مزاج کیسا ہے؟ حاجی صاحب[2] قبلہ نے بھی خبر نہ لی، بہرحال۔ واللہ معکم اینما کنتم

[1] مولانا صفی الدین صاحب مرحوم نے جو شعبۂ تالیف و ترجمہ کے ناظر مذہبی (محتسب) تھے غالباً مولانا عبدالباری صاحب مدظلہٗ کی کسی کتاب پر کوئی اعتراض کیا تھا۔ ۱۲

[2] حاجی معین الدین صاحب کانپوری۔ (ع)

واللہ خیر حافظا وھو ارحم الراحمین۔ جیسا کہ لکھ رہا ہوں، ڈاکٹر صاحب کے زیر علاج ہوں۔ اور دوا اب تک جاری ہے۔ چونکہ اختتام رخصت کے دن سر پر آگئے ہیں۔ اس لئے کل خصوصیت کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کو قارورہ کے ساتھ کہلا بھیجا کہ اب آپ کی رائے کیا ہے۔ اس کے جواب میں انھوں نے یہ حکم دیا کہ ابھی میری حالت اطمینان بخش نہیں۔ البومن بھی پیشاب میں ابھی آرہا ہے۔ اور گو خون کی کمی ہوگئی ہے تاہم بالکلیہ اس کا بھی ازالہ نہیں ہوا ہے اس وقت تک زینہ سے اترنے کی اجازت بھی ڈاکٹر نے نہیں دی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ آرام جو اترے ہیں اگر میں دو تین بعد سفر کروں گا تو حرکت و جنبش سے پھر سب ابھر آئیں گے اور جو کچھ نفع اب تک ہوا ہے، ضائع ہو جائے گا۔ انھوں نے حتمی فیصلہ کرکے حکم دیا ہے کہ میں اپنی رخصت میں توسیع کروں۔ میں سخت حیص بیص میں ہوں۔ ایک طرف یہ خیال کہ لڑکوں کی تعلیم اس ٹرم میں کچھ نہیں ہوئی ہے۔ امتحان سر پر آپہونچا ہے نیز شدید مالی نقصان ہے دوسری طرف صحت کی حالت خود مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اس قابل نہیں ہے کہ حیدرآباد پہونچ کر کام کر سکوں گا۔ اور شدید اندیشہ ہے کہ واپسی کے بعد پھر بستر پر گرنا پڑے گا۔ اب سوائے اس کے چارہ کار کیا ہے کہ معاملات خدا کے سپرد کروں، اور متوکلاً علی اللہ اپنی رخصت کی توسیع کی درخواست دوں۔ ورنہ یہ سارا سفر بےکار اور تمام مصارف رائیگاں ہو جائیں گے، آئندہ جو خدا کی مرضی۔ یہ سب کچھ سوچ کر آج پھر رخصت کی درخواست آپ کو بھیج رہا ہوں، اگر ۲۶ آذر[1] تک میں نہ پہونچ سکا تو آپ اس درخواست کو صدر صاحب کے

[1] آذر مہینہ کا نام ہے حیدرآباد میں اس وقت تک سنہ فصلی شمسی ایرانی جاری تھا۔ ۱۲

پاس بھیج دیجئے۔ میں نے بذریعہ تار اپنے برادر دیر پر دستخط کرنے کی ان سے استدعا کی ہے جس کی آپ کو خبر ہوئی ہوگی، دیکھئے وہ کیا کرتے ہیں۔ برادرم سمی احمد سلمہ سے مشورہ کر لیجئے اور جو کچھ آپ لوگوں کے نزدیک مناسب معلوم ہو کیجئے۔ میں تو صرف حیرت اور مقام تفویض میں ہوں کہاں بخار اور کہاں البومن، کہاں خون اور کہاں مقدمہ استسقار اور لکھنؤ کا سفر۔ کوئی بات جھول کے پروگرام حیات میں نہ تھی۔ لیکن تقدیر میں سب کچھ لکھا ہوا تھا۔ لن یصیبنا الا ما کتب اللہ لنا (توبہ) ایک ایسا عقیدہ ہے جس کا انکار کفر ہے، اور اس سے اختلاف انسانی بس سے باہر ہے۔ روپیہ بھی روز بروز کم ہو رہا ہے۔ حکیم صاحب اور ڈاکٹر صاحب کا بل بھی باقی ہے، ڈاکٹر صاحب کے متعلق تو ڈاکٹر عبدالعلی صاحب کی یہی رائے ہے کہ جو کچھ نقصانات پہونچے ہیں آرسنک کے انجکشن کا نتیجہ ہے۔ بہرحال اس کی ادائیگی بھی واجب ہے۔ تاہم حکیم صاحب کا بل مقدم ہے اور برادرم فضل اللہ سلمہ[1]

[1] مولینا سید فضل اللہ، رمضان ۱۳۲۰ھ مطابق دسمبر ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوئے۔ آپ مولینا سید احمد علی علیہ الرحمہ کے صاحبزادے اور حضرت مونگیری رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے ہیں۔ درسیات کی تکمیل خانقاہ رحمانی ہی میں مولینا مفتی عبدالطیف صاحب علیہ الرحمہ سے کی۔ ۱۹۲۹ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات میں لکچرار مقرر ہوئے اور ۱۹۵۵ء میں صدر شعبۂ دینیات ہو کر ریٹائر ہوئے۔ حضرت مونگیری علیہ الرحمہ سے بیعت کی اور مجاز ہوئے۔ مرشد کے وصال کے بعد مولینا عبدالکریم صاحب گنج مرادآبادی، مولینا بشارت کریم صاحب گڑھولوی، مولینا محمد عارف صاحب ہرسنگھ پوری اور مولینا محمد حسین صاحب حیدرآبادی سے کسب فیض کیا۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

کے کچھ روپے جس کی تعداد شاید دس سے کم ہو مجھ پر باقی ہیں۔ اگر وہ نظرۃ الی میسرۃ کے بور سے نفع اٹھانا چاہتے ہوں تو بہتر ہے۔ اور حاجی صاحب کے چودہ کلدار[1] باقی ہیں، خیر دیکھئے کیا ہوتا ہے، گیلانی میں اس سال قحط کا سماں ہے اگرچہ سرکار سلمہ کچھ نظم کر کے آئے ہیں لیکن دیکھئے وہ بھی کس حد تک نتیجہ خیز ہوتا ہے، اور کیا لکھوں۔ مولینا کے اشعار آج کل ورد زباں ہیں۔

ہست ہشیاری زیادِ ما مضیٰ	ماضی و مستقبلت پردہ خدا
آتشے برزن بہر دو تا بکے	پر گرہ باشی ازیں ہر دو چو نے
تا گرہ باقی بود ہمراز نیست	ہم نشیں آں لب و آواز نیست
جستجوئے ما ورائے جستجو	من نمی دانم تو می دانی بگو
حال و قالے از ورائے حال و قال	غوطہ در بحر جلال ذوالجلال

آپ کا نوکر نظر محمد بالکل کاہل، متکبر اور سرکش ثابت ہوا۔ شعیب صاحب نے آپ کے ایک قدیم ملازم جان محمد کو رکھوا دیا ہے جہاں تک مجھے تجربہ ہوا جان محمد بڑا محنتی جفاکش معلوم

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اور موخر الذکر سے خلافت بھی ملی۔

خدا نے علم و تقویٰ دونوں سے حصۂ وافر عطا فرمایا ہے۔ بڑے خلیق اور وضع کے پابند ہیں جس میں پروفیسری بھی تزلزل پیدا نہ کر سکی۔ ماشاءاللہ حیدرآباد میں سلامت باکرامت ہیں۔ ۱۲۔

[1] حیدرآباد کی اصطلاح میں کلدار ہندوستانی انگریزی سکہ کو کہتے ہیں اور حالی حیدرآباد کے سکہ کو۔ کلدار کے مقابلہ میں حالی کی قیمت کم ہوتی تھی۔ ۱۲۔

ہوتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس کی وجہ سے مجھے لکھنؤ میں بڑا آرام ہو رہا ہے۔ محب علی کو سوچ کر آیا تھا لیکن وہ بالکل مروت کا معاملہ تھا، اور دس بارہ دن سے زیادہ اس مروت کا نباہ بھی مشکل تھا۔ خداوند تعالیٰ کا فضل ہوا کہ ابتدا ہی سے اس کی ضرورت نہ ہوئی۔

شروانی صاحب کا گرامی نامہ آیا ہے وہ دکن جا رہے ہیں، میری معیت چاہتے ہیں۔ لیکن دیکھئے خدا کیا کرتا ہے۔

حاجی صاحب[1] کو سلام فرما دیجئے گا افسوس کہ ان کی خدمت کچھ نہ کر سکا معلوم نہیں حاجی صاحب کی کارروائی کا کیا انجام ہوا۔

والدہ صاحبہ کی خدمت میں سلام کے ساتھ دعا کی التجا فرما دیجئے۔ چونکہ ایسی صورت میں میری درخواست اتفاقی رخصت بیماری میں بدل جاتی ہے اسلئے شاید ڈاکٹری صداقت نامہ کی ضرورت ہوگی۔ سمی صاحب سے دریافت کر کے لکھئے کہ کیا ڈاکٹر صاحب کی سرٹیفکیٹ بھیج دوں۔

المغرور بالامانی

مناظر احسن گیلانی

---

[1] مراد مولینا حاجی معین الدین ندوی صاحب مرحوم سابق کیٹلاگر کتب خانہ خدابخش خاں پٹنہ جو مولینا کے کچھ عزیز بھی تھے۔ اور حیدرآباد میں کسی معاشی سلسلہ کی فکر میں اس وقت مولینا عبدالباری صاحب ندوی کے پاس ہی مقیم تھے۔ ۱۲۔

۲۹ر اکتوبر ۱۹۳۲ء مطابق ۲۷ر جمادی الاول ۱۳۵۱ھ

شبستانِ سعادت، لکھنؤ

سیدی و صدیقی، عافاکم اللہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آج ۲۵ر آذر[1] ہے۔ حیدرآباد کے پروگرام کے رو سے آج مجھے روانہ ہو جانا چاہیے۔ لیکن تفصیل لکھ چکا ہوں۔ خدا خدا کر کے کل اور پرسوں آپ کے خطوط مسلسل ملے۔ خیریت معلوم کر کے دل مطمئن ہوا لیکن کارڈ میں آپ نے لکھا ہے کہ طبیعت زیادہ خراب معلوم ہوتی ہے۔ برادرم شعیب سلمہ، سے معلوم ہوا کہ والدہ مدظلہا کے گرامی نامہ سے معلوم ہوا کہ آپ کو دورہ پڑ گیا ہے، خدا خیر کرے، اللہ تعالیٰ رحم فرمائے، دعا کر رہا ہوں۔ اپنی بیماری کے زمانے میں آپ کی صحت مجھے ذاتی طور پر زیادہ مطلوب ہوتی ہے۔ میں بتدریج صحت کی طرف ترقی کر رہا ہوں۔ اورام اتر چکے ہیں، لیکن پیشاب کے اجزا میں ابھی نقائص باقی ہیں۔ میں نے ۳۰ر آذر تک کی درخواست بھیج دی ہے لیکن لکھ چکا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک یہ ناکافی ہے۔ آج ایک درخواست ۳۰ر دَے[1] تک کی لکھ کر پھر بھیجتا ہوں، اس کیلئے شاید ڈاکٹری سرٹیفکٹ کی ضرورت ہو، لکھا تھا کہ دریافت فرما کر ارقام فرمائیں۔ بہر حال آپ کی طبیعت تو ناساز ہے۔ حضرت حاجی صاحب[2] کو ارشاد فرمائیں کہ وہ ان سوالات کے

---

[1] سنہ فصلی شمسی ایرانی جو حیدرآباد میں رائج تھا، اسی کے ایک مہینہ کا نام ہے۔ جو نومبر کا مقابل مہینہ ہے۔

[2] یعنی مولانا حاجی معین الدین صاحب ندوی مرحوم۔ ۱۲ (ع)

جوابات بہ واپسی ڈاک عطا فرمائیں۔

(۱) شروانی صاحب تشریف لے آئے؟

(۲) ان سے آپ لوگوں کی ملاقات ہوئی یا نہیں کوئی بات بھی ہوئی یا نہیں؟

(۳) مجھے طبی صداقت نامہ کس نوعیت کا بھیجنا چاہئے۔ کیا ڈاکٹر صاحب کی سند کافی ہوگی؟

(۴) میری تنخواہ کا انجام کیا ہوا؟

(۵) امتحانات میقاتی کے لئے کونسی تاریخ مقرر ہوئی ہیں چاہتا ہوں کہ یہیں سے ہر سال کے نئے سوالات بنا کر بھیج دوں؟

خاص کر حاجی صاحب کو فرمائیں کہ وہ اپنی حالت اور جو نئی راہ اللہ تعالیٰ نے اپنے لطف و کرم سے کھولی ہے، اس کی نوعیت کیا ہے، ضرور لکھیں نیز نزہۃ الخواطر[1] کے انڈکس کا کیا ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے ذکر آیا تھا، فرمایا کہ والد صاحب نے ایسے مقامات کا

---

[1] مولینا حکیم سید عبدالحی صاحب مرحوم سابق ناظم ندوۃ العلماء کی جلیل القدر تصنیف جو آٹھ جلدوں میں ہے اور یا چھٹی صدی سے تراجم پر مشتمل ہے اس کی اشاعت کا سہرا مولینا گیلانی ہی کے سر ہے۔ قیام حیدرآباد کے زمانہ میں انھوں نے ایک محضر تیار کر کے صدر اعظم سر اکبر حیدری کی خدمت میں پیش کیا جس میں اس جلیل القدر علمی کارنامے کی اشاعت کی پُر زور درخواست تھی چنانچہ ریاست حیدرآباد نے اس کی اشاعت منظور کی اس وقت تک۔ اس کی سات جلدیں شائع ہو چکی ہیں ساتویں جلد تیرہویں صدی کے اعیان کے تراجم پر مشتمل ہے۔ ۱۲

ذکر اپنی جغرافی جلد میں کیا ہے۔ شاید وہ حصہ طبع بھی ہو چکا ہے۔ ضرورت یقیناً اس کی ہوگی۔ ان سے لے کر انشاء اللہ تعالیٰ بھیج دوں گا۔ ورنہ ساتھ لاؤں گا۔

دو تین دن ہوئے کہ ماجد میاں دریا آباد سے تشریف لائے۔ تین دن رہے۔ قیام تو خاتون منزل میں تھا لیکن روزانہ سات آٹھ گھنٹے کے لئے آپ کے در دولت میں تشریف لے آتے تھے۔ لیکن بُعد مسافت کی شکایت کرتے تھے۔ کل وہ بھی تھے اور خواجہ عزیز الحسن[1] صاحب خلیفہ حضرت تھانوی اور ان کے ساتھ ایک مجمع نیز مولوی شفیع صاحب[2] فرنگی محلی بھی آئے تھے۔ دیر تک مجمع رہا۔ عصر اور مغرب کی نماز آپ کی برساتی کی چھت پر باضابطہ اذان کے ساتھ ادا ہوئی۔ پہلے موذن شبستان سعادت کے حضرت تھانوی کے خلیفہ خواجہ عزیز حسن صاحب تھے۔ کیا اب بھی اس شبستان کی سعادت میں آپ کو شبہ ہے۔ ماجد میاں اپنے پروگرام سرمائی پر تھانہ بھون، دیوبند، سہارنپور

[1] خواجہ عزیز الحسن غوری مجذوب صاحب "اشرف السوانح" جو اس وقت لکھنؤ میں اسسٹنٹ انسپکٹر آف اسکولز تھے۔ ۱۲ (ع)

[2] فرنگی محل کے مشہور علمی خانوادہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ۱۲ صفر ۱۳۱۷ھ کو پیدا ہوئے۔ تعلیم مدرسہ نظامیہ فرنگی محل میں مکمل کی۔ پھر وہیں مدرس ہو گئے۔ چند سال تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ناظم دینیات بھی رہ چکے ہیں۔ تقسیم سے پہلے مدرسہ عالیہ کلکتہ میں مدرس تھے۔ تقسیم کے بعد جب مدرسہ عالیہ ڈھاکہ چلا گیا تو مولانا بھی ڈھاکہ پہنچے۔ جنگ آزادی میں کانگریس کے حامی اور ہمنوا تھے اور اسی سلسلہ میں جیل بھی گئے۔ اب مستقلاً ڈھاکہ میں قیام پذیر ہیں اور پنشن پا رہے ہیں ۱۲ ع

جا رہے ہیں۔

اس میں شک نہیں ہے کہ بعض لوگوں کو آپ کے مکان کے محل وقوع خصوصاً بُعد مسافت پر اور بعضوں کو اس کے نقشہ پر کچھ نکتہ چینی کرتے ہوئے پایا۔ لیکن ان کے نزدیک جو وجوہ شر ہیں، کیا کروں میرا گھبرایا ہوا دل اس کو خیر خیال کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اختیاری خلوت اگر میسر نہ آسکے تو خدا کی اس نعمت کا کون شکر ادا کر سکتا ہے کہ اضطراری خلوت کے انعام سے سرفراز فرمایا ہے۔ بہر حال میں نے بار بار اپنے احساس کا اظہار اپنے خطوط میں کیا ہے۔ اور اگر آپ بدگمانی سے کام نہ لیں تو میں یاد کراتا ہوں کہ "مدخوش کرنی"[1] میں یہ اظہار واقعہ داخل نہیں ہے۔ لیکن آپ اپنی سہولتوں کو پالینے کے بعد پھر اس کی پرواہ کیوں فرماتے ہیں کہ جہولوں اور ظلوموں کی اس کے متعلق کیا رائے ہے۔ "با خلق مارا کار نیست"

کا اصول اہل عقل و دین کا قدیم اصول ہے۔

اور کیا عرض کروں۔ حق تعالیٰ آپ کو بعافیت کلی رکھے اور دورہ سے تو انشاء اللہ تعالیٰ نجات ہو چکی ہوگی۔ روپیہ کم ہو رہا ہے۔ تنخواہ کا جو حصہ بھی ہاتھ

[1] مولینا کا ایک خاص مزاج و رنگ یہ تھا کہ کسی چھوٹے بڑے حتیٰ کہ اپنے خدمتگار کی جا و بے جا کسی طرح کی ناراضی و ناخوشی قطعاً گوارا نہیں فرما سکتے تھے۔ ہر کس و مہ کو خوش ہی رکھنا چاہتے تھے۔ مکتوب الیہ نے غایت بے تکلفی میں اسی وصف کی بنا پر حیدرآبادی رنگ کا خطاب "خوش کرنی" دے رکھا تھا جس سے خود بھی بہت محظوظ ہوتے تھے۔ ۱۲ (ع)

آجائے۔ حکیم[1] صاحب کے بل کے بعد اگر تار کے ذریعہ ممکن ہو ارسال فرما دیجئے۔ ورنہ ضروریات کی تکمیل میں دشواری ہو جائے گی۔ یہاں کہیں سے مدائنہ کا سلسلہ بھی قائم نہیں ہو سکتا۔ گھر بھی بھیجنا ہے۔

شروانی صاحب سے سلام فرما دیجئے۔ شاید ان کو میرا آخری خط نہیں ملا۔

جان محمد واقعی میری خدمت کر رہا ہے۔ خصوصاً دوا وغیرہ پینے، پلانے میں بڑی مدد مل رہی ہے۔ بعض اجزا روزانہ جنگل سے لانا ہوتے ہیں۔ مثلاً برگ گیندا، ریشہ برگد وغیرہ، خدا آپ کو جزائے خیر دے کہ ایسے معتوب ملازم کو محض میرے خیال سے آپ نے اگر محبوب نہیں تو کم از کم اس کے رکھنے کو معیوب نہیں قرار دیا۔ نظر محمد کا حال شعیب سلمہ لکھیں گے۔ تاریخ کی ایک خبر نظر سے گذری کہ لکھنؤ کا بانی سعادت خاں تھا۔ "شبستان سعادت"[2] کے ساتھ ایک مناسبت محسوس کر کے دل مسرور ہوا۔ خیال گذرا کہ انشاء اللہ تعالیٰ اس سعادت کی بنیاد کی تکمیل اگر خدا چاہے تو اس شبستان سے ہو سکے گی۔ برادرم مکارم سلمہ ساتھ ہیں سلام و نیاز عرض کرتے ہیں۔

والدہ صاحبہ مدظلہا اور اہل بیت پر رحمۃ اللہ علیکم و برکاتہ فرما دیجئے۔ عزیزان سعادت و مبین سلمہما کو دعا، حبیبہ کو پیار۔

نیاز کیش

مناظر احسن گیلانی

---

[1] حکیم عبدالوہاب انصاری نابینا دہلی اور پھر حیدرآباد کے نامور طبیب ۱۲ (ع)

[2] مکتوب الیہ کے مکان کا تاریخی نام "شبستان سعادت" خود مولانا گیلانی نے رکھا تھا۔ ۱۲ (ع)

۱۰ر نومبر ۱۹۳۲ء مطابق ۱۱ر رجب ۱۳۵۱ھ

لکھنؤ، شبستان سعادت

سیدی المحترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بیمہ کے لفافہ کے بعد آپ کا دوسرا کارڈ بھی ملا۔ افسوس ہوا کہ آپ پر دمہ نے پلٹ کر پھر حملہ کر دیا۔ دوا اس سے پیشتر جا چکی تھی جو انشاء اللہ تعالیٰ پہونچ چکی ہوگی۔ اپنا حال کیا عرض کروں، میں نے تو خیال کیا ہے کہ بہرحال ۲۳ ردے تک حیدرآباد کسی طرح پہونچ جاؤں اور اسی لحاظ سے رخصت لی تھی لیکن ڈاکٹر صاحب کو اجازت دینے میں زیادہ جری نہیں پا رہا ہوں۔ البومن کا امتحان سہ ہر کے بعد پھر نہیں ہوا ہے، عام حالت کچھ ایسی بری نہیں معلوم ہوتی ہے۔ تاہم نقاہت، ضعف از حد گذشتہ ہے۔ غالباً اس کی وجہ خوراک کی کمی ہے۔ جو کھانا مجھے مل رہا ہے اس سے نہ نفس کو مسرت ہوتی ہے اور نہ اطمینان، پھر وہ فربہ ہو تو کیوں کر ہو۔ بطور دوا کے دودھ کو اٹھا کر اور چند توس جس کی تعداد تین سے زیادہ نہیں ہوتی پی جاتا ہوں۔ خیر دیکھئے آئندہ کیا ہوتا ہے۔ میں نے تو اپنے دستخط کے پرچے بھیج دیئے ہیں۔ اطلاع دیتا جاؤں گا، جو حالات سامنے آئیں گے۔ سوالات امتحانی کے داخلہ کی تاریخ گذر چکی ہے۔ معلوم نہیں جو پرچے بنا کر میں نے بھیجے تھے اس کا انجام کیا ہوا۔

چک پر دستخط کر کے بھیج رہا ہوں۔ روپیہ وصول کر لیجئے۔ اس وقت مجھے بحمد اللہ مزید روپیہ کی حاجت نہیں۔ حق تعالیٰ نے آپ کو مہربان کر دیا، اور موجودہ مشکلات حل ہو گئیں ہیں انشاء اللہ تعالیٰ اسی میں بہ آسانی حیدرآباد تک پہونچ جاؤں گا۔

آپ نے لکھنؤ کے متعلق جن انتظامات کی ہدایت برادرم شعیب سلمہٗ کو کی ہے وہی اس کا جواب دیں گے۔ ان کی ایک رائے جو تھی وہ لکھ چکا ہوں۔

مختصر گیر و کار آساں کن[1]

اور سب کو سلام فرما دیجئے۔ امجد[2] صاحب نے اس فقیر کی کٹیا کو مجد کیا، میری طرف سے شکریہ اور بہت شکریہ ادا کر دیجئے۔

حاجی صاحب کے خط سے معلوم ہوا کہ ان کو دینیات کے نصاب کی تیاری کے لئے نمونہ پیش کرنے کے لئے کہا گیا ہے۔ یہ مسئلہ میری دلچسپی کا تھا، کاش موجود ہوتا بہرحال وہاں موجود نہیں ہوں۔ میری رائے ہمیشہ سے اسکولی دینیات کے نصاب کے متعلق یہ تھی۔

۱۔ فاتحہ سے الم ترکیف یا والضحیٰ تک ترجمہ عم پارہ بصورت تحلیل الفاظ ومعنی،

۲۔ تسبیح و تحیات وصلوٰۃ وغیرہ کا ترجمہ۔

۳۔ ادعیہ، قنوت وجنازہ واذان وبعد الصلوٰۃ۔

۴۔ آیات عقائد باللہ والملائکہ والرسل والتقدیر والبعث بعد الموت مع ترجمہ۔

۵۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ، اضحیہ، ذبائح کتاب الکراہتہ وکتاب النکاح، طلاق و رضاعت کے مسائل فقہیہ مختصر قواعد کے پیرایہ میں۔

---

[1] یہ مولینا نے مکتوب الیہ کو بڑے پتہ کی نصیحت فرمائی ہے طبعاً کچھ دشوار پسندی واقع ہوا ہے جزاہ اللہ۔

[2] حیدرآباد کے مشہور صوفی شاعر۔ ۱۲ (ع)

۶۔ دو تین اسباق یا اوراق میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور چند سطروں میں انبیاء سابقین کے اسماء و حالات،

۷۔ خلفائے راشدین کے لئے ایک ایک صفحہ۔

۸۔ ائمہ اربعہ کے لئے ایک ایک صفحہ۔

۹۔ سلاسل اربعہ صوفیہ کے بزرگوں کے لئے ایک ایک صفحہ۔

۱۰۔ زنانہ نصاب میں صرف نماز روزہ کے متعلق ان کے مخصوص مسائل اور کچھ ادعیہ ماثورہ متعلقہ طفلان وغیرہ۔

۱۱۔ اور خلفائے راشدین وائمہ صوفیہ کی جگہ امہات المومنین کے حالات زندگی۔

مڈل اور میٹرک تک اسی نصاب کو تقسیم کر کے رکھ دینا چاہئے۔ حاجی صاحب سے بھی میری رائے عرض کر دیجئے۔ اور آپ بھی غور کر لیجئے۔ ممکن ہے کہ میں اپنی تجویز کی تصویر پوری نہ اتار سکا ہوں۔ افسوس ہے کہ اس کے متعلق جو میرے پاس یادداشتیں تھیں وہ میرے پاس موجود نہیں ہیں۔ شاید اس میں کوئی اور جزء بھی ہو۔ آپ کے ایک گذشتہ مکتوب سے معلوم ہوا تھا کہ عربی میں ابتدائی تعلیم کی بھی سفارش منظور ہو گئی ہے اگر ایسا ہوا ہے تو اس سلسلہ میں بھی جو میری رائے ہے عرض کئے دیتا ہوں۔

میں چاہتا ہوں کہ چند اسباق اسی کتاب میں عربی کے متعلق اسی طور سے دیئے جائیں۔

۱۔ حروف، مثلاً جار وغیرہ روابط۔

۲۔ حروف مشبہ بالفعل۔

۳۔ افعال ناقصہ۔

۴۔ اسمار الافعال۔

۵۔ ضمائر۔

۶۔ اسمار اشارہ۔

۷۔ اسمار موصول۔

اس کے لئے کتاب الصرف[1] امرتسری کے آخر میں ایک باب بہت مفید لگا ہوا ہے۔ اگر اتنی چیزیں ہی لڑکے یاد کرلیں گے تو قرآن کے ترجمہ میں ان کو کوئی دقت نہ ہوگی کہ اُردو میں عربی زبان کے اسمار زیادہ، افعال ان سے کم اور حروف یا ملحق بالحروف یہی چیزیں بہت کم ہیں۔

گنجائش ہو تو اسم فاعل، مفعول، آلہ، ظرف، تفضیل، مبالغہ، صفت مشبہ کے اوزان اگر اس سے زیادہ گنجائش ہو تو افعال کے ابواب مزید و مجرد کے سادہ اوزان بھی دے دیئے جائیں۔ اگر اتنا ہوگیا تو پھر انشاءاللہ عربیت میں راہ مل جائے گی۔ نحو کے مسائل کی ضرورت اس لئے نہیں ہے کہ قرآن خود ہی مُشکل ہے۔ اور اگر زیادہ ضرورت محسوس کی جائے تو مرفوعات و منصوبات و مجرورات کی ایک ہلکی سی فہرست دے دی جائے۔

---

[1] فن صرف میں مولوی حافظ عبدالرحمن امرتسری کی مشہور کتاب جو اُردو زبان میں ہے آخری اسباق میں معرفہ، نکرہ، ضمائر، اسم اشارہ اور موصول، اسم عدد اور حروف عاملہ اور غیر عاملہ کا بیان ہے۔ ۱۲

بنیات غیر متبدل ہی ہیں۔ غیر منصرف میں، چنداں تبدیلی نہیں۔ اسمار ستہ مکبرہ وغیرہ نوادر ہیں جن کے الفاظ بھی محدود اور استعمال بھی کم۔ جن کا زیادہ ہے تو کثرت تر داد کی وجہ سے آدمی اس سے آشنا ہو جاتا ہے۔ بہر حال اگر دینیات کو اسکولوں میں صرف ہفتہ کے اندر دو ہی گھنٹے دیئے جائیں تو میٹرک تک بآسانی یہ نصاب ختم کرایا جاسکتا ہے۔ افسوس کہ اس وقت حیدرآباد میں میں موجود نہیں ہوں۔ لیکن انشاء اللہ تعالیٰ آپ کی مضبوط اور حاکم طبیعت فیصلہ میں آسانی پیدا کر دے گی۔

والدہ صاحبہ کی خدمت میں سلام۔ امجد صاحب، وحاجی صاحب کو سلام، بچوں کو دعا، بچوں کی ماں کو سلام۔

نیاز کیش

مناظر احسن گیلانی

---

۲۰ رمضان ۱۳۵۱ھ مطابق ۱۷ جنوری ۱۹۳۳ء

گیلانی

سیدی الرفیق! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میرا عریضۂ نیاز مل گیا ہوگا۔ جواب پانے سے پہلے یہ دوسرا خط پھر بھیجتا ہوں۔ شدید انتظار کرکے خدا خدا کرکے پرسوں ڈاکٹر صاحب[1] کا گرامی نامہ ملا۔ امید تو تھی لیکن

---

[1] وہی ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب لکھنوی۔ ۱۲ (ع)

اس میں میری رپورٹ مرسلہ کو مجروح قرار دیا گیا۔ شاید کمپاؤنڈر کے فسق کی وجہ سے، ورنہ فنی طور پر ان پر ہر طرح سے اطمینان کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال غالباً کے لفظ کے ساتھ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ روزہ جو روحانی منافع کا باعث ہے غالباً جسمانی مفاد بھی رکھتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ یہاں کے لوگوں پر حجت پوری نہ ہو سکی۔ گو مجھ پر حجت تام تھی۔ لیکن ایسے لوگوں میں ہوں کہ سب کے سب روزے کی مخالفت کر رہے ہیں۔ اتفاق یہ ہوتا ہے کہ اسی ہفتہ میں پیشاب کی جو رپورٹ آئی ہے اس میں پھر البومن کی مقدار دو تین گرین زائد پائی گئی ہے بہرحال اسی کشمکش میں میرے روزے قربان ہو رہے ہیں۔ سخت افسردہ رمضان اس سال کا گذر رہا ہے۔ جن لذتوں سے آپ لوگ متمتع ہیں اس سے میں محروم ہوں، اسی ذہنی الجھن میں مبتلا تھا کہ یکایک کل میاں ہاشم سلمہ[1] کا کارڈ آیا ہے جو ملفوف ہے۔ اس خط نے اور بھی متردد کر دیا ہے۔ مولوی فضل بچارے نے براہ راست بھی خط لکھ کر اپنے یہاں ٹھہرنے کی دعوت دی تھی، جواب بھی دے دیا تھا، کہ اس خط کے بعد پریشان ہو گیا ہوں صرف یہی نہیں کہ میں کہاں جا کر ٹھہروں بلکہ اپنے سے زیادہ آپ کی فکر ہے۔ جس وقت سے خط ملا ہے سوچ رہا ہوں، کسی آدمی کا خیال نہیں آتا۔ اب دن ہی کتنے باقی ہیں کہ خط و کتابت کروں۔ آپ کو مطلع کر دیتا ہوں۔ بتائیں کیا کیا جائے۔ میری رائے تو اس خط کے

[1] مولوی سید محمد ہاشم ندوی استھانواں ضلع پٹنہ کے رہنے والے اور اپنے وقت کے مشہور صاحب علم و صاحب قلم مولٰینا محمد احسن صاحب استھانوی کے صاحبزادے ہیں۔ آپ نے ندوۃ العلماء سے فراغت حاصل کی، اور پھر دائرۃ المعارف حیدرآباد میں ایک معقول اسامی پر بحال ہوئے بعد میں محکمہ کے ناظم بھی ہو گئے تھے اب پنشن ہو گئی ہے اور حیدرآباد میں مقیم ہیں۔ ۱۲

بعد سفر ہی کے معاملہ میں کچھ مذبذب سی ہو رہی ہے۔ خصوصاً البومن کی زیادتی نے ڈرا دیا ہے۔ پھر پرہیزی کھانے پینے کی تکلیف کا الگ خیال آتا ہے۔ کام کا بھی ہجوم ہو گا کیونکہ گو گیلانی پہونچ کر بعد حالات کے لحاظ سے میں نے صحت میں کافی ترقی کی ہے۔ لیکن ابھی دو تین گھنٹے اپنے اندر مسلسل کام کی صلاحیت بھی نہیں پاتا ہوں۔ خیال تھا کہ مولوی فضل کے پاس رہنے اور کھانے کا انتظام اچھا ہو گا لیکن اب اس کی بھی امید نہیں۔

اگر افلاس اور قرض کا خیال نہ ہوتا تو واقعتاً میں اس وقت چند مہینے اور رک جاتا۔ لیکن اس کا علاج کیا کروں کشمکش ہے اور سخت ہے، دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ آپ کے جواب کا انتظار کرتا ہوں۔ ہاشم کا خط اور البومن کی آخری رپورٹ اسی لفافہ میں ملفوف ہے۔ آپ سے ڈاکٹر صاحب سے ملاقات ہو یا شعیب سلمہ کی معرفت اس کو ڈاکٹر صاحب کے پاس[1] بھیج دیجئے۔

میاں مکارم سلمہٗ بہار گئے ہوئے ہیں شعیب سلمہٗ اور والدہ مدظلہا کی خدمت میں سلام فرما دیجئے۔ صبیحہ[2]، سعدیہ، امینہ سلمہم کو دعا۔ اہلیہ صائمہ کو سلام۔ فقط

مناظر احسن گیلانی

[1] مکتوب الیہ اس وقت لکھنؤ میں مقیم ہے۔ (ع)

[2] صبیحۃ الباری مکتوب الیہ کی بڑی لڑکی جس کا یہ نام مولٰینا ہی نے رکھا تھا سعدیہ مکتوب الیہ کے مرحوم بھائی سعد الدین کی لڑکی۔ اور امین مرحومہ بہن کا لڑکا جواب پاکستان میں ظہور حسن نام سے انجنیر ہیں (ع) ۱۲

۱۷ جون ۱۹۳۳ء مطابق ۲۱ صفر ۱۳۵۲ھ

اخی الکریم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

او بصحرا رفت، و ما در کوچہا رسوا شدیم

آپ کو نماز دل کی لذت اور اس کے فتوحات مبارک اور

وللعاشق المسکین ما یتجرع

سخت بے کیف زندگی کا وہ حصہ ہے جو ادھر چند دنوں گذرا۔ گیلا روڈ سے کراب کی گھر آیا تھا خوش تھا کہ مدتوں کے بعد اچھی سانس اور خاصی بھوک نصیب ہوئی ہے، لکھا تھا کہ گھر تک پہونچتے ہی معلوم ہوا کہ مکارم سلمہ بیمار ہیں ان کی بیماری کا سلسلہ طویل ہوا۔ اپریل اور مئی کے دو ہفتے تقریباً اسی تردد میں گذرے۔ بیمار کو تیمار دار بننا پڑا۔ ان بے ہنگم گوشوں کی تصویر اتاری جوان دانوں مجھ سے بحالت اضطرار ظاہر ہو رہی تھی، حکیموں اور ڈاکٹروں نے بھی نوازا، اور خوب نوازا، بحمد اللہ اب وہ ادھر اچھے ہیں۔

دوسری چیز تو صرف کرامت ہی کرامت ہے۔ حضرت مولانا حسین[1] احمد صاحب قبلہ

---

[1] شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رح ۱۲۹۶ھ میں بمقام بالامئو ضلع اناؤ پیدا ہوئے۔ آپ عالم اسلام کے ممتاز روحانی پیشوا، اکابر دار العلوم دیوبند کے علوم ظاہر و باطن کے حامل، ہندوستان کی جنگ آزادی کے مخلص ترین رہنما جو تقریباً تیس سال دار العلوم دیوبند کے شیخ الحدیث، اس کے سربراہ اور مسلک دار العلوم کے نمائندہ رہے۔ اور سالہا سال ہند و بیرون ہند کے لاکھوں متوسلین و معتقدین کے دلوں پر بادشاہت کی۔ آپ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رح کے (باقی اگلے صفحہ پر)

نے راستہ میں مشورہ دیا اور میں نے اسے مشورہ ہی سمجھا کہ تم میرے ساتھ مونگیر چلو۔ پٹنہ میں مولانا سجادؔ[1] بھی رات کو ساتھ ہوئے۔ ان کا بھی یہی اصرار تھا۔ مجھے یہ دغدغہ تھا کہ امتحانی پرچوں کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ارشد خلفاء میں تھے۔ ۵ دسمبر ۱۹۵۷ء کو دیوبند ہی میں راہی ملک بقا ہوئے۔ مزار مبارک حضرت نانوتوی کی پائنتی اور حضرت شیخ الہند کے پہلو میں ہے۔ رحمۃ اللہ علیہ ۱۲۔

[1] مولانا ابو المحاسن محمد سجاد صاحب رحمۃ اللہ علیہ ۱۳۰۱ھ میں موضع پنہسہ ضلع پٹنہ میں پیدا ہوئے تعلیم کان پور میں مولانا احمد حسن کانپوری اور الہ آباد میں مولانا عبد الکافی صاحب سے پائی۔ مدرسہ سبحانیہ الہ آباد اور مدرسہ انوار العلوم گیا میں تقریباً اٹھارہ سال تک درس دیا پھر سب کچھ چھوڑ کر اپنی زندگی ملکی و ملی خدمات کے لئے وقف کر دی ۱۹۱۷ء میں جمعیۃ علمائے بہار قائم کی۔ محکمہ قضا کھولا پھر امارت شرعیہ قائم کی، متعدد اخبارات نکالے، جن میں سے اخبار "نقیب" پھلواری شریف اب بھی کامیابی سے چل رہا ہے۔ ۱۹۳۷ء میں نئی اصلاحات کے ماتحت ہونے والے الیکشن میں حصہ لینے کے لئے مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی بنائی اور اس الیکشن میں یہ پارٹی کامیاب ہوئی۔ بہار اسمبلی میں کانگریس کے بعد مولانا ہی کی پارٹی سب سے بڑی تھی۔ دو مسلمانوں اور دو ہندوؤں پر مشتمل وزارت بنائی اور وزارت پر پوری طرح قابو رکھا، صوبہ بہار کے سرکاری دفاتر میں اردو جاری کرائی، اور بھی متعدد اصلاحات جاری کرائیں۔ لیکن خود اسمبلی اور کونسل سے باہر ہی رہے۔ اور ان کا طرز اس غیر معمولی اثر و اقتدار کے زمانہ میں بھی فقیرانہ ہی رہا۔ قدرت نے غیر معمولی دل و دماغ اور بہترین قوت حافظہ سے سرفراز فرمایا تھا۔ اور فکر و تدبر کے ساتھ قوت عمل بھی بخشی تھی۔ قرآن، حدیث، فقہ، اور اصول فقہ پر وسیع اور عمیق نظر تھی مولانا کی (باقی اگلے صفحہ پر)

متعلق لکھ آیا ہوں کہ گیلانی بھیج دیئے جائیں، اور وقت کافی گذر چکا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ واپس ہوکر میری پریشانی کا باعث ہوں۔ اس لئے کیول اسٹیشن پر پہونچ کر حضرت سے عرض کیا کہ صرف ایک ٹرین سے اگر اجازت ہو تو ڈاک خانہ میں اپنے پرچوں کا حال دریافت کر آتا ہوں۔ اس کے بعد واپس ہوکر دوسرے دن مونگیر حاضر ہو جاؤں گا۔

مجھے کیا معلوم تھا کہ حضرت نے "حکم" دیا تھا۔ بس اس حکم کو توڑا، اگرچہ بظاہر اجازت سے توڑا، شاید دل کی رضامندی ساتھ نہ تھی۔ گھر پہونچ کر مکارم کو ادھر بیمار پایا۔ ڈاک خانہ سے خبر آئی کہ بجز ایک پارسل کے اور کوئی پارسل اب تک وصول نہیں ہوا ہے۔ حیرت کی انتہا نہ رہی۔ ۸ر خورداد[۱] کو میٹرک کا امتحان ہوا تھا، میں گھر غالباً ۲۴ر خورداد کے بعد پہونچا تھا۔ پرچوں کا نہ ملنا میرے لئے معمہ تھا۔ بہرحال زیادہ تر مکارم سلمہ کی تنہائی اور بیماری کی وجہ سے پھر مونگیر کی واپسی ممکن نہ ہوئی۔

اب پرچوں کی داستان سنئے۔ خورداد پورا گذر گیا، اور پرچے ندارد، بالآخر رجسٹرار کو تار دیا، خطوط لکھے۔ انھوں نے تمام سنٹروں کو مطلع کیا۔ تقریباً آخر میں خدا جانے کہاں کہاں کی ٹھوکریں کھا کر ورنگل، اورنگ آباد، گلبرگہ شریف کے پرچے مجھے ملے ہیں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ذات علم وعمل کی جامع، فکر وتدبر کی مثال، خلوص وللہیت کا مرقع، اور یوثرون علی انفسہم ولو کان بہم خصاصۃ کا نمونہ تھی۔ ۱۰ر شوال ۱۳۵۹ھ مطابق نومبر ۱۹۴۰ء کو راہی ملک بقا ہوئے۔ مزار مبارک پھلواری شریف ضلع پٹنہ میں ہے۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

[۱] حیدرآباد کا فصلی مہینہ ۱۲۔

وہ حیدرآباد آکے، حیدرآباد سے مرکزوں کو واپس ہوئے، پھر آئے، پھر گئے۔ اس کے بعد دوبارہ ان پر لفافے لگا کر اب گیلانی پہونچے، تاریخ ارسال نتائج کی گذر چکی تھی۔ تاہم اب ان سے فرصت ملی ہے۔ دیکھئے اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ تاخیر کے اسباب اب تک متعین نہیں ہیں، ہیں تو اسے صرف حضرت کا ایک تصرف خیال کر رہا ہوں۔ زندگی میں پہلی بار یہ واقعہ پیش آیا۔ اور صرف حیدرآباد ہی کے نہیں بلکہ مسلم یونیورسٹی کے میٹرک کا بھی ایک پرچہ اس سال میرے متعلق تھا حالانکہ سوالات جس وقت میں نے بھیجے تھے اس وقت لکھ دیا تھا کہ ۲۰ر اپریل کے بعد میں گیلانی میں رہوں گا، لیکن دفتر مسجل کی آنکھوں پر غشاوہ اوڑھا یا گیا۔ اور اس نے ریلوے پارسل کے ذریعہ سے حیدرآباد بھیج دیا۔ حیدرآباد ہو کر اس کی بلٹی مجھے یکم مئی کو گیلانی میں ملتی ہے حیران ہو گیا کہ ریلوے پارسل تو ری ڈائرکٹ بھی نہیں ہو سکتا۔ بے چارے عبدالقدوس کو تین روپے کا تار دیا کہ چھڑا کر بذریعہ ڈاک بھیج دو۔ بمشکل ۸ر مئی تک یہ کارروائی پندرہ روپے مصارف کے بعد انجام پائی۔ اور یہی آخری تاریخ ارسال نتائج کی تھی، کن کن دقتوں سے دو تین دن میں اس کام کو انجام دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بعد صحت نے پھر ساتھ چھوڑا۔ دمہ شروع ہوا، اور اتنا مسلسل کہ شاید ایک مہینہ سے زائد دن ہوئے ہیں کہ اس کا کم وبیش اثر اب تک جاری ہے۔ بیچ بیچ میں بہت تیزی ہو گئی تھی۔ تاہم سرد چیزوں کے استعمال سے پھر گونہ سکون پا رہا ہوں۔ اتنا سکون کہ خط لکھ رہا ہوں۔ اس کے ساتھ ایک لطیفہ یہ ہوا کہ ہمارے ایک عزیز اینٹ بنوا رہے تھے مجھے بھی اپنے مکان کے کچھ تکملہ کے لئے اینٹوں کی ضرورت تھی، ان ہی کے ساتھ شریک

ہوگیا تھا۔

خدا جانے اودھ کا کیا حال ہے۔ بہار میں تو جب سے آیا ہوں مسلسل بارش کا سلسلہ جاری ہے۔ اپریل اور مئی گویا برسات کے مہینے ہوگئے، اس کا نتیجہ اور کچھ ہوا یا نہیں لیکن کچی اینٹوں کی تھاک مسلسل گلتی رہی، اور خوب گلی، وہ اینٹ کیا گلی، روپے گلے۔ تاہم خرابی بسیار کے بعد اب بھٹہ لگ گیا ہے۔ یہ ہے تفصیل اس داستان کی، جس کی خبر زندگی کی خبر کے بعد دے رہا ہوں۔

وما الحیٰوۃ الدنیا الا متاع الغرور[1] (الحدیث)

کے سوا اس زندگی کو اور کیا سمجھوں۔ اب دشواری یہ ہے کہ روپے جو ساتھ لایا تھا کچھ تو ڈاکٹر صاحب و حکیم صاحب لے گئے، کچھ کھایا گیا، کچھ اینٹ کی نذر ہوئے، ہمیشہ دستور تھا کہ آخری تعطیل میں مجھے امتحانات کی رقم شیخ امام صاحب[2] کی مہربانی سے مل جاتی تھی۔ لیکن اس سال میرے معاملات ایسے الجھے ہوئے ہیں کہ اب حیدرآباد پہونچنے سے پیشتر اس رقم کی امید موہوم ہے، علی گڈھ والے بھی ایسے فیاض نہیں ہیں۔ حیدرآباد اور علی گڈھ وغیرہ کی رقم ملا کر تقریباً چار سو کلدار کی توقع تو ہوگئی ہے لیکن ان سماوی وارضی وکراماتی تصرفات کا کیا کروں۔ آپ بھی تنگدست ہوچکے ہیں۔ بالکل متحیر ہوں کہ کدھر رخ کروں۔ آج دس روپے کا آخری نوٹ رہ گیا ہے۔ ادھر اُدھر لکھتا ہوں دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ آپ بھی خیال میں رکھئے۔ خود تو

---

[1] دنیاوی زندگی محض دھوکا کا سامان ہے۔ ۱۲

[2] عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن کے مرحوم محاسب۔ ۱۲ (ع)

کیا دے سکتے ہیں، لیکن اگر کسی ذریعہ دو سو روپے بندوبست کر سکتے ہوں تو بذریعہ تار منی آرڈر کے بھیج دیجئے گا۔ تنخواہ پر نہیں، بلکہ معاوضہ کی رقم پر مبنی ہے۔ اس لئے یہ خطرہ کہ کب تک حیدرآباد واپس ہوتا ہوں، اس میں نہیں ہے۔ سرد دوائیں حبیب سے استعمال کر رہا ہوں۔ دمہ میں کمی ہے۔ لیکن ازالہ نہیں ہوا ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ واپسی غالباً لکھنؤ سے ہوگی۔ آم کا کیا حال ہے۔ ادھر تو قحط ہے۔ اودھ میں تو بڑا زور تھا۔ گٹھلی جاتی تو اس کے عوض میں آم آتا۔ مکارم بیچارہ تو ایسا مجہول الحال ہوگیا ہے کہ اب تک اس سے نہ بن پڑا۔ اسٹیشن کی دوری کو بھی اس میں دخل ہے، ستلی کی قیمت آج کل ۵ سیر فی روپیہ ہے اب آپ نے ممانعت کر دی ہے لیکن کیا ضرور ہے، کہ اب نہ جائے۔ میں پھر بھی بھجوانے کی کوشش میں لگا رہوں گا۔

حضرت الغازی السالار[1] رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت گرامی میں سلام فرما دیجئے۔ شاید ثم اقدام کی سعادت نصیب ہو۔ ڈاکٹر صاحب سے سلام فرما دیجئے۔ دعا کا طالب ہوں۔ برادرم شعیب سلمہ کو سلام و دعا۔ صبیحہ سلمہا کا حال نہیں لکھا۔ مولینا سرور صاحب شاید تعطیلوں میں لکھنؤ آئے ہیں اگر میں یاد ہوں تو کہہ دیجئے گا ایک بدبخت دہقانی کا سلام ولقا قبول فرمائیں حضرت والدہ قبلہ مدظلہا کی خدمت میں سلام عرض کر دیجئے۔ فقط

مناظر احسن گیلانی

---

[1] مولینا مسعود علی ندوی کو ان کے بے تکلف احباب سالار غازی کے لقب سے یاد کرتے تھے، مکتوب الیہ ہی نے اس بے تکلفی کی ابتدا کی تھی۔ البتہ اس نے سالار کا لقب حضرت سید سلیمان صاحب رحمۃ اللہ کے لئے اختیار کیا تھا اور غازی کا مولانا موصوف کے لئے۔ پہلا چلا نہیں دوسرا چل گیا۔ ۱۲ (ع)

۲۸ راپریل ۱۹۳۴ء مطابق ۱۲ محرم ۱۳۵۲ھ

رفیقی الکریم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

۱۹ راپریل کو آپ سے رخصت ہونے والا مسافر آج پورے دس دن پر اس عریضے کے ارسال کی توفیق پا رہا ہے میں نے اپنے خیر مطمئن وطن پہونچنے کی خبر ریلوے کارڈ سے دی تھی۔ جو برادرم شعیب سلمہ کے نام لکھا تھا۔ اس کے بعد کیا عرض کروں کہ کیا گذری۔ بہار کے علاقہ میں داخل تو رات میں ہوا لیکن صبح کیول ہیں ہوئی۔ اس کے بعد میں تھا میری دونوں آنکھیں تھیں اور ریل کے دونوں طرف کے درختانِ انبہ تھے۔ مایوسی اور کیسی مایوسی، بقول میاں مکارم کے اہانت کی حد تک واقعات جا پہونچے تھے۔ ڈر کے مارے آم کی خیریت کسی سے نہیں پوچھتا تھا۔ خدا جانے کیا خبر دے گا۔ لیکن بتدریج خود مجھ پر یہ حقیقت واضح ہونے لگی کہ اس سال بہار نے نامرادی اور بے ثمری میں بھی زلزلہ[1] سے کم تماشا نہیں پیش کیا۔ صرف ہرے ہرے پتوں سے لدے درخت سڑک کے دونوں جانب تھے لیکن ان کی شاخوں میں اس کا بھی اثر نہ تھا کہ ان میں کبھی بور بھی آئے تھے، گویا اسوک یا مولسری کے درخت تھے خدا خدا کرکے گیلانی میں ٹھہرا ہوا غلط خیال تھا کہ سارے صوبہ کے مقابلے میں شاید کسی کو مستثنیٰ کیا گیا ہو تخمی اور قلمی ہر قسم کے درخت پھلوں سے معریٰ تھے۔ دل تھام کر بیٹھ گیا۔ ہر شاخ کے نیچے آپ نظر آتے تھے۔ آپ کی چارپائی اور لنگڑے کے لٹکے ہوئے پھل لیکن تصور تصدیق سے بیگانہ تھا۔ جی میں آیا کہ آپ کو اس حادثہ کی خبر نہ دوں، شاید گیلانی کو دھوکہ میں شرفِ قدوم کی سعادت میسر آجائے لیکن سچی بات یہ ہے

[1] بہار کا مشہور قیامت خیز زلزلہ جو جنوری ۱۹۳۴ء میں آیا تھا۔ ۱۲ (ع)

کہ اگر غلط بیانی کی کچھ بھی گنجائش ہوتی تو ایسا گذرتا۔ خدا جانے اب آپ کے بہار کے ارادہ پر کیا گذرتی ہے[1]۔ بمشکل چند درختوں میں چند پھل پتوں کے اندر دبے چھپے نظر آتے ہیں اس پر آندھی کی یہ حالت ہے کہ ٹٹول ٹٹول کر انھیں بھی ختم کر رہی ہے۔

میں یہ خط دوسرے تیسرے دن آپ کو لکھتا لیکن اس عرصے میں یکایک مجھے قریب کے دیہاتوں میں جانا ہوا۔ بدپرہیزیاں ہوئیں اور ایک شدید دورہ دمہ کا آ دھمکا۔ چار دن تک اس میں پریشان رہا میں نے تاڑ کے تیرے[2] کو بھی استعمال کیا۔ لیکن یہ دورہ اسی کے بعد پڑا، دل چھوٹ گیا، چھوڑ دیا۔ بحمداللہ آج سے طبیعت کچھ اچھی ہے۔ امید ہے کہ آپ بھی مع الخیر ہوں گے۔ اعظم گڈھ کے متعلق کیا ہوا حضرت غازی تو جا چکے ہوں گے، ہوں تو سلام فرما دیجئے۔ ڈاکٹر صاحب کی خدمت والا میں بھی سلام عرض کر دیجئے، اگر ملاقات ہو۔ ان شاء اللہ تعالیٰ آپ نے تعمیر مسجد کے خیال کو اور پختہ کر لیا ہوگا۔ خدا کرے کہ وہ زمین آپ کو مل جائے، میرے دل کو لگ گئی ہے۔ والدہ صاحبہ قبلہ کی خدمت میں سلام فرما دیجئے برادرم شعیب صاحب کو میری طرف سے بہت بہت دعا، کہ ہر دفعہ ان کو میری وجہ سے خاص کلفت اٹھانی پڑتی ہے۔ البتہ کنجی جس میں طالب علم کا سب سرمایہ تھا اس نے میری بہت سی ضرورتوں کو مقفل کر دیا ہے۔ تالا تو کھلوا لیا گیا ہے لیکن جب دانت میں کوئی چیز پھنستی ہے تو کنجی یاد آتی ہے، کان کھجاتے ہیں تو کنجی یاد آتی ہے چاقو کی ضرورت

[1] آموں کے رسیا مکتوب الیہ نے آموں کے موسم میں گیلانی حاضر ہونے کا ارادہ کیا تھا ۱۲ (ع)

[2] جس میں نشہ نہیں ہوتا۔ ۱۲ (ع)

ہوتی ہے تو کنجی یاد آتی ہے[1]۔

سنا! وہ مگھی پان جس کے ساتھ جناب نے نیا نیا عشق[2] فرمایا، اس موسم گرما میں خدا جانے کیوں آٹھ آنے ڈھولی ہوگیا۔ آم سے خربوزوں کا تبادلہ تو ممکن نہ ہوا پھر کیا پان سے بیوپار کرنے کے لئے تیار ہیں؟ انشاء اللہ تعالیٰ کہیں نہ کہیں سے آپ کے پاس ایک ٹوکرا پان کا تو پہونچ ہی جائے گا۔

محی الدین[3] سلمہ اچھا ہے۔ آداب عرض کرتا ہے۔ فقط والسلام

مناظر احسن گیلانی

---

۲۳ مئی ۱۹۳۴ء مطابق ۷ صفر ۱۳۵۳ھ

محراب الہدایت والارشاد، گیلانی

رفیقی الکریم! دمتم بالسعادۃ   السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

تقریباً گاؤں کے تمام شرفاء اور اپنے تابعین (مسلمین و کافرین) کی طرف سے اس لذت بخشی کا شکریہ ادا کرنے حاضر ہوا ہوں کہ صحرا میں بھی کسی نگاہ کرم نے وہ چیز پہونچا دی جس سے اکثر

---

[1] کنجی کے گچھے میں یہ سب آلات بھی رہے ہوں گے۔ ۱۲ (ع)

[2] مکتوب الیہ پان کا عادی تو کبھی نہیں رہا۔ شاید مولانا کے فیض صحبت سے کچھ دن کے لئے ان کے وطن کے مگھی پان کا ذوق ہوگیا تھا۔ ۱۲ (ع)

[3] مولانا کے صاحبزادہ سلمہ، جو اب پاکستان میں اچھے منصب پر ملازم ہیں ۱۲ (ع)

لوگ محروم تھے۔ شاید ۶۳ دانے سفیدے کے نہایت عمدہ حالت میں گیلانی پہونچ گئے۔ فالشکر لمنعمہ ومرسلہ ولناظمہ، وللذین سعوا فی ھذا الخیر باحسان۔

برادرم شعیب سلمہ کو مبارکباد عرض کرتا ہوں کہ خوش نصیبی سامنے آئی اور نہایت اچھی حالت میں آپ کے حُسن تدبیر سے خربوزے گیلانی بروز اتوار پہونچ گئے۔ اسٹیشن سے لانے والے نے برف بھی خرید لیا، لطف دوبالا ہوگیا۔ بے چارہ مکارم جس کا نام "سلی فراموش" اب میں نے رکھدیا ہے، سخت نادم ہے۔ اور اب ندامت بیکار ہے کہ دام ہی چڑھ گیا ہے۔ دوشنبہ کو بلٹی اس وقت ملی جس وقت ہضم کے سارے مراتب طے کر کے کیمیائی تغیرات کے لئے لکھنو کا خربوزہ گیلانی کی مٹی میں مل چکا تھا۔

کہئے! اگرمی کا آپ کے یہاں کیا حال ہے، بندہ تو نو بجے سے زیر پنکھا اس ٹٹی[1] کے ساتھ جو برادرم شعیب سلمہ کا عطیہ ہے داخل ہوجاتا ہے۔ ظہر سے پہلے ٹٹی پر پانی نہیں دیتا ہوں۔ لیکن دو بجے ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر پھر پانچ تک اللہ تعالیٰ بڑی خنک ہوا میں گذار دیتے ہیں۔ ـــــ خدا کرے کہ اس کے بعد بھی دل میں کسی دیہاتی زندگی کے تماشا کا شوق پیدا ہو۔ آج کل بحمد اللہ دو ایک دن سے بلغم میں کمی ہے۔ پٹنہ کا سفر ایک آگے ہفتہ کے لئے ملتوی ہوگیا۔ وزیر صاحب بیمار ہوگئے ہیں۔

خاص امر یہ عرض کرنا ہے کہ رخصت کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔ خلیفہ[2] کے

---

[1] خس کی ٹٹی۔ ۱۲ (ع)

[2] ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم مرحوم ۱۲

مسئلہ نے ولی الدین[1] کے پیچیدہ مسئلہ کو اور پیچیدہ کر دیا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے۔ کیا یہ بہتر ہوگا کہ حضرت مولینا[2] اور حضرت تھانوی سے استشارہ کیا جائے۔ اور حضرت اعلیٰ (اللہ تعالیٰ) سے استخارہ۔ جیسے جیسے تعطیل کے دن ختم ہو رہے ہیں خود اپنے عزم میں جزم کی کیفیت کو مضمحل ہوتا ہوا پا رہا ہوں۔ ماجد میاں کا خط آیا تھا کہ پھر سخت بیمار ہو گئے تھے۔ اور کیا عرض کروں۔ گیلانی میں بھی کوئی نہ کوئی فتنہ پیدا ہو ہی جاتا ہے۔ یہ مسئلہ کہ میرے مکان پر ہر شخص دعویٰ کیوں کر دیا کرتا ہے۔ اس کا نظارہ تو آپ نے حیدرآباد میں کیا[3]۔ اور اس کے سامنے اپنے کو جھکا بھی دیا۔ گیلانی میں ایک صاحب نے اپنے مسلول بھانجے کو میری نشست گاہ میں لا کر پھینک دیا جو ہر وقت اپنے بلغم اور دوسرے تمام فضلات کی اشاعت میں مصروف تھا۔ ڈیڑھ مہینہ کے صبر کے بعد بالآخر کہنا پڑا۔ لیکن دل بے چین ہو۔ عجب حال ہے وہ صاحب الگ برہم ہیں۔ نعوذ باللہ من الفتن ما ظہر وما بطن۔

مناظر احسن گیلانی

---

[1] ڈاکٹر میر ولی الدین عثمانیہ یونیورسٹی میں شعبۂ فلسفہ کے موجودہ صدر ۱۲

[2] حضرت شیخ الاسلام مولینا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ ۱۲

[3] جی ہاں مولینا کا خاص حال و مزاج یہی تھا۔ مکان کیا پلنگ پر بھی کوئی قبضہ کر لیتا تو اس کو ہٹانے کی ناراضگی نہیں گوارا فرما سکتے تھے۔ حج میں سفری پلنگ ساتھ تھا، اس پر کئی کئی کابلی لد کر بیٹھ جاتے خود اٹھ جاتے مگر شدید ناگواری کے باوجود ان کو کچھ نہ فرماتے۔ ۱۲ (ع)

۳۰ جون ۱۹۳۴ء مطابق ۱۶ ربیع الاول ۱۳۵۳ھ

محرابِ الہدایت والارشاد، گیلانی

رفیقی الکریم! فی الدنیا والآخرہ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آپ خوب کترا کر نکل گئے۔ اور الزام سب سیدوں کے سر۔ مجھے تو قطعاً آپ کا کوئی خط اس مضمون کا نہیں ملا، کہ اس کے بعد وہ اس گھر میں نعرۂ مستانہ لگاتا۔ ہاں ایک وہمی سا احتمال کسی گذشتہ مکتوب میں اسی کا دلایا گیا تھا۔

البتہ رانچی سے جب واپس ہوا تو برادرم شعیب سلمہٗ کا ایک کارڈ اس مضمون کا ملا تھا کہ بھائی صاحب نے تھانہ بھون سے اطلاع دی ہے کہ واپسی براہ بہار ہوگی اس کے بعد دسنہ[1] کے سید نے دستی خط میں واپسی رانچی کے بعد ہی اس کا مژدہ سنایا تھا ـــــ

---

[1] دسنہ ضلع پٹنہ کا مشہور گاؤں ہے جو قصبہ بہار شریف ضلع پٹنہ سے آٹھ میل شمال مشرق میں واقع ہے اہل علم اور ارباب کمال کا مسکن ہے۔ یہاں کے سادات کے مورث اعلیٰ حضرت سید صدرالدینؒ غالباً شاہ فرخ سیر کے عہد میں آگئے ہیں۔ اس سے پہلے معمولی قسم کے ہندؤوں کی بستی تھی آبادی قدیم ہے کہیں کہیں جین اور بودھ کے آثار پتھروں، مورتیوں اور اینٹوں کی شکل میں نکلتے ہیں۔ یہ گاؤں ندیوں سے گھرا ہوا ہے اس لئے برسات کے موسم میں آمد و رفت میں دشواری ہوتی ہے۔ دسنہ والوں کو تعمیرات کا بھی شوق اور سلیقہ ہے پختہ مکانات اور خوبصورت بنگلے اس قدر دوسرے مواضعات میں دکھائی نہیں دیتے، پوری آبادی ایک چہار دیواری سے گھری ہوئی ہے جس کو شہر پناہ کہہ سکتے ہیں۔

یہاں کا اُردو کتب خانہ (الاصلاح) قابل قدر اور لائق مطالعہ ہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

مکان دکان سب صاف کرا کے بیچارے مکارم نے رکھا۔ اور علامہ فلسفی الصوفی[1] کا درود لکھنؤ سے "اس کا پوسٹر" بھولے کاغذ میں تفضلاً اپنے ہم چشموں میں بانٹنا شروع کیا تھا لیکن محرم اسرار جانتا تھا کہ جو مرا کے نمازِ جنازہ کو جائز نہ سمجھتا ہو، وہ جنازہ پر کیا آئیں گے۔ اور یہی ہو کر رہا۔ باقی الزام تو ہمیشہ بنی ہاشم کے سر تھوپا ہی گیا۔ کوئی نئی بات نہیں۔ اللہ کی کریمی نہ ہوتی تو کیا کروں، گو اس کا افسوس ہے کہ غریب مکارم خواہ مخواہ اب مضحکۂ اغیار بنا ہوا ہے۔ خیر دسمبر میں اس کی کسر انشاء اللہ نکالنی ہوگی۔ آم ہی کے وجود سے ورود مسعود کیوں شروع ہو۔ انشاء اللہ اس وقت شاید اس سے بھی بہتر چیزیں میسر آسکیں۔

اب سنئے افسانۂ رانچی، آپ کے خیالات معلوم نہیں کہاں کہاں گئے۔ وظیفہ بھول اور روانگی رانچی کے درمیان کی کڑیوں کی یہ راجمین بالغیب جن کا نام فیلسوف ہے یوں ہی پوری کرتے ہیں۔ مولوی سہول صاحب[2] کی جگہ کے متعلق معلوم بھی ہے کہ تخفیف پاکر صرف

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اور بعض حیثیت سے اپنی نظیر آپ ہے۔ یہی گاؤں حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا مولد و مسکن ہے۔ اور "دسنہ کے سید" سے آپ ہی مراد ہیں ۱۲۔

[1] کسی قوی عذر ہی سے مکتوب الیہ حاضر نہ ہو سکا ہوگا۔ ورنہ گیلانی شریف سے محرومی آسانی سے گوارا نہ کی جاتی۔ ۱۲ (ع)

[2] پورینی ضلع بھاگلپور آپ کا وطن ہے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اور پھر شہر بھاگلپور میں حضرت قدوۃ العارفین مولینا شاہباز محمد کی خانقاہ واقع ملاچک میں مولانا شاہ اشرف عالم سجادہ نشین خانقاہ سے پڑھتے رہے۔ خانقاہ کی طرف سے دونوں وقت صرف (باقی اگلے صفحہ پر)

ایک سو چالیس کی ہوگئی ہے۔ کیا اس کے بعد بھی کسی خیال کی گنجائش ہے۔ واقعہ صرف

(بقیہ صفحہ گذشتہ) تین تین چھٹانک چاول اور کچی ماش کی بھوسی بھری دال جس میں صرف نمک اور پانی ہوتا تھا، ملتی تھی۔ پھر کان پور گئے اور مدرسہ جامع العلوم میں حضرت مولینا اشرف علی تھانوی[رح] حضرت مولینا حافظ محمد اسحٰق بردوانی وغیرہ اور مدرسہ فیض عام میں رہ کر مولینا محمد فاروق صاحب[رح] چریا کوٹی سے درس لیا۔ اور حضرت مولینا احمد حسن کان پوری[رح] اور مولانا نور محمد پنجابی وغیرہ سے بھی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد استاذ العلماء مولینا لطف اللہ صاحب[رح] علی گڑھی مفتی عدالت عالیہ حیدرآباد دکن کے درس میں شریک ہونے کی خاطر کانپور سے حیدرآباد پیدل گئے۔ اور خود نوشت سوانح میں لکھا ہے کہ مہالکۂ عظیمہ میں مبتلا ہوتا ہوا دو ماہ میں حیدرآباد ہزاروں دشواری کے ساتھ پہونچا۔ وہاں ڈھائی سال رہ کر حضرت استاذ العلماء اور مولینا عبدالوہاب بہاری[رح] سے منطق، فلسفہ، ہیئت، ادب، اصولِ فقہ کا درس لیا۔ حیدرآباد سے دہلی آئے اور مولینا سید نذیر حسین مونگیری[رح] کے درس میں شریک ہوئے۔ دہلی سے دارالعلوم دیوبند آئے اور حضرت شیخ الہند مولینا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ سے درس لیا۔ دارالعلوم سے فراغت کے بعد سات آٹھ سال دارالعلوم دیوبند میں مدرس رہے۔ پھر مدرسہ عزیزیہ بہار شریف، مدرسہ عالیہ کلکتہ، مدرسہ عالیہ سلہٹ میں صدر مدرس اور شیخ الحدیث رہے۔ سنہ ۱۹۲۰ء سے مسلسل سولہ سال تک مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے پرنسپل رہے۔ اس طرح چھیالیس برس تک یوپی، بہار، بنگال اور آسام کے بڑے بڑے مدارس میں تدریس کے فرائض انجام دیئے۔ ۲۳ مئی ۱۹۴۸ء مطابق ۱۲ رجب ۱۳۶۷ھ کو وصال فرمایا۔ مزار اپنے وطن پورینی ضلع بھاگلپور میں ہے ۱۲۔

اتنا تھا کہ مدرسہ شمس[1] الہدیٰ کا ایک جدید نصاب وزیر تعلیمات[2] کے آگے پیش ہوا تھا وقائوۃ العصار کمشل الصدیقی و ڈاکٹر عظیم الدین[3] وغیرہم نے حکومت بہار پر

---

[1] الحاج سید محمد نور الہدیٰ صاحب مرحوم، جج نے ۱۹۱۲ء میں اپنے والد کے نام پر مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ قائم کیا۔ دو ڈھائی لاکھ قیمت کی اپنی جائداد مدرسے پر وقف کی، اس کے لئے عمارت بنوائی جو آج بھی موجود ہے اور شیش محل کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ مدرسہ کا نصاب ۱۹۲۳ء تک درس نظامی تھا۔ ۱۹۲۰ء میں جج صاحب مرحوم نے مدرسہ جائداد و مکان کے ساتھ حکومت بہار کے حوالہ کر دیا۔ اس شرط کے ساتھ کہ مدرسہ کا نصاب مذہبی اہل سنت والجماعت کے مسلک کے مطابق ہوگا۔ اس وقت سے اب تک اساتذہ اور ملازمین کے کل اخراجات حکومت کے ذمہ ہیں۔ اور وقف کی آمدنی سے مستحق طلبا کو وظیفہ طعام ملتا ہے شرائط کے مطابق اس وقت وقف کے متولی مسٹر محمد شریف صاحب بیرسٹر جج صاحب مرحوم کے بھانجے ہیں۔ مدرسہ کا موجودہ نصاب دلچسپ ہے۔ صرف، نحو، فقہ، حدیث، تفسیر اور مختلف علوم و فنون کی کتابوں کے منتخبات رکھے گئے ہیں اور عصری تعلیم میں تاریخ جغرافیہ، حساب، اقلیدس اور انگریزی زبان کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اور اب ہندی بھی پڑھائی جاتی ہے ۱۲۔ [2] مسٹر عبدالعزیز بیرسٹر وزیر تعلیمات بہار ۱۲

[3] ۲۵ جون ۱۸۸۰ء کو پٹنہ سیٹی کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی پھر ایم اے کیا اور پٹنہ کالج میں فارسی کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ پھر جرمنی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ اور پٹنہ یونیورسٹی کے اردو فارسی اور عربی شعبوں کے صدر مقرر ہوئے اردو شاعری خصوصاً میر، مومن اور آسخ کا بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ کچھ تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں جو شاید ابھی تک مرتب نہیں کئے گئے ہیں۔ شاعر بھی تھے اور ان کا مجموعۂ کلام "گل نغمہ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ۱۹ مئی ۱۹۲۹ء کو وفات پائی۔

بار ڈال کر تیار کیا تھا۔ جدید منسٹر کو ان لوگوں پر اعتماد نہ تھا۔ اس لئے ایک دیوبند دوسرا ندوہ کا مولوی[1] خانگی طور پر بلایا گیا تھا کہ اپنی رائے کا اظہار کرے۔ رانچی میں اس کام کے لئے ہم دونوں کو ایک ہفتہ گذارنا پڑا۔ اس نصاب کو تو پھاڑ کر پھینکوا دیا۔ لیکن جو جدید نصاب دیوبندی ندوی نے پیش کیا ہے وہ بھی نہ دیوبندی ہے نہ ندوی۔ میرزاہد رسالہ کی جگہ مسائل فلسفہ اور صدرا کی جگہ تاریخ فلسفہ، ہدیہ سعیدیہ کی جگہ افکار حاضرہ نیوتنی[2] کو جگہ دی گئی ہے۔ اور انگریزی کا نصاب انٹرمیڈیٹ کے مساوی کر دیا گیا ہے۔ قیاسی منطق کے ساتھ استقرائی کو بھی شریک کیا گیا ہے اور شرح تہذیب کی جگہ "نفسیات" کی ایک کتاب، عالم یا بی اے تک دو دفعہ درس قرآن و دو دفعہ حدیث، دو دفعہ فقہ پڑھائی جائے گی۔ فاضل کے درجہ کو اختصاص کر کے تفسیر، حدیث، فقہ، کلام، ادب عربی کے دورے قائم کئے گئے ہیں۔ یہ ہے ان مساعی کا حاصل، جو وہاں ہوا یہ تو باہر میں ہوا۔ اندر کی سنئے۔

گیلانی سے رانچی دو سو میل بجانب جنوب دو ہزار فٹ کی بلندیوں پر واقع ہے۔ موٹر پر ایسی زبردست چڑھائی دو بیماروں کو کرنی پڑی۔ رانچی شملہ بنا ہوا تھا۔ پہونچتے ہی مجھے تو ضیق کے دورے نے پکڑا۔ سید صاحب[3] ابتدا میں تو اچھے رہے لیکن واپسی سے ایک دن پیشتر سوء ہضمی کے

---

[1] خود مولانا گیلانی اور سید سلیمان صاحب رحمہما اللہ ۱۲ (ع)

[2] نصیر احمد صاحب استاد طبیعیات جامعہ عثمانیہ (متوطن نیوتنی ضلع اناؤ) کی کتاب "مسائل فلسفہ" اور تاریخ فلسفہ جامعہ عثمانیہ کے سررشتہ تالیف و ترجمہ کی کتابیں ہیں ۱۲ (ع)

[3] حضرت مولانا سید سلیمان صاحب رحمۃ اللہ علیہ ۱۲ (ع)

شدید حملہ میں مبتلا ہوئے، ایک دن سفر صرف ان کی وجہ سے ملتوی ہوا۔ بخار بھی آگیا تھا، بارے دوسرے دن چل پڑے۔ اب چڑھائی نہ تھی، اتار تھا۔ تاہم دو سو میل کی مسافت کافی تھی اور موسمی انقلاب کے متضاد دقلوں سے گذرنا پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا، دسنا آکر سید صاحب گرے۔ اور کامل ایک ہفتہ بخار میں غوطہ زن رہے۔ سنا کسی نے میعادی تجویز کیا تھا لیکن اب بحمد اللہ اچھے ہیں۔ لیکن بیچارا گیلانی نہ اچھا ہے نہ بیمار، اور جنوب کا دوسرا سفر درپیش۔ کامل بیمار ہوتا تو بیٹھ ہی جاتا۔ لیکن ہمسایوں کی شماتت اس کی بھی اجازت نہیں دیتی۔ بہرحال جانا ہی ہوگا۔

آپ کا کارڈ پرسوں ملا۔ پاندان لینے کے لئے لکھنؤ کا قصد صمیم کر رہا تھا۔ اندازاً اپنی طبیعت کا اندازہ کرتا رہا کہ کیا رنگ رہتا ہے۔ لکھنؤ کی طرف سے لوٹنے میں ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ تقریباً دن بھر کیول اسٹیشن پر پڑا رہنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد دوسرے دن لکھنؤ پہنچنا لکھنؤ سے جھانسی میں اترنا، جھانسی سے قاضی پیٹ میں اترنا، گویا چار تبدیلیاں ہیں اور براہ گیا، از گیا تا منماڑ از منماڑ تا حیدر آباد۔ نیز سید محی الدین سے اسٹیشن اورنگ آباد پر ایک ضرورت خاص سے ملنا بھی ضرور۔ اپنے آپ سے لڑتا رہا، لکھنؤ کے ارادے کو شکست ہوئی اور گردن جھکا کر عرض کرنا پڑتا ہے کہ گیا ہی کی راہ سے اجازت مرحمت فرمائیں۔ پاندان کسی آنے جانے والے کے ذریعہ حیدر آباد بھیجد یجئے گا۔ البتہ کام کے اعتبار سے حیدر آباد کی موجودہ صورت کے متعلق آپ کچھ کہتے سنتے، اس کا موقع ہاتھ سے جاتا ہے لیکن تحریر کے ذریعہ سے یہ مراحل بھی بآسانی طے ہو سکتے ہیں۔ آپ جو کچھ بھی ہدایت دیتے ہیں لکھ کر حیدر آباد بھیجد یجئے۔

انشاء اللہ تعالیٰ اسی طرح عمل ہوگا۔

آپ کی ترک رفاقت سے دل بیٹھا جا رہا ہے دل کو تسلی اس خیال سے دلا رہا ہوں کہ زیادہ سے زیادہ ماہ آبان[1] تک ہو آؤں۔ آبان کے بعد کیوں نہیں میں بھی براہ لکھنؤ گیلانی بھاگ آؤں۔ یہ طے کر چکا ہوں۔ اب کی بجائے جامعہ عثمانیہ کے منظر عام کے گوشۂ تنہائی میں جگہ انشاء اللہ تعالیٰ پکڑوں یعنی فنون سے جنون[2] کی راہ لوں۔ اور دبے پاؤں نکل بھاگوں۔ فنون میں غل مچ جاتا ہے۔ مولوی فضل سلمہٗ اور اختر صاحب کا بھی خط آیا ہے کہ ابھی جدید عمارت میں کالج نہ جائے گا، اب بعد آبان کے خبر ہے۔

دیوبند میں کیا ہو رہا ہے، کیا ہو سکتا ہے کیا اس کے متعلق کچھ خبر دے سکتے ہیں میاں اختر نے لکھا ہے کہ صاحب مکان نے سیڑھیوں اور کواڑوں پر رنگ کرایا ہے ان کو اضافہ کرایہ کا وسوسہ ہے۔ اگر ایسا ہوا تو سلام عرض کرنا پڑے گا۔ وافوض امری الی اللّٰہ ان اللہ بصیر بالعباد[3]۔ (المومن)

---

[1] حیدر آباد کا فصلی مہینہ ۱۲۔

[2] شعبۂ فنون (آرٹس) کے مقابلہ میں شعبۂ دینیات کو یہ لقب مولوی سلیم صاحب مرحوم (مسلم گزٹ) کی ظرافت نے دیا تھا۔ جو جامعہ عثمانیہ میں اردو کے پروفیسر ہو گئے تھے۔ مولینا کا ابتدائی تقرر شعبۂ دینیات ہی میں ہوا تھا۔ پھر دینیات لازمی کی تعلیم کے لئے شعبۂ فنون میں منتقل ہو گئے تھے اور آخر میں پھر دینیات ہی میں مستقلاً منتقل ہو کر اسی کی صدارت سے وظیفہ یاب ہوئے ۱۲ (ع)

[3] اور میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں خدا تعالیٰ سب بندوں کا نگران ہے۔ ۱۲

آموں کا قحط تو گذر چکا، اب بارش کے قحط کا سامان ہے، جون کی ۳۰ ہے۔ لیکن چند معمولی چھونگری کے سوا رحمت رب کی توجہ نہیں ہوئی ہے۔ واللہ غالب علی امرہ ولکن اکثر الناس لا یعلمون[1] (یوسف)۔

اور کیا عرض کروں۔ ادھر کچھ بخار پھیلا ہوا ہے۔ سب بچے بیمار ہو گئے تھے اب اچھے ہیں۔ مکارم سلمہ سلام عرض کرتے ہیں اور سفارش کرتے ہیں کہ بھائی صاحب کو اب کی گیا ہی سے جانے کی اجازت دیدیجئے اس میں زیادہ آسانی ہے۔ وہ مرشد آبادی[2] کیا ہوا ؟ آپ نے کچھ خبر نہ دی۔ اپنی والدہ محترمہ مدظلہا سے سلام عرض کر دیجئے۔ اور عزیزان صبیحہ و شمس[3] الباری سلمہا کو دعا۔ ان کی والدہ کو سلام۔ برادرم شعیب سلمہ کو دعا، سعدیہ اور ان کے بھائیوں کو دعا۔ ڈاکٹر صاحب سے میری اس غداری کا ذکر ذرا ڈھیلے لفظوں میں خدا کے لئے کیجئے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ اکتوبر میں ایک آدھ ہفتہ رہ کر صحبت کے آثار فیوض سے سرفراز ہوں گا۔ اب تو جانے دیجئے سہولت اسی میں ہے۔ گیلانی نہ آنے کا انتقام نہیں ہے

مناظر احسن گیلانی

---

[1] اور اللہ تعالیٰ اپنے کام پر غالب ہے۔ لیکن اکثر آدمی نہیں جانتے۔ ۱۲

[2] مکتوب الیہ کو حیدرآباد میں مرشد آباد کا ایک نوجوان بڑا کارگذار خادم ہاتھ آگیا تھا۔ لکھنؤ ساتھ آیا تھا۔ پھر یہاں سے فرار ہو گیا ۱۲ (ع)

[3] حضرت مولینا عبد الباری صاحب مدظلہ کے صاحبزادے، جوان دنوں پاکستان میں ہیں اور کسی اخبار کی ادارت سے منسلک ہیں۔ ۱۲

۲۴ر جون ۱۹۳۵ء مطابق ۲۱ر ربیع الاول ۱۳۵۴ء

محراب الہدایت والارشاد، گیلانی، بہار

رفیق شفیق! ادام اللہ حبکم وعنایتکم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اس وقت تک جب تک کہ آپ کو بجائے اپنے مکارم سلمہ کے ذریعہ سے خط لکھنے پر مجبور نہ ہوا یہ قطعی خیال نہ تھا کہ میں ۲۲ر جون کو گیلانی میں رہوں گا۔ سب سامان تیار کر چکا تھا۔ حتیٰ کہ راستہ کی نہاری بھی پک چکی تھی۔ کیونکہ آپ سے ایک دن پہلے مجھے گیلانی روانہ ہونا ضرور تھا۔ اپنے ساتھ آم لانے کا بھی خیال تھا لیکن زیادہ ہو جاتا۔ اس لئے محی الدین[1] صاحب اور حیدری[2] صاحب کو بذریعہ تار ریلوے پارسل بھجوانا مناسب خیال کیا، اور آپ حضرات کے لئے ساتھ لانا چاہتا تھا۔ اتنے میں وہ واقعہ پیش آیا جس کے جواب میں آپ کا لفافہ کان پور سے چلا ہوا آج مجھے ملا ہے۔

اس میں شک نہیں گذشتہ ہفتہ مجھ پر سخت گذرا، بخار، طحال ورم جگر کے ساتھ ساتھ سارے جسم میں پتی درو ڑوں کی شکل میں اچھل آئی۔ ایسی سخت خارشت تھی کہ جی چاہتا تھا کہ جسم کی کھال نوچ کر پھینک دوں۔ اس پر مزید برآں شدید اختلاج کا دورہ بھی پڑ گیا، جس کا میں عادی نہ تھا۔ شاید اسپرین کے سفوف کی کثرت نے دل کو بہت کمزور کر دیا ہے۔

---

[1] اس وقت محی الدین صاحب اورنگ آباد کالج میں پرنسپل تھے ۱۲

[2] سر اکبر حیدری جو اس وقت حیدرآباد میں فنانس منسٹر تھے۔ مولینا کے خصوصی تعلقات تھے اور وہ مولینا کے علم و فضل کے خصوصاً معتقد تھے ۱۲ (ع)

الغرض من داق کی آواز ہر طرف گونجنے لگی۔ اسی سلسلہ میں ایک درخواست رخصت کی وائس چانسلر کے نام روانہ کی۔ برادرم سمی سلمہٗ کا اسی دن تار ملا تھا جس میں انہوں نے میرے اسی سوال کے جواب میں کہ خانگی رخصت کا اتصال کو سمی تعطیل کے ساتھ اگر کیا جائے تو اس کا اثر تنخواہ تعطیلات پر پڑے گا یا نہیں۔ انہوں نے جواب میں لکھا تھا کہ نہیں پڑے گا۔ اس لئے رخصت خانگی کی درخواست دی۔ مگر آپ کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف بیماری کی رخصت مل سکتی ہے بہر حال اگر میری درخواست میں سقم ہے تو اب اس کی اصلاح کی کیا صورت ہے۔ اس سے مطلع فرمائیں۔

میری وہ حالت تو فوری علاج سے بحمداللہ جاتی رہی، بخار بھی رک گیا ہے اور تپی بھی دب گئی ہے لیکن دمہ کا تسلسل غیر منقطع ہے۔ کوئی دوا کارگر نہیں ہو رہی ہے اس سے اختلاج بھی بڑھتا ہی رہتا ہے۔ آپ نے جو دوا ڈاکٹر صاحب والی بھیجی ہے، معلوم نہیں قلب پر اس کا کیا اثر ہوگا۔ ذرا بھی سانس کچھ سیدھی ہوئے تو اب انشاء اللہ تعالیٰ کلکتہ روانہ ہوتا ہوں۔ ڈاکٹروں سے مشورہ اس دوا کے متعلق وہیں کروں گا۔ اور یہ دوا اس جنگل میں میسر بھی تو نہیں آسکتی، کلکتہ کے سوا ملے گی کہاں؛

آپ نے حیدر آباد پہونچ کر کیا نظم قائم کیا اس سے مطلع فرمائیں۔ باورچی اور نوکر کا کیا ہوا۔ مولوی عبد[1] الحفیظ صاحب سے انشاء اللہ تعالیٰ مدد ملے گی۔

---

[1] مولینا کے زیر کرم ایک صاحب جو اس قسم کے نجی کاموں میں ان کے اور مکتوب الیہ کے بہت کام آتے تھے۔ ۱۲ (ع)

مولوی سلیمان[1] صاحب نہ معلوم کب تک تشریف لائیں گے۔

اس وقت ہم لوگ اس قدر پریشانی میں ہیں کہ اورنگ آباد اور حیدر آباد کے لئے جو پارسل آموں کا روانہ ہو گیا وہ ہو گیا۔ اب پھر صندوق منگوانا۔ ان کو بڑھئی سے درست کرانا اور اسٹیشن وغیرہ بھجوانے سرے سے دشوار ہی معلوم ہوتا ہے۔ شاید جو آم اپنے ساتھ لانا چاہتا تھا وہ نہ بھیجا جاسکے، مجھے اس کا سخت افسوس ہے۔ میاں رشید[2] کا خاص خط آیا ہے کہ آم ضرور ساتھ لائیے گا لیکن کیا کروں یہی غنیمت ہے کہ اس وقت محی الدین صاحب اور حیدری صاحب کے نام پارسل روانہ ہو گیا۔ آپ اپنے ساتھ خود ٹوکرہ لائے تھے تو اس میں لکھنؤ آم روانہ ہو سکا۔ دیہات میں سامان پیک کرنے کا نہیں ملتا۔ سخت دشواری ہوتی ہے۔ بڑی مشکل سے بر بگہا میں دو صندوق دیودار کے ملے۔

خیر برادرم فضل سلمہٗ شیخپورہ سے گذرے لیکن گیلانی نہ آئے اور خط ڈالتے ہوئے چل دیئے۔ بریدآباد کی سیر نے فرصت نہ دی۔ ان کو سلام و شکوہ پہونچا دیجئے۔ مفتی صاحب[3] کو سلام فرما دیجئے۔

میرا مستقل ارادہ ہے کہ اب اس رخصت کو طوالت دوں لیکن کیا کروں، کس قسم

---

[1] علامہ سید سلیمان صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ اس زمانہ میں حیدر آباد تشریف لانے والے تھے۔ تشریف لائے اور مکتوب الیہ کے مہمان تھے ۱۲ (ع)

[2] مولینا کے شاگرد رشید غلام دستگیر رشید صاحب جو اب نظام کالج میں پروفیسر ہیں ۱۲ (ع)

[3] مولینا مفتی عبدالطیف صاحب صدر شعبۂ دینیات عثمانیہ یونیورسٹی ۱۲۔

کی رخصت لوں اس کے متعلق آپ کے مشوروں کا انتظار کرتا ہوں۔ اب حیدرآباد دماغ میں نہیں ہے ہرچہ بادا باد۔ اس سال اسی غرض سے گیلانی کی کاشت واشت کو بھی ملتوی کرادیا، دوسروں کو بندوبست کردیا تاکہ برادرم مکارم سلمہٗ کو ساتھ لے کر پہلے کلکتہ جاؤں وہاں سے بعد علاج خواہ لکھنؤ یا کابل وغیرہ انشاء اللہ تعالیٰ چند مہینوں کے لئے روانہ ہوجانے کا خیال ہے۔ لیکن ان تدبیروں میں قطعی صحت کی ضمانت ہے، دل کہتا ہے بالکل جھوٹ ہے لیکن عمل کروں گا۔ مولوی حماد صاحب[1] سے میرا سلام فرمادیجئے۔ ان سے آپ کے معاملات کی اب کیا نوعیت رہے گی۔ الغرض تمام تفصیلات کو لکھ کر بھیجئے۔ خلیفہ صاحب[2] کا کیا ہوا۔ اور آپ کے معاملہ میں کیا صورت ہوگی۔ اس کی خبر بھی ضرور دیجئے گا، دل لگا رہتا ہے۔ کالج تو آپ روز ہی جاتے ہوں گے۔ سمی صاحب کو میرا رقعہ پہونچا دیجئے، اور مل کر مشورہ میری رخصت کے متعلق کرکے مجھے مطلع فرمائیں۔

مناظر احسن گیلانی

---

[1] مولانا کے ایک ہم وطن (بہاری)، جو دفتر فنانس میں ملازم تھے۔ اور اس زمانہ میں مولانا ہی کے مکان میں مقیم تھے۔ حیدری صاحب (فنانس منسٹر اور بعد کو صدر اعظم) کے خاص لوگوں میں تھے۔ ۱۲ (ع)

[2] ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم ۱۲ (ع)

۲ر اکتوبر ۱۹۳۵ء۔ چہارشنبہ

مطابق ۴ر رجب ۱۳۵۴ھ

رفیق محترم! دام مجدکم العالی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

یہ عریضہ ایک جدید اطلاع کے لئے لکھ رہا ہوں، ۶ر اکتوبر کو از روئے جنتری تعطیل نہ تھی لیکن آج اعلامیہ جریدہ نے اعلام کیا ہے کہ ۶ر اکتوبر کو تعطیل رہے گی۔ اور دفاتر بجائے ۹ر اکتوبر کے ۸ر ہی کو کھل جائیں گے اس لئے مطلع کردیتا ہوں، کیل کانٹا درست کرلیجئے۔ لیکن بشارت ماضیہ کے بعد آپ نے تو نیت بدل ہی دی ہوگی تاہم دماھن افقد قضی ما علیہ، ادب عربی رہے نہ رہے، اس کی کمیٹی شعبہ کی آج جو تھی ملتوی ہوگئی ——— فالحمد للہ۔

اپنا حال کیا عرض کروں۔ اب تک دل صرف اس پر قانع تھا کہ "قرض نہ ہو" لیکن خدا جانے یہ کس کی جدید صحبت کا نتیجہ ہے کہ کچھ پس ماندہ ہو، اور یہ ہوتا ہی نہیں۔ اسلئے گڑگڑاتا رہتا ہوں کہ حق تعالیٰ کی جگہ درہم و دنانیر نہ لیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چاندی کا تخت شیطان نے دل پر بچھا دیا ہے صرف ایک آیت سے قوت مل رہی ہے ولا تؤتوا السفہاء اموالکم التی جعل اللہ لکم قیاما[1] (نساء)۔ لیکن میں خود تو "سفیہ" ہوں باقی سفیہوں کو دیتا تو نہیں ہوں، پھر مجھ سفیہ کو دیا جاتا ہے۔ جو اس کے مصارف صحیحہ

---

[1] اور تم کم عقلوں کو اپنے وہ مال مت دو جن کو خدائے تعالیٰ نے تمہارے لئے مایۂ زندگی بنایا ہے ۱۲

سے واقف نہیں۔ دعا کیجئے کہ مسئلہ حل ہو، اور اما من اعطیٰ واتقیٰ وصدق بالحسنیٰ (دلیل) سے قدم نہ ہٹے۔ تباہی ہے اس کے لئے جس نے واما من بخل "واستغنیٰ"[1] اور (روپیہ پر اعتماد کرکے) حق سے بے نیاز ہو گیا۔ اور مصیبت مجھ پر نہ آئے۔[2] بس اور حالات بہتر ہیں۔

مناظر احسن گیلانی

---

[1] پوری آیت کا ترجمہ یہ ہے "سو جس نے اللہ کی راہ میں مال دیا اور اللہ سے ڈرا اور اچھی بات یعنی ملت اسلام کو سچا سمجھا تو ہم اس کو راحت کی چیز کے لئے سامان دے دیں گے۔ اور جس نے حقوق واجبہ سے بخل کیا اور بجائے خدا سے ڈرنے کے خدا سے بے پروائی اختیار کی اور اچھی بات یعنی اسلام کو جھٹلایا، تو ہم اس کو تکلیف کی چیز کے لئے سامان دے دیں گے۔ ۱۲

[2] مولینا خود تو ماشاء اللہ صدر شعبہ اور ایک ہزار کے مشاہرہ تک پہونچ کر بھی اپنی زندگی میں طالب علم ہی رہے لیکن چھوٹے بھائی سید مکارم احسن سلمہٗ جوان کے خانگی امور کے مختار کل تھے اور طبعاً حوصلہ مند واقع ہوئے ہیں۔ جب مولینا کے کھیت باغ وغیرہ کے قریب کوئی آراضی وغیرہ فروخت ہونے والی ہوتی تو بھائی بہر حال مولینا ہی کے بھائی ہیں اس کی خریداری کے لئے دلائل ومصالح کا انبار لگا دیتے۔ ایک مرتبہ مولینا فرمانے لگے کہ مکارم کی اس منطق سے کہ فلاں زمین ہماری فلاں زمین کے قریب یا متصل ہے پورا دائرۂ ارض ہی گیلانی کے حدود میں داخل کر لیا جا سکتا ہے۔ تاہم مولانا بے دلیل بھی ان کی خواہش و خوشی کو کیسے ٹال سکتے تھے۔ اکثر ایسی باتوں میں قرضدار ہو جاتے ۱۲ (ع)

۳۰ر اکتوبر ۱۹۳۵ء مطابق ۲ر شعبان ۱۳۵۴ھ

روز چہارشنبہ (محراب)

رفیقی الکریم مدظلکم العالی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

بڑے آرام وعافیت سے انٹر کلاس میں قاضی پیٹھ سے شیخپورہ تک سفر تمام ہوا اٹارسی میں اطمینان کے ساتھ رات بھر سویا۔ صرف گاڑیوں کے آنے جانے کی وجہ سے کبھی کبھی آنکھ کھل جاتی تھی۔ صبح کو تروتازہ بمبئی میل ملا۔ انٹر کلاس اس قدر خالی تھا کہ جبل پور تک تنہا پہنچ کر خیال ہوا کہ اگر تنہائی کا یہی عالم رہا تو رات کو میں تھرڈ میں چلا جاؤں گا۔ ڈر معلوم ہونے لگا لیکن بحمد اللہ جبل پور سے ایک ساتھی مل گئے اور گیا تک وہ ساتھ رہے۔ آٹھ بجے کے بعد گیلانی دوشنبہ کے دن بحمد اللہ پہونچا۔ سب کو بعافیت پایا۔ فصل بھی حق تعالیٰ کے فضل سے بہتر حال میں ملی۔ تمام ملک سرسبز وشاداب وآباد ہے۔ ہرے ہرے دھان کے کھیت جہاں تک نظر جاتی ہے لہلہا رہے ہیں۔ موسم ایسا خوش گوار، معتدل، دورسا ہے کہ کاش اگر صحت ہماری وہ ہوتی جو جوانی میں تھی تو میں خیال کرتا کہ جنت میں آگیا ہوں۔ حق تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ دو دن تین راتیں ریل پر گذاریں، کھانے پینے میں بد احتیاطیاں بھی ہوئیں، لیکن بغیر کسی تکلیف کے گھر تک غالباً پہلی دفعہ اس حال میں پہونچا جس حال میں دکن سے روانہ ہوا تھا۔ حیدرآباد دماغ سے نکل گیا ہے اب وہاں کے سارے حالات اس خدا کے سپرد ہیں جو وہاں بھی ہے اور یہاں بھی ہے۔ یہ اسی کا انتظام ہے کہ آپ ایسے وقت میں وہاں موجود ہیں، میری موجودگی میں آپ پر اتنی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی

جتنی اب ہوتی ہے۔ وقت پر تنخواہ کے بھجوانے کا ضرور نظم کر دیجئے گا۔ مفتی صاحب[1] کو بھی سلام فرما دیجئے گا۔ اور مولوی فضل صاحب کو۔ ان سے کہہ دیجئے گا کہ اگر ضرورت میری محسوس ہو تو مجھے بلا سکتے ہیں۔ اگرچہ میں خیال کرتا ہوں کہ یہ سب بھی ضرورتیں ہیں۔ مولانا[2] اشرف علی صاحب

[1] مولانا مفتی عبداللطیف صاحب رحمۃ اللہ علیہ ۱۲ (ع)

[2] حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء میں پیدا ہوئے۔ دار العلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کی۔ ذکاوت و ذہانت کے آثار شروع ہی سے نمایاں تھے۔ فراغت کے بعد چند سال جامع العلوم کانپور میں صدر مدرس رہے۔ پھر ملازمت ترک کی اور اپنے وطن تھانہ بھون میں قیام پذیر ہوگئے، جہاں چالیس سال تک آپ نے تزکیۂ نفوس، تبلیغ دین اور تصنیف و تالیف کی وہ گراں قدر خدمت تنہا انجام دی جو ایک پوری جماعت بھی مشکل سے انجام دے سکتی ہے۔ علم نہایت وسیع اور بہت گہرا تھا جس کا ثبوت آپ کی تصنیفات کا ہر صفحہ دے سکتا ہے۔

آپ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے مجاز و خلیفہ تھے۔ بیعت و ارشاد کا سلسلہ بھی بہت وسیع تھا عوام تو عوام خواص اور اہل علم کا جتنا بڑا طبقہ بیعت و ارشاد کی راہ سے آپ سے منسلک رہا اس کی مثال کم ملے گی۔ اس راہ میں حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کی رفعت و بلندی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کے بڑے بڑے صاحب علم و فضل و کمال جو کہیں جھک نہ سکے انہوں نے مولانا تھانوی قدس سرہ کے سامنے ہتھیار ڈال دیا اور مولانا ہی کے ہو کر رہے۔

آپ کی زندگی بڑی منظم اور حق تعالیٰ نے وقت میں عجیب برکت عطا کی تھی۔ مطبوعہ مواعظ کے ساتھ آپ کی چھوٹی بڑی تصنیفات کی تعداد کم و بیش سات سو ہے (باقی اگلے صفحہ پر)

کا "استعفا" میں بھی چھپا ہے۔ جو گیلانی میں ملا۔ اب دونوں طرف سے "ملاعنۃ" اور "مباہلہ" کے حدود شروع ہو گئے ہیں۔ حق تعالیٰ کا شکر بجا لایا کہ اس طوفان و فتنہ سے اس نے اپنے ایک غریب بیکس بندے[1] کو بچا لیا۔ اثباتی کامیابیاں نہ سہی لیکن بدبختیوں سے بچنا بھی بڑی کامیابی ہے۔ آج اس سے بڑی بدبختی کیا ہو سکتی ہے کہ دنیائے اسلام کے دو بزرگوں[2] میں سے کسی ایک کے قلب مبارک میں کچھ سوء دوسرے کی طرف سے پیدا ہو فالحمد للہ الذی نجانی من القوم الظالمین آپ سے ایک امر عرض کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ میں نے جن اغراض سے فرصت لی ہے وہ صرف آپ کو معلوم ہے۔ لوگ میرے مقام و قیام کے متعلق اگر دریافت کریں تو صرف اس قدر جواب دے دیا کیجئے کہ گیلانی سے خط آیا تھا اب ادھر نہیں آیا، اس کے بعد معلوم نہیں کہاں ہیں۔ میں انشاء اللہ تعالیٰ جہاں جہاں جاؤں گا آپ کو لکھتا رہوں گا۔ اس وقت تو دو کام اپنے ذمہ ہیں، ایک تو آسان ہے ادھر

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) روزانہ کی ڈاک کا اوسط پچیس تیس تھا ہر ایک کا جواب اپنے قلم سے دیتے۔

ہند و پاکستان میں مسلمانوں کے کم گھر ایسے ہوں گے جہاں حضرت مولانا کی کوئی نہ کوئی ... تصنیف موجود نہ ہو۔ بہرحال مولانا کی ذات علم، حکمت اور معرفت کا سرچشمہ تھی جس سے چالیس پچاس برس تک ہند و بیرون ہند سیراب ہوتا رہا۔

رجب ۱۳۶۲ھ م ۱۹۴۳ء میں مولانا نے اس جہانِ فانی کو خیرباد کہا، رضی اللہ تعالیٰ عنہ ۱۲

[1] خود مولانا علیہ الرحمہ ۱۲ (ع)

[2] مولانا تھانوی و مولانا مدنی رحمہما اللہ تعالیٰ ۱۲ (ع)

بہت دنوں سے خاتم[1] ہوگیا تھا۔ دوسرے آپ کے حکم کی تعمیل یعنی اسفار[2] کا سفر خدا کرے دونوں باتیں مکمل ہوجائیں۔ ریل میں پہلے کام کا اچھا موقع ہاتھ آیا۔ رمضان قریب ہے جو کچھ ہے پختہ ہوجائے تو بڑی آرزو پوری ہوگی۔ دعا کا خواستگار ہوں کاش کہ امید پوری ہوتی۔

برادرم مظہر[3] سلمہ کو ۶ر نومبر تک کلکتہ ضرور روانہ کر دیجئے۔ ان کے کرایہ وغیرہ کا روپیہ مولوی عبدالحفیظ صاحب کے سپرد کر آیا ہوں۔ مولوی عبدالحفیظ صاحب کے نام ایک الگ پرزہ اس میں ہے ان کو دیدیجئے گا۔ لکوا[4] گھر پہونچ کے بہت خوش ہے۔ آج کل تالابوں میں مچھلی کی کثرت ہے۔ پرسوں ٹہلنے کے لئے ایک تالاب کی طرف جارہا تھا۔

[1] مولینا چپکے چپکے قرآن مجید حفظ فرمارہے تھے، اس کی خبر مکتوب الیہ کے سوا شاید ہی کسی کو دی ہو۔ ایک رمضان مبارک میں غالباً کم وبیش نصف صرف مکتوب الیہ کو نفلوں میں سماعت کی سعادت بھی نصیب رہی۔ ۱۲ (ع) [2] علامہ صدرالدین شیرازی کی مشہور کتاب چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ موضوع فلسفہ ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں حکمار متقدمین کے نقش قدم کو اختیار کیا ہے اور یونانی علمار کی کتابوں کا عطر کشید کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اسرار ربانی کو فلسفہ کی روشنی میں حل کرنا چاہا ہے۔ اس کے ایک حصہ کا ترجمہ ۷۰۵ صفحات پر حیدرآباد سے چھپ کر شائع ہوا جو علامہ گیلانی کے قلم سے ہے آخر میں خود مولینا نے لکھا ہے کہ آج بتاریخ ۱ر جمادی الاخری سنہ ۱۳۵۹ھ کو اس جلد کا ترجمہ ختم ہوا۔ ۱۲ [3] مولینا مرحوم کے سب سے چھوٹے بھائی جواب جامعہ عثمانیہ میں ہیں ۱۲ (ع) [4] مولینا کا وطنی خادم و باورچی ۱۲ (ع)

لگی (آلہ شکار ماہی) میں نے اپنے ہاتھ میں لے کر تالاب میں ڈالا، ایک زبردست مانگر مچھلی ہاتھ آئی مچھلی کا اس سال بڑا زور ہے لیکن مجھے مرغوب نہیں۔

حضرت[1] تو تشریف لے گئے ہوں گے عجیب وغریب اخلاق کریمہ ہے ولایت سے زیادہ ان کی شرافت ہے، یا دونوں صفات مساوی ہیں، قطعاً "انا فنا" ورنہ مجھ جیسے کلاب الدنیا اور ان کے اللہ کے ایسے دوستوں کی یہ مداراتیں یقیناً قابل حیرت ہیں، کچھ نہیں ہے اس پرتو بے قدر ہے۔

حضرت امجد[2] صاحب سے سلام فرمادیجئے اور کام ان سے لیجئے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ دو تین نشستوں کے بعد ان کو وہ نقشہ مل جائے گا جس کی ہم لوگوں کو تلاش ہے۔ فقط

نیازمند مناظر احسن گیلانی

[1] وہی حیدرآبادی بڑے صاحب حال وقال بزرگ حضرت مولینا محمد حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ جن کی "لسان خاص" اللہ تعالیٰ نے ڈاکٹر میر ولی الدین سلمہ کو بنا دیا ہے جو ان کے قال کی خوب ترجمانی فرماتے رہے ہیں۔ ۱۲ (ع)

[2] وہی حیدرآبادی مشہور حکیم وصوفی، شاعر جن کو حکیم الشعرار کے خطاب سے مخاطب کرنے کی پہلی سعادت غالباً مکتوب الیہ کو ملی تھی ۱۲ (ع)

١٩ ستمبر ١٩٣٦ء روز شنبہ
مطابق ٣ رجب ١٣٥٥ھ

رفیق شفیق! عافاکم اللہ واخرجکم من الظلمات الی النور

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ادھر مسلسل مختلف جوانب سے خطوط میرے پاس پہونچ رہے ہیں کہ آپ کے خطوط کا میں جواب نہیں دیتا۔ سب سے زیادہ برادرم فضل سلمہ نے دہلی سے متعدد خطوط میں اس کی شکایت کی ہے میں نے اس کے جواب میں جو آخری خط آپ کو لکھا ہے وہ تو شاید مل گیا ہوگا۔ بڑی احتیاط کے ساتھ روانہ کیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ یہ میرے خطوط کیا ہوتے ہیں۔ اگر یہ آخری خط بھی نہیں ملا تو اب رجسٹری کے ذریعہ سے خط بھیجنا پڑے گا۔ اس وقت یہ لفافہ اس لئے بھیج رہا ہوں کہ کل ایک تار آپ کے نام کا ملا۔ خدا جانے میرے دل نے کس طرح سمجھ لیا کہ یہ شہاب پور کا ہے کھولا اور پڑھا اب آپ کو بھیج رہا ہوں۔ شرکت تو آپ کی کیا ہوگی۔ لیکن معذرت کا خط تو بھیج سکتے ہیں۔ اس خط میں یہی تار ملفوف ہے۔ مولانا سلیمان صاحب کے گرامی نامہ سے یہ معلوم کر کے کہ آپ کو اب بھی شام کو حرارت ہو جاتی ہے۔ بڑی تشویش پیدا ہو گئی ہے۔ آپ اپنی حالت پورے طور پر نہیں لکھتے۔ براہ مہربانی اپنی حالت وصحت نیز ارادوں سے مطلع فرمائیں۔ مجروں[1] کے متعلق میں نے متعدد خطوط میں آپ کو اطلاع دی جس کے متعلق آپ لکھتے ہیں کہ نہیں

ا مکتوب الیہ بنگلہ، گملہ، موٹر، شوفر، سب کا مزہ چکھ کر اب عثمانیہ یونیورسٹی کے (باقی اگلے صفحہ پر)

ملے۔ بہرحال پھر لکھتا ہوں کہ وہاج الدین[1] صاحب کی رائے ہے کہ آپ ایک مستقل درخواست درباب مجرات قاضی صاحب کے نام لکھیے۔ حقیقت میں آپ کے لئے بڑی آسانی ہو جائے گی۔ ممکن ہے کہ اس تجربہ کو جسے آج کل کر رہا ہوں اس سے مجھے دست بردار ہونا پڑے تو اس کے بعد پھر اسی ایک گلیم میں دو درویش ہو سکتے ہیں۔ میں تو بڑے خطیر مصارف کے نیچے دب گیا ہوں۔ حیدرآباد اور پانچ آدمیوں کی خبر براہی، ایک پہاڑ معلوم ہوتا ہے۔ نئی بات صرف اس قدر ہے کہ شروانی[2] صاحب آئے ہوئے ہیں۔ دائرۃ المعارف[3] کی کمیٹی ہو رہی ہے ہاشم نے تو بڑا زبردست پروگرام بنایا ہے۔

(حاشیہ بقیہ صفحہ گذشتہ) قریب ایک نوتعمیر مسجد کے احاطہ میں دو کمرے بنوا کر یونیورسٹی کے تعلق کے بقیہ ایام انھیں میں گذار دینا چاہتا تھا۔ الحمدللہ خواہش پوری ہوئی اور خوب گذری۔ حیدرآباد کی ملازمت تو نہیں لیکن یہ حجرے ہمیشہ یاد آتے ہیں۔ ۱۲ (ع)

ا وہاج الدین صاحب وائس چانسلر (قاضی محمد حسین صاحب) کے پرسنل اسسٹنٹ تھے۔ یونیورسٹی کے حدود میں اساتذہ کے لئے بنگلے بننے والے تھے اور ان میں قیام لازم تھا مکتوب الیہ اسی لزوم سے بچنا چاہتا تھا ۱۲ (ع) ٢ مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی مرحوم (ع)

٣ حیدرآباد کا مشہور ادارہ جو ۱۸۸۹ء میں ملا عبدالقیوم، فضیلت جنگ بہادر مولانا شاہ انوار اللہ خاں صاحب اور سید حسین بلگرامی کے ہاتھوں قائم ہوا جس نے علم وفن کی بیش بہا اور قیمتی خدمات انجام دیں۔ بہت سی نادر و نایاب اور مخطوطات شائع کئے۔ ۱۲

دائرۃ المعارف سے ایک پرچہ عربی میں بھی نکالنے کا خیال ہے۔ اس کے وکلا انجمن ہائے استشراق میں شریک ہوں، اور تلاش کتب کے لئے ممالک اسلامیہ و مغربیہ کی سیاحت کریں، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن دوسری طرف مخالفانہ جراثیم بھی زور پکڑ رہے ہیں۔ حیدرآباد میں طاعون شروع ہو گیا ہے، سرکاری طور پر تسلیمی اعلان شائع ہو چکا ہے۔ رات سالگرہ مبارک کی تقریب تھی، نذر پیش کرنے اور دعوت کھانے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اس سے پیشتر شاہزادہ جواد جاہ بہادر معمر گیارہ ماہ کا انتقال ہوا، مجلس زیارت[1] میں مجھے بھی بلایا گیا تھا۔ اکبر[2] یار جنگ نے سری کرشن پر ایک تقریر کی تھی جس میں علانیہ اس کی نبوت کا اعلان کیا۔ اور "علیہ السلام" بار بار کہا۔ جس پر فرمان شاہی کے رو سے زیر عتاب ہوئے۔ معذرت کی، معذرت نامہ اخباروں میں اس اضافہ کے ساتھ "خوب عذر لنگ، چہ خوب" شائع ہوا۔ وفاق کے مسائل روز بروز پیچیدہ ہو رہے ہیں۔ جامعہ میں ہندوؤں نے درخواست دی ہے کہ ہم جوابی پرچے بحروف ہندی لکھیں گے۔ بعض ارباب اقتدار ان کے ہمنوا ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ ہمارے اور آپ کے نواب[3] بھی ان کے ساتھ ہمدردی میں کمی نہیں کر رہے ہیں۔ اللہ ہی محافظ ہے۔

---

[1] زیارت حیدرآباد کی اصطلاح میں میت کے سوم کا نام ہے ۱۲ (ع)

[2] نواب اکبر یار جنگ ہوم سکریٹری تھے، مذہباً پکے قادیانی، طبعاً بہت شریف انسان، مولینا اور مکتوب الیہ کے خاص کرم فرما۔ ۱۲ (ع)

[3] غالباً سر اکبر حیدری مرحوم ۱۲ (ع)

حضرت[1] مد ظلہ العالی ابھی حیدرآباد ہی میں ہیں۔ گردہ کی شکایت اب نہیں ہے لیکن فساد خون کا اثر ابھی باقی ہے، علاج ہو رہا ہے۔ آپ کا سلام اور آپ کی حالت کی خبر ان کو دیتا رہتا ہوں، پوچھتے رہتے ہیں۔ اب کی تو شروانی صاحب کو بھی ان کے پاس لے گیا۔ چند منٹ کے صبر کے بعد سلسلہ شروع ہو گیا۔ آدھ گھنٹہ بیان رہا۔ شروانی صاحب اچھے خاصے متاثر ہوئے۔ فقط

نیازمند مناظر احسن گیلانی

۲ر نومبر ۱۹۳۶ء مطابق ۱۷ر شعبان ۱۳۵۵ھ

حیدرآباد دکن

صدیقنا الصدوق! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میں آپ کے گرامی نامہ کا جواب تین دن کے بعد دے رہا ہوں۔ آپ نے تنخواہ کے متعلق پیروی کا حکم دیا تھا، جس دن خط ملا، جمعہ تھا، اس کے بعد دو دن تعطیل تھی میں نے خیال کیا دریافت حال کے بعد آپ کو جواب دوں۔ آج کالج گیا، دفتر سے معلوم ہوا کہ تین مہینہ کی برآورد بنا کر زمانہ ہوا کہ وہ بھیج چکے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ محاسبی نے چونکہ اس کو واپس نہیں کیا اس لئے غالب قرینہ ہے کہ بذریعہ [illegible] بینک آپ کو تنخواہ مل چکی ہوگی۔ اس مہینہ کی تنخواہ کی برآورد بھی بنا کر صدر محاسبی بھیجی گئی ہے، چاہئے کہ

---

[1] حضرت مولینا محمد حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ ۱۲ (ع)

منتظر طلبی بینک سے اس کے متعلق دریافت حال کیجئے۔ یہ وہ رپورٹ ہے جو دفتر سے ملی۔ اب میرا خیال ہے کہ صدر محاسبی سے بھی دریافت کراؤں۔ آپ نے خود کچھ نہیں لکھا کہ آخر کسی قسم کی کوئی خبر آپ کو ملی یا نہیں۔ صدر محاسبی میں اگر پیروی کی ضرورت ہوگی تو کی جائے گی۔ یہ تو تنخواہ کا قصہ ہوا۔

اب رہا آپ نے مکان کے متعلق میرے اظہار واقعہ کی تعبیر نوٹس سے کر کے منا جو کچھ ارقام فرمایا ہے اس کا جواب ایک ممنون کرم اس کے سوا کیا دے سکتا ہے کہ ندامت سے اپنی گردن جھکا لے۔ مکان بھر گیا ہے ایک واقعہ ہے۔ کسی کو نوٹس دینا میری کمزور اعصابی طبیعت کے لئے ناممکن ہے۔ اور اگر دوں بھی تو پھر چالیس روپیہ ماہوار کا پہلے بندوبست کر لوں، تب دل میں بھی قوت پیدا ہو۔ مجبوراً آپ کو لکھنا پڑا کہ اگر یہی حالات رہے تو کوئی اور نظم قبل سے کر رکھنا چاہئے۔ ورنہ عین وقت پر دھر پکڑ نکالو۔ اس دست و خیز کے منظر کو سامنے لانے کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے چاہا تھا کہ بورڈنگ ہی میں چند ماہ قیام کا آپ کو موقعہ مل جائے لیکن وہ بھی ممکن نہ ہوا، پھر دوسری رائے خدمت والا میں پیش کی۔ اس کے جواب میں یہ سب کچھ سنا جو مقدر میں تھا

لہ ارنبی "کیا مولیناؒ کی وہی غیر معمولی مروتی خوش کرتی" طبیعت سے فائدہ اٹھا کر مکتوب الیہ کی علالتی طویل رخصت کے زمانہ میں کچھ لوگوں نے پورے مکان پر اس طرح قبضہ جما لیا تھا کہ ایک کمرہ بھی نہ چھوڑا تھا جس میں مکتوب الیہ واپسی پر پناہ لے سکے۔ اسی ناگواری میں حقوق رفاقت کے بل پر کچھ ناگوار مکاتبت کی نوبت آگئی تھی۔ ۱۲ (ع)

منا تو آپ کے اختیار میں تھا، لیکن اذیٰ کا اثر بحمد اللہ میرے دائرہ کی چیز ہے بحمد اللہ اس نے کچھ اثر نہیں لیا۔ اب آپ ہی ارشاد فرمائیے کہ کیا کروں۔ ایک پورا قافلہ مکان کے اوپر نیچے اترا ہوا ہے میں نہیں خیال کرتا کہ ایک منٹ کے لئے بھی اس ہنگامہ میں آپ گذار سکیں گے۔ تاہم ابھی "شب ندمیان" کا قصہ ہے، تو ممکن ہے کہ بغیر کسی نوٹس کے خود یہ لوگ اپنا الگ بندوبست کریں۔ سنتے تو کئی مہینے سے ہیں کہ اب وہ اپنا الگ نظم کرنے والے ہیں۔ موٹروں پر بیٹھ کر مکانوں کی گرد آوری بھی ہو رہی ہے لیکن ابھی صرف گرج ہے برس نہیں ہے۔ غالباً آپ بھی تعطیل سرما کے بعد ہی ارادہ فرمائیں گے ہو سکتا ہے کہ مکان اس وقت خالی ہو جائے۔ اور اب مناسب یہی ہے کہ اسی کا انتظار کیا جائے۔ ورنہ ان لوگوں کو نوٹس دینا میرے بس سے باہر ہے۔ آپ ہی اپنے اندر قوت پاتے ہوں تو دے دیجئے۔ اور اگر یہ کچھ نہ ہوا تو پھر ہم مع اپنے چاروں آدمی کے ایک کمرے کے اندر بسر کر لیں گے۔ آپ کو ایک کمرہ دے دیا جائے گا۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ کار سمجھ میں نہیں آتا۔ دوسری دشواری کھانے کی بھی ہے۔ اطلاع دیتا رہا ہوں کہ باورچی کا سلسلہ اٹھا دیا گیا ہے۔ کچا پکا جیسا بھی کچھ ممکن ہے اب للوا کے حوالہ ہے۔ یقیناً آپ اس کا کھانا دو دن سے زیادہ نہ کھا سکیں گے۔ اور اگر آپ کے مناسب اس نے پکا بھی لیا تو اس روکھے پھیکے کھانے کو دوسرے پسند نہیں کر سکتے۔ یہی حال نوکر کا ہے۔ ایک سیاہ بھوت، چیچک کا چہرہ، جو چوبیس گھنٹے اپنی دھوتی ران سے اوپر اٹھائے رہتا ہے۔ وہ میرا اکلوتی ہے۔ میں تو

(حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے)

نہیں سمجھتا کہ اس کو دیکھنے کے بعد آپ کے حواس بھی بجا رہیں گے۔ اسی لئے تو عرض کیا تھا کہ ان حالات میں اب کچھ اور بند و بست ہو۔ لیکن آپ پسند نہیں فرماتے تو فاللہ ما امر بہ اولو الامر۔

مولوی فضل صاحب آ گئے۔ مگر اب کی بڑی شان سے آئے۔ بیوی بچوں کو... کھاتولی[1] چھوڑ کر آئے۔ ان کا ارادہ تھا کہ اب مفتی صاحب[2] سے الگ ہو کر زندگی گذاریں مکان بھی تجویز کر چکے تھے۔ لیکن آخر سمجھانے بجھانے سے راضی ہو گئے۔

حضرت[3] مدظلہ العالی گویا اب بالکل اچھے ہیں۔ لیکن پٹی بندھی ہوئی ہے۔ اکثر خود تشریف لاتے ہیں۔ آپ کا اور والدہ صاحبہ کا سلام پہونچا تا رہا ہوں۔ امید ہے کہ اب آپ کی والدہ صاحبہ بالکل بہتر ہو چکی ہوں گی۔ میری طرف سے سلام و نیاز عرض کر دیجئے۔

---

[1] (حاشیہ صفحہ گذشتہ) بھوئی حیدر آباد کی ایک گنوار مگر محنتی و وفادار قوم ہے۔ اوپری موٹے کاموں کے لئے لوگ نوکر رکھتے تھے۔ مولانا کا بھوئی واقعی "سیاہ بھوت" ہی تھا۔ "چکوک" (چیچک زدہ) بھی بری طرح، مکتوب الیہ تو نظر بھر کر بھی نہ دیکھ سکتا تھا ۱۲ (ع)

[1] کھاتولی ضلع مظفر نگر میں ایک قصبہ ہے جہاں اس فقیر کے جد امجد حضرت شاہ ابوبکر چرم پوش قدس اللہ سرہٗ ملتان سے آکر آباد ہوئے۔ وہاں کی جائداد حضرت والد ماجد مولینا سید محمد علی صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے ہمارے بھتیجے مولینا سید شاہ فضل اللہ کو دی۔ اسی تعلق سے وہ بچوں کو کھاتولی چھوڑ کر آئے ہوں گے ۱۲ [2] حضرت مولینا مفتی عبد اللطیف صاحب[رح] سابق صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ ۱۲ [3] یعنی حیدر آباد کے بزرگ مولینا محمد حسین صاحب رحمتہ اللہ علیہ ۱۲ (ع)

ابھی یہ عریضہ لکھ ہی رہا تھا کہ مولینا ادریس[1] صاحب تشریف لائے۔ آج وہ اپنے وطن جا رہے ہیں۔ رمضان تک قیام کاندھلہ میں رہے گا۔ تھانہ بھون شریف اور دیوبند کے سفر کا خیال اگر ابھی باقی ہو تو مولینا اس تمنا کا اظہار کرتے ہیں کہ کاندھلہ کی قسمت میں ایک دن ہو۔ شیخ الطائفہ[2] تو اب سید المجاہدین بن کر فلسطین کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اللّٰھم بارک فی مساعیہم۔

مناظر احسن گیلانی

---

[1] کاندھلہ ضلع مظفر نگر کے رہنے والے۔ دار العلوم دیوبند کے فاضل، حضرت علامہ انور شاہ کشمیری[رح] شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند کے ممتاز شاگرد اور فن حدیث سے خصوصی تعلق کی بنا پر اپنے حلقہ میں ممتاز اور نمایاں، مشکوٰۃ شریف کی شرح التعلیق الصبیح کے نام سے لکھی جو مصر میں طبع ہوئی اور اہل علم میں مقبول ہوئی۔ پہلے سالہا سال قیام حیدرآباد میں رہا تھا اب مستقل پاکستانی اور جامعہ اشرفیہ (لاہور) میں شیخ الحدیث ہیں۔ ماشاء اللہ بڑے صاحب علم و تقوی اور مکتوب الیہ کے خاص کرم فرما۔ ۱۲ (ع)

[2] اس لقب کی سعادت حضرت سید (سلیمان) صاحب[رح] کے لئے مکتوب الیہ کو پہلے پہل غالباً کسی کتاب کے دیباچہ میں حاصل ہوئی تھی پھر اسی کے جوڑ پر مولینا مسعود علی صاحب ندوی (حضرت مسعود غازی) طائفہ دار المصنفین میں "شیخ الطائفہ" قرار پائے، اور حضرت مولینا حمید الدین فراہی[رح] نے اسی طائفہ عالیہ کے ایک اور رکن رکین کو "ظرافۃ مطلق طائفہ" فرما دیا تھا، رحمہم اللہ۔ ۱۲ (ع)

۱۳

۴ رمضان ۱۳۵۵ھ ۔ ۱۷ر نومبر ۱۹۳۶ء

رفیقی الکریم زادکم اللہ رافۃ و رحمۃ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

"صیام رمضان" اور "قیام رمضان" مبارک ہو۔ ہماری تراویح تو باغ عامہ میں امام باغ عامہ کے پیچھے ہو رہی ہے۔ فالحمد للہ۔

آپ کا مکتوب خط شاید ایک ہفتہ ہوا کہ آیا ہوا ہے۔ میں اب تک اس کا جواب نہ دے سکا۔ متفرق سوالات تھے جن کے جوابات حاصل کرلوں۔ خیال تھا کہ تب جواب دوں گا۔ اتنے میں آج چار دن ہو گئے کہ حضرت رمضان کی تشریف آوری ہو گئی۔ اب اِدھر اُدھر جانا فلاں دشوار ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ مولوی محمود احمد خاں صاحب[1] سے ملاقات نہ ہو سکی۔ آج کالج بند ہے کل بھی بند رہے گا۔ پرسوں اگر ان سے ملاقات ہوئی تو کسی دوسرے خط میں اس سوال کا جواب عرض کروں گا۔

باقی آپ نے مکان کے متعلق جن طول طویل خیال کا اظہار فرمایا ہے آپ اس کو دوسرے طریقے سے بھی ظاہر فرما سکتے تھے۔ میں نے تو صرف ایک واقعی حالت کی تصویر آپ کی خدمت میں بھیجی تھی کہ اس مکان میں اتنے آدمی گھس گئے ہیں۔ یہ میرے بس میں نہیں کہ کسی کو گھر سے نکالوں۔ ہر شخص وہی کہنے لگتا ہے جو آپ سے مسلسل دو خطوں میں سن رہا ہوں۔ "ہجر جمیل" نہ بردستی کی نیاز مندی، اور خدا جانے کیا کیا۔ حالانکہ اس میں "ہجر" کی کیا بات ہے۔ نہ کفر نہ گناہ کبیرہ نہ صغیرہ کچھ بھی نہیں صرف ایک بداخلاقی ضرور سمجھی جاتی۔

[1] پہلے کیمسٹری کے پروفیسر تھے پھر رجسٹرار ہو گئے تھے۔ مکتوب الیہ کے بڑے مخلص عنایت فرما ۱۲ (ع)

اگر آپ کے لئے ہر قسم کی سہولت بہم پہونچانا اپنا فرض خیال نہ کرتا۔ اس حال کو دیکھ کر میں نے آپ کو کالج کے کمروں کی خبر دی، دوڑ دھوپ کی۔ ایک دفعہ نہیں متعدد بار وہاج الدین صاحب سے ملا پھر جب اس سے مایوسی ہوئی تو مفتی عبداللطیف صاحب[1] کے مکان کا پتہ آپ کو دیا۔ غالباً اس مکان کا کرایہ اُس مکان سے بیس روپے کم از کم آپ کو دینے پڑتے۔ پھر اس مکان کے صرف ایک کمرہ پر آپ قابض تھے یا زیادہ سے

[1] حضرت مولینا عبداللطیف صاحب سنبھل ضلع مرادآباد کے رہنے والے، ۱۲۸۳ھ میں پیدا ہوئے۔ مولانا لطف اللہ صاحب علی گڈھی کے آخری شاگردوں میں ہیں۔ حضرت مولینا مونگیری[2] نے انھیں ندوۃ العلماء میں مفتی کے منصب پر مقرر فرمایا تھا۔ پھر جب ندوہ نے دارالعلوم کھولا تو اس میں شوال ۱۳۱۶ھ سے مدرس ہوئے۔ حضرت مونگیری رحمۃ اللہ علیہ نے جب ندوہ سے علیحدگی اختیار فرمائی تو آپ بھی ندوہ چھوڑ کر مونگیر چلے آئے۔ پھر حجاز تشریف لے گئے۔ اور کئی سال تک مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ میں مدرس رہے۔ حجاز سے پھر مونگیر واپس ہوئے اور خانقاہ رحمانی میں حضرت مونگیری کے خانوادے کے نوجوانوں کو عربی کی تعلیم دیتے رہے۔ غالباً ۱۹۲۰ء میں حیدرآباد تشریف لے گئے۔ ابتداءً جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ دینیات میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ پھر شعبے کے صدر ہو کر پنشن پائی۔ ۱۹۳۹ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں صدر شعبۂ دینیات کے منصب پر تشریف لائے۔ نوسال رہ کر علی گڈھ سے بھی سبکدوش ہوئے اور وہیں "نور ولا" میں مستقل قیام تھا ۵ ردسمبر ۱۹۵۹ء ۱۳۷۹ھ میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ آپ سیرۃ النعمان، تاریخ القرآن، تکمیل الارشاد وغیرہ کے مصنف ہیں۔ ترمذی شریف کی شرح بھی لکھی ہے جو ابھی تک طبع نہیں ہو سکی ۱۲۔

زیادہ دوپہر، اور وہاں متعدد کمرے تھے، سواری کی بھی آسانی تھی، اور یہ بھی صرف ایک رائے کی حد تک بات تھی نہایت آسانی سے آپ لینت و نرمی کے ساتھ بھی اپنے اس خادم کو لکھ سکتے تھے کہ مفتی صاحب کے مکان میں میں رہنا نہیں چاہتا۔ ظاہر ہے کہ اگر اس مکان میں آپ کے لئے گنجائش پیدا نہ ہوئی تھی تو یقیناً میرا فرض تھا اور ہے کہ مسلسل اس وقت تک دم نہ لوں جب تک یا تو اس مکان میں آپ کے لئے نظم کروں یا کسی اور معقول جگہ، ان دو جگہوں میں ناکامی ہوئی تھی تو تیسری جگہ تلاش کی جاتی لیکن آپ نے تو پندرہ سال کی نوازشوں کا پشتارہ ایک دفعہ مجھ ناتواں کے سر پر دے مارا۔ اور "قانون" و "حق" کے تمام آلات سے مسلح ہو کر اسکے سامنے مقابلے کے لیے کھڑے ہو گئے جو بیچارہ کسی طرح بھی مقابلے کے لئے پیدا نہ ہوا جو دشمنوں کے مقابلہ میں نہیں ٹھہر سکتا آپ فرماتے ہیں کہ وہ دوستوں کے مقابلے پر کھڑا ہو کشمکش کرے۔ میری خراب قسمت کے یہ سب کرشمے ہیں میں نے کیا لکھا آپ نے کیا سمجھا بہرحال میں آپ سے دست بستہ معافی کا خواستگار ہوں اور اگر کسی واقعہ کی تعبیر میں مجھ سے عبارتی تقصیر ہوئی ہے تو آپ اس سے درگذر فرمائیں۔

میں نے حسب الحکم دل کڑا کر کے سجاد[1] صاحب سے کہہ دیا ہے کہ مولوی صاحب

---

[1] یہ حضرت "خانہ خالی" پا کر کہنا چاہیئے کہ زبردستی قابض ہو گئے تھے اور مولانا کی وہی طبعی حد سے بڑھی ہوئی مروت دیکھئے کہ اتنا کہنے میں بھی کتنا "دل کڑا" فرمانا پڑا۔ اس کی وجہ اکثر بڑے جانی و مالی ابتلا میں پڑ جاتے تھے مکتوب الیہ کبھی کبھی اپنے کو بطور سپر پیش کر دیتا تو بہت سی بلائیں ٹل جاتی تھیں" (ع)

اس مکان میں آ کر اتریں گے اب دو ہی حال ہے یا آپ مکان الگ لے لیجئے یا ہم اور مولوی صاحب اس مکان سے علیحدہ ہو جائیں۔ جواب میں وہ فرماتے ہیں کہ مکان تلاش کر رہا ہوں لیکن ملتا نہیں ہے جب مل جائے گا چلا جاؤں گا۔ سامنے کریم ٹیکسی[1] نے جو بنگلہ بنایا ہے اس کے صرف بالاخانہ کا کرایہ اسی ۸۰ روپیہ مانگتا ہے صرف بالاخانہ۔ انا للہ و انا الیہ راجعون میں سخت حیران ہوں کہ کیا کروں۔ کاش اگر چالیس میں کریم اپنا بالاخانہ دے دیتا تو میں ہی اس میں چلا جاتا یا آپ کو وہاں ٹھہراتا لیکن اس کرایہ میں وہاں کون جا سکتا ہے اب اگر سجاد صاحب نہ گئے تو میں نے یہی سوچا ہے کہ اوپر کے "مغربی کمرہ" اور جو کمرہ "غسل خانہ" والا ہے اس میں ہم تین آدمی رہیں گے یعنی خاکسار، میاں محی الدین[2] اور ان کے ماسٹر۔ اور خاکسار کا جو شرقی کمرہ تھا اس کو آپ کے لئے مخصوص کر دوں بلکہ اگر واقعی اس دفعہ بھی آپ صرف چند دنوں کے لئے آنا چاہتے ہیں تو آپ کی حیثیت ہمارے یہاں وہی ہوگی جو گذشتہ سال سید صاحب[3] کی ہم لوگوں کے یہاں تھی۔

معتبر خبر یہ ہے کہ کالج لیلۃ القدر کی تعطیل سے بند ہو کر ایک مہینہ بعد کھلے گا۔ مولوی فضل صاحب تو پھر چھٹی لے کر مظفر نگر روانہ ہو گئے غالباً آپ تو تعطیلوں بعد آئیں گے انھوں نے بھی رخصتوں میں راحت محسوس کی۔ اور ان کا بیان تو یہ ہے کہ

---

[1] جہاں سے مولانا اور مکتوب الیہ کا مستقل ماہوار ٹیکسی کا معاملہ تھا ۱۲ (ع)

[2] مولانا کے صاحبزادہ سلمہٗ ۱۲ (ع)

[3] حضرت مولینا سید سلیمان صاحبؒ جو مولانا اور مکتوب الیہ دونوں کے مہمان تھے ۱۲ (ع)

کفایت بھی ہے مفتی صاحب ان کی اس مطلق العنانی پر ابتداءً میں کچھ برہم ہوئے۔ لیکن انھوں نے ڈانٹ کر جواب دیا۔ اب دم بخود ہیں۔ "جو مزاج یار میں آئے" کے ورد میں معروف ہیں۔

خدا جانے آپ کا خط میں نے حفاظت سے کہاں رکھ دیا ہے کہ اس وقت ٹھیک جواب دینے کے لئے بہت ڈھونڈا لیکن کسی ایسی جگہ پر محفوظ ہے کہ آسانی کے ساتھ رسائی اب وہاں ناممکن ہے۔ ناچار حافظے کے بھروسہ پر جو جو خیال میں آیا جواب دے دیا۔

حضرت[1] قبلہ اب بحمد اللہ بالکل اچھے ہیں۔ ادھر اس مرض کے بعد ایک خاص رنگ کے ساتھ شگفتہ ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ ان کی جوتیوں کے صدقہ میں "ایمان ولیقین" کی عجب گھاٹیاں طے ہوئیں۔ ان چند مہینوں میں بعض نئی باتوں کا اضافہ ہوا جن سے اب تک محروم تھا۔ فالحمد للہ الذی بعزتہ وجلالہ۔

مناظر احسن گیلانی

---

۱۳ رمضان ۱۳۵۵ھ، ۲۶ نومبر ۱۹۳۶ء

عثمانیہ کالج حیدرآباد دکن

رفیقی الکریم دمتم بالعافیۃ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

خدا جانے آپ نے میرے خط کا کیا جواب دیا ہوگا۔ بہرحال آخری لفافہ جو میں نے

---

[1] وہی حیدرآبادی بزرگ حضرت مولانا محمد حسین صاحبؒ ۱۲

لکھا ہے اس کا جواب آج تک مجھے نہیں ملا ہے۔ لیکن اس سے پہلے یہ عریضہ میں لکھ رہا ہوں کیوں لکھ رہا ہوں، کیا بتاؤں۔ آپ جانتے ہیں ہم سیاہ بخت سیہ کوگے "نیک نامی" میں کوئی جگہ نہیں دی گئی ہے۔ کشف و رویا سے قطعاً کسی قسم کا تعلق نہیں ہے تاہم رمضان کا مہینہ ہے ایمان اور روزہ کی سعادت حاصل ہے اسی حال میں مجھے محسوس کرایا گیا کہ آپ کی خدمت میں "استغفار" کی درخواست دوں[1]۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اپنے کو حالانکہ آپ کا مجرم نہیں پاتا، لیکن آپ بھی مجھے مجرم گردانتے ہیں اور آج جس اثر کے تحت یہ عریضہ لکھ رہا ہوں۔ اس میں بھی میں ہی مجرم ٹھہرایا گیا ہوں۔ بہرحال تفصیل کیا عرض کروں[2] نہ اس وقت کہتا ہوں اور نہ شاید کبھی کہہ سکوں۔ بس صرف اس قدر عرض ہے کہ آپ کو میری کسی بات سے کسی قسم کا گزند پہونچا ہو تو للہ اسے معاف فرما دیجئے۔ دس سال سے زیادہ کے حق صحبت کا خیال فرمائیں، کچھ معلوم نہیں کہ زندگی کے کتنے لمحات باقی ہیں۔ کاش! اس سے پہلے کہ میں اٹھایا جاؤں، آپ کا کوئی معافی نامہ مجھے مل جاتا جس سے یہ دل کا کھٹکا نکل جاتا۔ میں ۲۵ رمضان تک حیدرآباد ہی میں ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ خود بھی بخش دیں گے

---

[1] مکان کے قضیۂ نامرضیہ میں مولانا کے طرزِ عمل سے مکتوب الیہ کو شکایت خاصی ہو گئی تھی۔ جس میں وہ اپنے کو حق بجانب بھی پاتا تھا اور اپنی کم ظرفی کی وجہ سے اس کو چھپا بھی نہ سکا، مولاناؒ کے قلب صافی پر شاید اسی کے کچھ انعکاس نے کسی خاص احساس یا رؤیا کی صورت اختیار کر لی ہوگی، ۱۲ (ع)

[2] مولانا بھی کسر نفسی میں کہاں تک اتر آتے تھے غفر اللہ لی ولہ ورفع درجاتہ ۱۲ (ع)

اور میرے لئے مغفرت کی دعا فرمائیں گے۔

نئی خبر یہ ہے کہ مولوی حسام الدین کو آپ کی جگہ بہت راس آئی۔ انھوں نے جوڑ توڑ لگا کر ڈاکٹر حمید اللہ[1] صاحب کی جگہ جواب شعبۂ قانون میں منتقل ہوگئے ہیں، اپنے کو مقرر کرالیا، ان کو حکم ملا ہے کہ مولوی عبدالباری صاحب آنے کے بعد شعبۂ دینیات میں کام کریں گے۔ بس آج سے مجھے اپنے اس خط کے جواب کا انتظار رہے گا۔ کسی عمیق قلبی اشارہ کے تحت خدمت والا میں اس درخواست کو لے کر حاضر ہوا ہوں۔ والدہ صاحبہ قبلہ مدظلہا

[1] جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن میں تعلیم حاصل کی۔ مولانا گیلانی کے عزیز شاگرد ہیں۔ زمانۂ طالب علمی ہی سے غیر معمولی و نمایاں حیثیت رکھتے تھے علمی بھی اور اخلاقی بھی اور یہ علم و عمل ان کے خاندان کا ورثہ تھا عثمانیہ یونیورسٹی کی طرف سے ولایت بھیجے گئے وہاں بھی ان کی دینی حالت میں کوئی فرق نہ آیا۔ واپسی کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی میں قانون اسلامی کے استاد مقرر ہوئے پھر حیدرآباد کے انقلاب کے بعد پاکستان چلے گئے اور وہاں علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے شریک کار رہ گئے لیکن وہاں کا ماحول ان کے مذاق کی تسکین نہ کرسکا۔ پاکستان سے فرانس گئے اور وہاں سے ترکی وغیرہ جاتے رہے اب مستقلاً پیرس میں مقیم ہیں اور علمی و تبلیغی دونوں قسم کی خدمات بہت ٹھوس اور خاموش انجام دیتے رہتے ہیں۔ اُردو، عربی، انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کے مصنف ہیں ان کا بڑا شاہکار "مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ" اور "صحیفہ ہمام بن منبہ" ہے جسے ایڈیٹ کرکے انھوں نے شائع کرایا ہے ان کی تازہ تصنیف Introduction to Islam ہے جس میں مغربی ذہنیت کو سامنے رکھ کر اسلام کا بہت مختصر مگر جامع تعارف کرایا ہے اُردو میں بھی متعدد کتابیں لکھی ہیں (باقی اگلے صفحہ پر)

کی خدمت میں سلام فرما دیجئے۔ انشاء اللہ تعالیٰ اب وہ بالکل اچھی ہوں گی۔

شوریدہ سر

مناظر احسن گیلانی

---

۲۶ رمئی ۱۹۳۷ء مطابق ۱۴ ربیع الاول ۱۳۵۶ھ

رفیقی الکریم سلمکم اللہ تعالیٰ وعافاکم السلام علیکم

خدا جانے کون کہتا ہے، کون پھونکتا ہے۔ اس سال خلاف دستور پورے صوبہ میں یہ اعلان ہوگیا کہ بہار کا پرانا مجرم[1] جو مرض ضیق میں مبتلا کیا گیا تھا۔ اچھا ہوگیا۔ اور "صاحب السیرۃ"[2] بھی ان دنوں وطن ہی میں ہیں۔ ہر چہار طرف سے یلغار[3] کردی گئی۔ بھاگل پور، مونگیر، بستی پور، دربھنگہ، اورنگ آباد، گیا، پٹنہ، داناپور، پھلواری شریف سے لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔ کس کس کو جھڑکتا، آخر جانا پڑا، بڑی مشکل سے جان بچا کر آج بھاگا ہوں کہ دیوبند کا سفر سامنے ہے۔ آج ۲۶ رکو پٹنہ میں لکھنؤ کے فساد کی خبر معلوم ہوئی تھی۔ وہیں سے

(بقیہ صفحہ گذشتہ) جن میں "عہد نبوی میں نظام حکمرانی" "رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی زندگی" اور "عہد نبوی کے میدان جنگ" وغیرہ کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ کثر اللہ امثالہم ۱۲۔

[1] خود مولانا رحمۃ اللہ علیہ ۱۲ (ع)

[2] حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ ۱۲ (ع)

[3] وعظ و تقریر کے لئے۔ (ع)

دریافت خیریت کے لئے میں خط لکھنا چاہتا تھا لیکن امید تھی کہ آپ نے خود خبر دی ہوگی گیلانی میں آپ کا خط نہیں ملا تب خط لکھنے بیٹھا کہ اچانک ابھی ابھی آپ کا کارڈ ڈاکیہ نے دیا۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ بحمد اللہ بعافیت ہیں۔ انشاء اللہ وہ محلہ محفوظ رہے گا ۲۶ر کو جب میں گیلانی ہی میں ہوں گا تو اب آپ سے کہاں ملاقات ہوگی۔ میری آخری گاڑی ہے۔ کل میں روانہ ہوتا ہوں۔ آپ دہلی جا چکے ہوں گے۔ اس لئے یہ عریضہ دہلی لکھ رہا ہوں کیا دیوبند میں ملاقات ہوگی؟ یا آپ لکھنؤ واپس ہوں گے اور واپسی میں وہیں ملاقات ہوگی۔ ان امور سے آپ دیوبند میں مطلع فرمائیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ تھانہ بھون کا بھی خیال ہے۔ برادرم مکارم سلمہٗ پر آج کل حضرت[1] کی عقیدت کا غلبہ ہے۔ جو کچھ آپ کا پروگرام ہو اس سے دیوبند میں مطلع فرمائیں۔ برادرم مکارم احسن سلمہٗ بھی ساتھ جا رہے ہیں۔ اگر آپ دہلی میں رہے تو ممکن ہے میں ان کو تنہا آپ کے پاس دہلی بھیجدوں، کچھ اطباء سے ملنا چاہتے ہیں۔ فقط

مناظر احسن گیلانی

۵ر مارچ سنہ ۱۹۳۸ء مطابق ۳ر محرم سنہ ۱۳۵۷ھ

مخدوم و محترم دامت عنایتکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آپ کا کارڈ حیدرآباد کا چلا ہوا مجھے ذرا دیر میں ملا۔ میں نے اپنی رخصت کے

---

[1] حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ (ع)

ایام کو غنیمت شمار کیا اور اپنے بعض طبی مشیروں کے حکم سے راجگیر[1] چلا گیا تھا۔ جہاں گرم چشموں کے پہاڑ ہیں لوگ ان میں نہاتے بھی ہیں اور ان کو پیتے بھی ہیں۔ ایک ہفتہ کے قریب قیام رہا۔ واقعہ یہ ہے کہ غیر معمولی طور پر میں نے فائدہ محسوس کیا۔ افسوس اس کا ہوا کہ راجگیر میں قیام کا موسم فروری پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد پھر وہاں رہنا بجائے فائدہ کے مضر سمجھا جاتا ہے بہت جلد واپس ہونا پڑا۔ انشاء اللہ تعطیلات محرم کے بعد آپ سے ملاقات حیدرآباد میں ہوگی۔ میرا زخم اب بحمد اللہ بالکل اچھا ہے صرف زخموں پر خشک کھٹی جمی ہوئی ہے۔ بہار کا موجودہ موسم بہت زیادہ خوشگوار اور صحت بخش ہوتا ہے۔ اس پر راجگیر کے قیام نے میری صحت کی بحالی میں بفضل اللہ بڑی اعانت کی۔ اب قوت بھی پوری واپس ہو چکی ہے۔ مکان کا فیصلہ تو آپ کر کے آئے ہوں گے۔ برادرم فضل سلمہٗ کا کوئی خط ادھر نہیں ملا۔ مولوی سجاد صاحب کا ایک خط آیا تھا لیکن اس میں انھوں نے مکان کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

والدہ صاحبہ کی خدمت والا میں میرا سلام پہونچا دیجئے ان کی دعاؤں کا ملتجی ہوں۔ برادرم مکارم سلمہٗ بھی سلام فرماتے ہیں اور بحمد اللہ ہر طرح خیریت ہے

---

[1] راجگیر کے پہاڑ دو متوازی خط کی صورت میں جنوب مغرب کی سمت چلے گئے ہیں۔ درمیان میں ایک تنگ وادی ہے جس میں جگہ جگہ نالے ہیں کسی جگہ پہاڑ کی بلندی ہزار فٹ سے زیادہ نہیں ان پہاڑوں پر جا بجا بودھ مذہب کے آثار موجود ہیں شمال میں علیحدہ ایک پہاڑی ہے جو اس کی بیرونی شاخ کہی جا سکتی ہے پانی کے گرم جھرنے یہاں بکثرت ہیں۔ Dr. Buchanan Hamilton (باقی اگلے صفحہ پر)

مولانا سعد الدین[1] صاحب کے خطوط خیریت کے آئے ہوں گے ان کی خیریت سے بھی
مطلع فرمائیں۔ اگر ادھر خط لکھنے کا خیال آجائے۔

مناظر احسن گیلانی

(حاشیہ بقیہ صفحہ گذشتہ) نے لکھا ہے کہ راجگیر وہی راجگیر پہاڑ ہے جو بودھ گوتما کا مسکن اور قدیمی مگدھ امپائر کا پایۂ تخت تھا مہاتما بودھ نے برسوں یہاں بیٹھ کر دھیان جمایا۔ راجگیر کے معنی شاہی مسکن ہیں۔ دامن کوہ میں ایک گرم جھرنے سے قریب حضرت مخدوم یحییٰ شرف الدین منیری رحمۃ اللہ علیہ کا حجرہ ہے جو دیکھنے کے قابل ہے چاروں طرف بڑے بڑے پتھر آکر مل گئے ہیں جس نے دیوار کی شکل اختیار کر لی ہے اور اوپر ایک پتھر بطور چھت کے رکھا ہوا ہے اونچائی صرف اتنی ہے کہ آدمی بیٹھ سکتا ہے قدرت نے یہ سنگی حجرہ اس طرح بنایا ہے کہ آمد و رفت کے لئے ایک دروازہ اور روشنی و ہوا کے لئے ایک دریچہ پیدا ہو گیا ہے، اسی حجرہ میں حضرت مخدوم بہاری برسوں تشریف فرما رہے ہیں۔ یہیں ایک مقام ہے جو مخدوم صاحب چلّہ کے نام سے موسوم ہے۔

بہرحال راجگیر بڑی قدیم اور تاریخی جگہ ہے اور یہاں کی پہاڑی اور جنگل زمانہ قدیم سے مختلف مذاہب کے عابدوں اور زاہدوں کا مسکن اور مرکز رہے ہیں جن کے آثار آج بھی موجود ہیں یہاں کی آب و ہوا صحت بخش اور پانی مختلف امراض کا علاج ہے بہت سے لوگ محض تبدیلی آب و ہوا کی غرض سے آتے ہیں راقم الحروف نے تو راجگیر کی حاضری کے موقعہ پر ایسا قلبی سکون اور روحانی طمانیت محسوس کی جس کا بیان مشکل ہے خصوصاً مخدوم صاحب کے حجرہ میں دو رکعت نماز ادا کرنے کے بعد۔

[1] مکتوب الیہ کے چھوٹے بھائی مرحوم ۱۲ (ع)

۲۲/اپریل ۱۹۳۸ء مطابق ۲۰/صفر ۱۳۵۷ھ

سیدی و صدیقی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

اس دن گاڑی لیٹ تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دن بھر کیئول[1] میں بیٹھنا پڑا۔ اور بجائے صبح کے شام کو بعد مغرب گیلانی پہونچا۔ برادرم مکارم سلمہ موٹر شیخپورہ[2] سے لے آئے تھے۔ اس سے بڑی آسانی ہوئی۔ ورنہ رات کو کہاں کہاں بھٹکتا۔ اس کے بعد

---

[1] مین لائن کا ایک بڑا اسٹیشن جہاں سے مین لائن اور لوپ لائن باہم جدا ہوتی ہیں۔ ۱۲

[2] شیخپورہ ضلع مونگیر کا ایک مشہور قصبہ اور جنوبی مونگیر کے مرکزی مقامات میں ہے جس کے اطراف میں زیدی سادات کے بارہ گاؤں وندھیاچل کے سلسلہ کی ایک پہاڑی کے نیچے مسلسل آباد ہیں۔ آٹھویں صدی ہجری میں حضرت شیخ شعیب رحمۃ اللہ علیہ صاحب تذکرۃ الاصفیاء نے اس پہاڑ و جنگل میں ڈیرا ڈالا۔ اور ویرانہ نے آبادی کی شکل اختیار کی۔ شیخ موصوف حضرت مخدوم الملک شاہ شرف الدین یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ کے مرید و حضرت حسن بن حسین المعروف بہ نوشہ توحید کے مجاز تھے۔ حضرت نوشہ توحید کو حضرت مولینا مظفر بلخی سے اجازت حاصل تھی اور شیخ بلخی حضرت مخدوم الملک کے ممتاز خلفاء میں تھے۔ حضرت شیخ شعیب نے ابتداءً جہاں قیام فرمایا وہ جگہ اب بھی محلہ سکونت کے نام سے موسوم ہے۔ بعد کو حضرت شیخ محلہ بیگھو میں چلے آئے۔ جہاں خانقاہ بنی جو آج بھی موجود ہے اور جناب شاہ نجم الدین صاحب سجادہ نشین کے ذریعہ آباد ہے۔ قصبہ شیخپورہ کی موجودہ آبادی تقریباً پندرہ ہزار ہے جس میں تقریباً نصف مسلمان ہیں یہی شیخپورہ فاضل گیلانی کے وطن کا اسٹیشن ہے یہیں اتر کر موٹر بس کے ذریعہ گیلانی جاتے ہیں شیخپورہ سے گیلانی کی مسافت ۱۳ میل ہے ۱۲

شیخپورہ کی مسلم لیگ کا یہاں ہنگامہ شروع ہوا۔ پہلے تو میں چھپا رہا لیکن شوکت[1] صاحب جب آئے تو بے ساختہ ان سے ملنے کو جی چاہا۔ لیڈروں کو میری ہی موٹر کیبول سے شیخپورہ لارہی تھی۔ راجہ صاحب تو بارہ بنکی سے بوجہ درد قولنج واپس ہو گئے، لیکن جمال[2] میاں اور چودھری[3] لکھنؤ سے آئے میں بھی آخر پکڑا گیا اور ایک مختصر تقریر کرنی ہی پڑی۔ حیدرآباد[4] کا

[1] مولینا شوکت علی مرحوم ۱۲ (ع)

[2] ہندوستان کے مشہور عالم اور تحریک خلافت کے رکن رکین مولینا عبدالباری صاحب فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے مولوی جمال الدین محمد عبدالوہاب صاحب ربیع الاول ۱۳۳۸ھ مطابق دسمبر ۱۹۱۹ء میں پیدا ہوئے حفظ قرآن مجید کے بعد مدرسہ نظامیہ فرنگی محل سے فراغت حاصل کی۔ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر اسمبلی کے ممبر رہ چکے ہیں تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلے گئے اور اب ڈھاکہ میں قیام پذیر ہیں اور تجارت میں مشغول۔ ۱۲

[3] چودھری خلیق الزماں اودھ کے مشہور ذہین اور سیاسی مسلم رہنما جو کانگریسی ممبروں کی اکثریت کے باوجود عرصہ تک مسلسل لکھنؤ کے چیرمین رہے، کونسلوں میں بھی رہے، اپنے صوبہ میں مسلم لیگ کے رکن رکین اور روح رواں تھے۔ مشہور ہے کہ اگر کانگریس نے یوپی میں نواب اسماعیل خاں اور چودھری خلیق الزماں کو وزارت میں لے لیا ہوتا تو نہ مسلم لیگ اس قدر زور پکڑتی اور نہ پاکستان بنتا۔

تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلے گئے اور مختلف مناصب پر رہے۔ لیکن ان کی حسب حیثیت وہاں ان کی پذیرائی نہ ہو سکی

حال اخبارات میں پڑھا ہوگا۔ میاں مشتاق کے خط سے معلوم ہوا کہ خاص عثمان[1] شاہی میں بھی اچھی مار پیٹ ہوئی۔ خدا جانے کیا واقعہ پیش آتا، اگر ہم لوگ وہاں ہوتے۔ عجیب بات ہے کہ شروانی صاحب کا خط حبیب[2] گنج سے آیا ہے جس میں حیدرآباد کا ذکر بھی نہیں ہے کیا یہ عبدالحمید[3] خاں کا صرف شوشہ تھا جو اخباروں تک پھیل گیا۔ میں اس کے بعد پٹنہ بھی گیا۔ خطبہ سنا دیا گیا۔ شکر ہے کہ پسند کیا گیا۔ "سرچ لائٹ[4]" نے اس کا خلاصہ دو صفحوں میں شائع کیا۔ لیکن پٹنہ میں ایک عجیب سانحہ پیش آیا۔ مکارم سلمہٗ کی لڑکی کا جس لڑکے سے عقد ہوا ہے وہ پٹنہ کالج کے سال سوم میں پڑھتے ہیں، چند دن ہوئے کہ ان کو زکام و نزلہ کے ساتھ بخار ہوا، اچھا ہوا، امتحان کی وجہ سے محنت کرنی پڑی۔ بخار عود کر گیا، اور کھانسی بھی، بلغم میں ایک دو دفعہ سرخی بھی محسوس ہوئی۔ اب نہ پوچھئے ہنگامہ برپا ہو گیا ہے۔ اگرچہ ڈاکٹروں حکیموں نے پوری امید دلائی ہے کہ خطرہ کی بات نہیں ہے لیکن احتیاطاً رخصتی کی تاریخ ہٹانی پڑی اور اس سال امتحان سے بھی ان کو روک دیا گیا۔ سب سامان ہو چکا تھا اب یہ حادثہ پیش آیا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ دعا کیجئے کہ حق تعالےٰ

[1] حیدرآباد کا ایک محلہ جہاں استاد مرحوم مفتی عبداللطیف صاحب کا دولت کدہ ہی مولینا اور مکتوب الیہ کا قیام گاہ تھا۔ ۱۲ (ع)

[2] ضلع علیگڑھ میں مولینا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی مرحوم کا بسایا ہوا گاؤں جسے مولینا نے وطن بنا لیا تھا۔ ۱۲ [3] شروانی صاحب کے سالے ۱۲ (ع)

[4] صوبہ بہار کا مشہور و قدیم انگریزی روزنامہ جو پٹنہ سے شائع ہوتا ہے ۱۲

اس مشکل کو آسان فرمائیے۔ ابھی روپیہ کہیں سے نہیں آیا ہے آموں کے نسخے کے متعلق برادرم مکارم آپ کو مستقل جواب دیں گے۔ کہئے خربوزوں کا کیا حال ہے پپیتا خوب چل رہی ہے۔ فقط

مناظر احسن گیلانی

۲۴ر مئی ۱۹۳۸ء مطابق ۲۴ر ربیع الاول ۱۳۵۷ھ

گیلانی (بہار)

رفیقی الکریم وصدیقی الحمیم دمتم بالہناء والرفاہیۃ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خدا جانے کس وقت کس نیت سے آپ نے خربوزے روانہ فرمائے کہ کچھ عجیب حالات اس کے ساتھ پیش آئے۔ منجملہ ان عجائبات کے پہلا عجوبہ یہی ہے کہ شاید جتنی تاخیر سے اس کی رسید جا رہی ہے میں نے آپ کے کسی گرامی نامہ کے جواب میں بھی اتنی تاخیر نہ کی ہوگی۔ اور یہ تو پہلا عجوبہ ہے۔ دوسرا تیسرا الخ سنتے چلے جائیے۔

جس دن آپ کا گرامی نامہ ملا کہ پارسل روانہ ہو چکا ہے ٹھیک اسی وقت ہمارا پورا گھر اپنے ایک خاص عزیز کی تقریب میں شرکت کے لئے دسنہ جا رہا تھا۔ حیرت تھی کہ اب کیا جائے تو کیا کیا جائے۔ بہرحال یہی سوچا گیا کہ خواہ ملٹی ملے یا نہ ملے لیکن آدمی

۱؎ الحمد للہ پوری صحت ہو گئی۔ ۱۲ (ع)

شیخپورہ جائے اور جائز و ناجائز جس ذریعہ سے ممکن ہو پارسل چھڑا لے اور اسی وقت اس کو دسنہ روانہ کرے۔ یہی کیا گیا، ہم لوگ دسنہ چلے گئے۔ دوسرے دن دوپہر کے قریب ٹوکرا وہیں پہونچا۔ کیا یہ عجیب نہیں ہے کہ مولینا عبدالباری صاحب کا بھیجا ہوا خربوزہ مولینا سید سلیمان صاحب کی میز کی زینت بنا۔ تصور سے کیا یہ بالاتر واقعہ نہیں ہے۔ بہرحال اس خوف سے کہ ضائع ہو جائے گا دسنہ ہی میں احباب کو تقسیم کیا گیا۔ میاں مرحوم کیلئے یہی فضیلت کافی تھی کہ لکھنؤ خاص سے انکے نام خربوزہ آتا ہے اور آتا ہے ایک ایسے بزرگ کی جانب سے جس کے قلم کی لکھی ہوئی کتابوں سے دسنہ[1] لائبریری کی کم از کم الماری کا ایک طبقہ تو ضرور بھرا ہوا تھا[2]۔ سید صاحب سے خوب خوب ملاقاتیں دسنہ میں ہوئیں، اور یہ انجام اس خربوزہ کا ہوا۔ آپ ہی کے نزدیک تو وہ ادنیٰ تھا لیکن ہم بہاریوں کے لئے "ادنیٰ" کا بلند مقام ایک خربوزہ کے لئے بھی ہو سکتا ہے۔ اب سنئے اس کے بعد ہم لوگ گیلانی واپس ہوئے یہاں آکر ملٹی ملی۔ بیچارے مکارم چونکہ تقریباً آتی کھانوں کے بعد عموماً بیمار ہو جاتے ہیں، معدہ بے قابو ہو گیا ہے۔ تین دن سے صاحب فراش ہے گویا غذا بند ہے[1]

۱؎ دسنہ ضلع پٹنہ کی مشہور اور قیمتی لائبریری جو اخبارات و رسائل کے پرانے اور مکمل و مسلسل فائل و مجلدات کے لئے خصوصیت کے ساتھ نادر شمار کی جاتی ہے افسوس کہ باہمی اختلافات کے باعث ابھی حال میں لائبریری کی کتابیں کتب خانہ خدابخش خاں پٹنہ میں منتقل کر دی گئیں۔ ۱۲

۲؎ مکتوب الیہ کے قلم سے اتنی کتابیں کہاں سے آگئیں۔ شاید عثمانیہ یونیورسٹی کے ترجمے بھی مراد ہوں۔ مگر تعداد ان کو ملا کر بھی اتنی کہاں۔ ۱۲ (ع)

اور اسی کے ساتھ ان کی ایک لڑکی بیچاری تقریباً ایک ہفتہ سے بخار میں مبتلا ہو گئی ہے۔ ایک سو چار پانچ تک بخار چڑھ جاتا ہے اور اترتا نہیں سخت تشویش میں اس وقت ہم مبتلا ہیں ان ہی حالات نے خط لکھنے کی بھی فرصت نہ دی۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ ربیع الاول کا آگیا ہے مہینہ۔ ہر گاؤں، قصبہ، شہر سے لوگوں کا تانتا بندھا ہوا ہے، طرح طرح کے وسائل اختیار کئے جاتے ہیں۔ دس سے انکار کے بعد ایک سے اقرار کرنا ہی پڑتا ہے، کم از کم اب تک پانچ چھ تقریریں کرنی پڑیں۔ اور ابھی سلسلہ رکتا ہوا نظر آتا نہیں۔ آپ سے عرض کیا تھا کہ میرے باغ میں جو جو آم سویرے پکتے تھے ان میں اس سال کوئی نہیں آیا غضب تو اس مٹھوا[1] نے کیا کہ میری چہل سالہ سے زیادہ زندگی میں پہلی دفعہ صفر ہو گیا ہے۔ اعلان اسی کا تھا لیکن جب کیریاں پتوں سے باہر ہوئیں تو بمشکل پندرہ بیس آم ہاتھ آئے۔ اب امید جو کچھ ہے لنگڑے کی ہے۔ لنگڑے کے بعض درختوں میں جو کچھ پھل ہیں غنیمت ہیں لیکن افسوس کہ میرے جانے سے پہلے دیکھئے وہ پکتے بھی ہیں یا نہیں۔

مناظر احسن گیلانی

---

[1] بہار کا بڑا خوش مزہ ہی نہیں بڑا خوشبودار و لطیف آم۔ برادرم میاں مکارم سلمہٗ کے کرم سے کبھی کبھی لکھنؤ تک پہونچ جاتا تھا۔ جب تک کمرہ میں رہتا کمرہ معطر رہتا۔ ۱۲ (ع)

۵ر جون ۱۹۳۸ء مطابق ۶ر ربیع الآخر ۱۳۵۷ھ

صدیق الصدوق عافاکم اللہ وحماکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

"شکر" کی خبر نے جو نمک پاشی کی کیا عرض کروں "مرے کو ہی ماریں شاہ مدار" یوں ہی آپ کیا تھے جو آپ سے اب یہ نکالا جا رہا ہے[1]۔ خدا ہی جانتا ہے کہ عباد کے ساتھ اس کے کیا مصالح ہیں بیں تو یہی سمجھتا ہوں کہ "یہ شکر" بھی "شکر" ہی کی سزا دار ہے، ہو لے جو کچھ ہونا ہے یہیں ہو لے۔ آج جب کہ اس دنیا کے مصائب ہمارے لئے ناقابل برداشت بن رہے ہیں اسی سے اندازہ فرمائیے کہ پھر جس دنیا کی ہر شے میں بقا ہے اس کے تحمل کی طاقت کس میں ہو سکتی ہے، عموماً "گڑمار" دوا کے متعلق مشہور ہے کہ اس کے لئے مفید ہے بہ مشورہ اطباء اسی کو استعمال کیجئے اور اس سے صبر حاصل کیجئے، کہ آج جس مکان میں آپ سے شکر سے روکے گئے ہیں اسی مکان[2] میں کوئی ایسا بھی تھا جو نمک سے روکا گیا تھا۔ رک جائیے جس سے روکا جائے۔ انشاء اللہ ابھی ابتدا ء امر ہے۔ آپ پرہیز سے کام لیجئے۔ اللہ تعالیٰ شفا عطا فرمائے گا۔ باقی آموں کا کیا ہوگا۔ کیا آموں کی شیرینی بھی ممنوع ہے؟

اب حیدرآباد اور اس کے حالات دماغ پر اپنے موسل چلانے لگے۔ کیا عرض کروں۔ اب کی تو ایک نئی دنیا[3] کے ساتھ حیدرآباد کا ارادہ ہے۔ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔

---

[1] مکتوب الیہ کو کچھ شکر آنے لگی تھی۔ ۱۲ (ع)

[2] خود مولانا جو مکتوب الیہ کے اسی مکان میں کئی مہینے زیر علاج رہے اور نمک کا قطعی پرہیز تھا۔ ۱۲ (ع)

[3] اہل و عیال کے ساتھ۔ ۱۲ (ع)

ڈاکٹر عثمان[1] کے پاس والے مکان کے متعلق لکھ دیا ہے کہ امرداد[2] الف سے بحق میرے اس کو قبضہ میں لے لیا جائے۔ اب تو اسی میں جا کر انشاء اللہ اترنا ہے

یہاں کا حال کیا لکھوں آج سولہواں دن ہے مکارم سلمہٗ کی لڑکی کا میعادی بخار بدستور باقی ہے۔ صبح و شام اسی حال میں بسر ہو رہی ہے۔ دنیا کا عجب حال ہے دیکھئے کب اس زندگی سے فرصت ملتی ہے۔ کل عبدالحق (اردو) دسنہ آ رہے ہیں۔ مجھے بھی بلایا گیا ہے موسمی حالات ٹھیک رہے تو ارادہ ہے کہ ہو آؤں۔ برسات سے پہلے برسات کا آغاز ہو گیا ہے تقریباً کچھ نہ کچھ روزانہ اس کے آثار ظاہر ہوتے ہیں۔

آج کل نہ معلوم کیوں "رب العالمین" اور "ربی الاعلیٰ" پر دماغ متوجہ ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "طبیعت" "نیچر" "فطرت" "مادہ" یہ شیر کے منہ کے پتھر تھے۔ ان کو حذف کر دینے کے بعد رب اور مربوب میں کیا پردہ رہ جاتا ہے اور مربوب سے رب کیا جدا ہو سکتا ہے۔ کیا درخت سے اس کی طبیعت اس کا مزاج اس کی صورت نوعیہ جدا ہو سکتی ہے "پرورش کرنے والی قوت" کو جب "ربی الاعلیٰ" کی تعبیر و اضافت کے

---

[1] ڈاکٹر ہی نہیں بڑے شریف النفس انسان اور مسلمان۔ اوپر ۱۹ ستمبر ۱۹۳۶ء کے مکتوب کے ذیل میں جس نو تعمیر مسجد اور اس کے حجروں کا ذکر ہوا وہ موصوف ہی کی اسلامیت و محبت کی یادگار ہیں۔ احسن اللہ جزاءہ، اور مولانا کا حیدرآباد میں آخری قیام ڈاکٹر صاحب کے ذاتی مکان کے پاس کیا دیوار بیچ بالکل ملا ہوا تھا۔ ۱۲ (ع)

[2] الف حیدرآباد کا فصلی مہینہ۔ ۱۲۔

ساتھ سوچتا ہوں تو پستی میں بڑی بلندی محسوس ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب میں صرف اپنی قوت کا پرستار ہوں۔ عجب حال ہے اس خود پرستی کا۔ "مربوب" اسی قوت "ربیہ" کا اثر معلوم ہوتا ہے[1]، لکھ دیا، شاید کچھ آپ سے پاؤں، یا آپ ہی کچھ پائیں۔ والدہ صاحبہ بیچاری کا کیا حال ہو گا۔ "سرف آزمائش" زندگی ہے ان سے سلام عرض کر دیجئے۔ اپنی خیریت اور جو حالات اس کے بعد پیدا ہوئے اس سے بواپسی ڈاک مطلع فرمائیے۔

فقط۔

مناظر احسن گیلانی

یوم الجمعہ

۱۰ر جون ۱۹۳۸ء، ۱۸ر ربیع الآخر ۱۳۵۷ھ

سیدی و رفیقی فی الدنیا والآخرہ   السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

کل پھر "زندان دکن" کی طرف میرا ابن یاس ہونے والا ہے۔ اور پھر "عرفان رب" کے ساتھ یہ جانا ہو رہا ہے۔ "فسخ عزائم" سے تو آپ جیسے اولوالعزم رب کو پاتے ہیں لیکن "فسخ و یادیں" میں بھی اگر کسی کو یہ یافت میسر ہو تو کیا کیجئے۔ یعنی حالات نے پھر اجازت نہ دی کہ اکیلا روانہ ہو سکوں۔ خیر "استخارہ" نے جب اس اثر کو پیدا کیا ہے تو اس کے سوا جو کچھ بھی ہے شر کے سوا اسے اور کیا قرار دوں۔ ایسا کیوں ہوا۔ اصلی اسباب تو وہی ہیں

---

[1] مولانا کے خاص مذاق توحید وجودی کے اشارات، ۱۲ (ع)

جو عرض کئے گئے۔ باقی "جھوٹ پھوس" بھی کچھ ہے اس کو سنکر کیا کیجئے گا۔

شکر ہے کہ آپ کی "شکر" الحمد للہ غائب ہو گئی۔ لیکن اس سے آپ کو بھی مغالطہ ہوا اور غالباً گیلانی والوں کو بھی آپ نے جس پہلے خط میں اس کی خبر دی کہ میں "شکر ریز" ہو گیا ہوں۔ اسی میں لکھنا تھا کہ "الاحلوایا" کا استشار بھی ڈاکٹروں نے فرمایا ہے۔ اس وقت "الحلوا" کلھا، لکھا۔ اب استشار کرتے ہیں۔ جب آم کی اس خاص فصل میں یوں ہی کمی تھی اگرچہ میاں مکارم پر بگڑ رہا ہوں اور اصرار کر رہا ہوں کہ جس طرح ممکن ہو خریزہ کا معاوضہ تم کو ادا کرنا چاہئے لیکن کچھ تو وہ اپنی لڑکی کی طویل علالت سے بوکھلائے ہوئے ہیں۔ آج تقریباً چھبیسواں دن ہے گو حالت روبہ اصلاح ہے لیکن بخار کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ بہرحال بندہ تو روانہ ہوتا ہے۔ اب میاں مکارم لنگڑا بھیج کر استقامت کا ثبوت دیتے ہیں یا خود لنگڑے بن کر خود اپنے کو، مجھے، اور سارے گھر بھر بلکہ شاید سالے صوبہ کو رسوا کرتے ہیں۔ ایک لطیفہ یہ بھی ہے کہ ٹوکری جس پر اس ہدیہ کا ارسال بنی تھا، اس میں آم بھر کر میاں ہمی صاحب کو بازید پور بھیجی گئی۔ ہمی صاحب نے اس ٹوکری کو اپنے سسرال کو بھی بھیج دیا۔ اب اگر آپ کی ٹوکری واپس نہ ہوئی تو اس کا الزام ایک حد تک میاں ہمی کے ذمہ بھی آتا ہے۔ آپ نے رخصت لے لی۔ خوب[1] کیا۔ ہائے میں کیا کروں، کل کس طرح جاتا ہوں، بس جاتا ہوں۔ فقط مناظر احسن گیلانی

---

[1] مکتوب الیہ اصل میں تو قبل از وقت (وہ سالہ) سے پہلے ہی پنشن کے لئے کوشاں رہا اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ رخصتیں زیادہ لیتا رہا۔ ۱۲ (ع)

۱۸ر اپریل ۱۹۳۹ء مطابق ۲۷ر صفر ۱۳۵۸ھ

الرفیق الی الطریق جبی الصادق سلمہ وفقکم اللہ ایماناً کاملاً وھداکم صراطاً مستقیما

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

گیلانی پہونچنے کے ساتھ ہی مجھے مختلف تقریبوں میں شریک ہونے کے لئے آس پاس کے دیہاتوں میں گشت کرنا پڑا۔ میرے بہنوئی[1] بھی سفر حج سے واپس تشریف لائے ہیں۔ وہاں بھی دو دفعہ جانا پڑا۔ الغرض انھیں الجھنوں میں ایسا الجھا رہا کہ خط لکھنے کی نوبت نہ آسکی۔ اس عرصہ میں آپ کا بھی کوئی گرامی نامہ نہ ملا۔ وجہش خیر باد۔

کل ڈاکٹر صاحب قبلہ کا گرامی نامہ ملا جس سے اطمینان ہوا کہ انشاء اللہ تعالیٰ خیریت ہے۔ آپ کی والدہ مدظلہا کی طرف دل لگا رہتا ہے معلوم نہیں اب کہاں ہیں اور ان کی صحت کیسی ہے؟ ہمارے یہاں تقریب[2] ۲ رمئی کو انشاء اللہ ہو گی۔ اس گرمی میں آپ کو کیا زحمت دی جائے اگرچہ آموں کی بہار ہے بارش نے موروں کو بالکل گلا دیا ہے لیکن نہ معلوم کس طرح قلمی آموں میں کیریوں کی کافی مقدار محفوظ رہ گئی ہے۔ آج کل پچھیا تند و تیز ہوا میں کیریاں ہزاروں کی تعداد میں گرتی ہیں۔ دیکھئے پکنے تک کیا حال رہتا ہے۔ اخبارات سے لکھنؤ کی حالت معلوم ہوتی رہتی ہے۔ کہاں ہو، کب ہو، کن

---

[1] مولانا سید منت اللہ صاحب رحمانی مدظلہ (امیر شریعت بہار و اڑیسہ) مرتب مکاتیب گیلانی کے برادر اکبر مولانا لطف اللہ صاحب مرحوم۔ ۱۲ (ع)

[2] غالباً مولانا کے صاحبزادہ محی الدین سلمہٗ کی۔ ۱۲ (ع)

دستوں پر ہو، کس طرح ہو۔ جب یہ سارے معقولات حکومت نے اپنے ہاتھ ہی رکھے ہیں تو آزادی کیا ملی۔ جب تک آدمی نہ ملے، چیونٹیوں ہی پر توپ چلاتے رہیئے۔ ادھر دو تین دن سے نہ معلوم کیوں میں اپنے بعض سیاسی خیالات میں تغیر[1] پاتا ہوں۔ حالانکہ اب تک کسی مولوی نے مجھ کو نہیں چھوڑا ہے۔ شاید میری مولویت کا بھی اثر عملی طور پر تو کچھ نہ پہلے تھا، نہ اب ہے لیکن نظری طور پر وہی انجام ہو جو ہر مولوی کا ہے غالباً دل ان لوگوں[2] کو بھی حکومت ہی کی طرح صم و بکم خیال کرنے لگا ہے جو مسلمانوں کی طرف سے بولنے کے مدعی تھے۔ اور کوئی نئی بات نہیں ہے۔ حیدرآباد اب تو گاؤں گاؤں میں گھس گیا ہے۔ افترا پردازیوں کی گرج اور کڑک میں اس کی سواری اس گاؤں سے اس گاؤں تک گشت کرائی جا رہی ہے۔ البانیہ کے ساتھ محافظ اسلام[3] نے جو کچھ کیا اس پر اس پر تعجب نہیں ہوا کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ بلکہ اب تک کیوں نہیں کر رہا تھا اس پر حیرت تھی اور جب تونس کا رسیکا کا نام لیا جاتا تھا تو تعجب ہوتا تھا کہ البانیہ کو کیوں بھولے ہوئے تھے۔ بچوں کو دعا۔

---

[1] مولانا وطنی یا قومی نام نہاد آزادی کے قائل نہ تھے بلکہ انگریزی حکومت کو غنیمت تصور فرماتے تھے۔ شاید اسی میں کچھ تغیر کی طرف اشارہ ہو۔ لیکن اب آزادی کے بعد بہت سے "مولویوں" کو بھی قدر عافیت ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ معلوم ہو رہی ہے۔ ۱۲ (ع)

[2] غالباً یورپ مراد ہے۔ ۱۲۔

مولوی فضل صاحب کا خط آیا تھا۔ اسفار[1] کا ترجمہ برائے نظر ثانی ابتک نہیں آیا ہے البتہ فصوص[2] الحکم کے متعلق ایک استفسار آیا تھا لیکن مولینا عبد القدیر شاید اس کام کو کر چکے ہیں۔ یہ رسمی مراسلہ تھا۔ فقط

مناظر احسن گیلانی

---

۱۰ راپریل ۱۹۴۰ء مطابق ۸ ربیع الاول ۱۳۵۹ھ

حبی الصدوق! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میں نے چاہا تھا کہ آپ کو اپنی رسید روپے کے ساتھ بھیجوں لیکن امام[3] الائمہ کے

---

[1] اسفار اربعہ جس کا ترجمہ مولینا شعبۂ تالیف و ترجمہ کی طرف سے فرما رہے تھے اور فصوص الحکم (شیخ ابن عربی) کے ترجمہ کے لئے بھی مکتوب الیہ کی تجویز پر مولینا سے درخواست کی گئی تھی۔ ۱۲ (ع)

[2] فلسفۂ تصوف پر حضرت شیخ اکبر محی الدین بن عربی کی مشہور ترین کتاب جو ستائیس فصوص پر مشتمل ہے۔ اور ہر فص میں ایک حکمت بیان کی گئی ہے جسے کسی ایک نبی کے کلمے سے اخذ کیا ہے حضرت حافظ عبد الرحمٰن ملا جامی اور حضرت شیخ عبد الغنی نابلسی نے فصوص الحکم کی شرحیں لکھی ہیں اور اس پر حواشی چڑھائے ہیں۔ اور شیخ ابن عربی کے الفاظ و اشارات کو حل کیا ہے۔ ۱۲

[3] مراد مولانا فضل صاحب۔ جن کا مالی اجتہاد کبھی کبھی الٹا نتیجہ پیدا کر دیتا تھا مگر "نیت بخیر" کا اجر تو حاصل ہی فرما لیتے۔ ۱۲۰ (ع)

مالی اجتہاد نے عجب شکل میں مبتلا کر دیا۔ تنخواہ حضرت نے بذریعہ بیمہ بھجوائی۔ اور اس میں ایک نوٹ ہزار روپیہ کا ہے۔ آنے دوآنے کا وزن کے اعتبار سے نفع تھا۔ غالباً اسی لئے یہ کیا گیا مصارف منھ پھاڑے چاروں طرف سے جھانک رہے تھے۔ جب تک یہ ہزار کا نوٹ نہ بھنے گاڑی رکی ہوئی ہے بھلا اس کوردہ میں ہزار کے نوٹ کا خریدار کون ہوسکتا ہے۔ نہ بربیگھ[1] میں نہ بہار شریف[2] میں۔ ناچار کل میاں مکارم کو پٹنہ بھیجا ہے امپیریل بنک میں شاید بھن جائے۔ وہ گئے ہیں دیکھئے وہاں سے کیا جواب ملتا ہے۔ گویا انجمن اتحاد المسلمین کے ٹکٹ کا حال ہوا۔ ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہیں۔ ۲ر کی جگہ اب دس روپیہ کی چپت ہے شہر کے آنے جانے میں اس سے کیا کم خرچ ہوگا۔ مجبوراً اب سادہ خط لکھ رہا ہوں۔ تو قصہ یہ ہوا کہ آٹھ بجے گاڑی دریاآباد پہونچی۔ سامان لے کر اترا، یوں ہی دل میں خیال آیا۔ اسٹیشن پر جو لوگ موجود تھے ان سے پوچھا کہ مولینا[3] تشریف فرما ہیں یا نہیں، پہلے تو کچھ مبہم سا

[1] بربیگھ جنوبی مونگیر کا ایک مرکزی مقام، جہاں چھوٹا بازار بھی ہے۔ آس پاس کے گاؤں والے اپنی ضرورتیں اسی بازار سے پوری کرتے ہیں۔ گیلانی سے صرف ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر شیخپورہ سے موٹر بس بربیگھ آتی ہے اور یہاں اتر کر لوگ گیلانی جاتے ہیں ۱۲۔

[2] فاضل گیلانی نے نظام تعلیم و تربیت میں لکھا ہے "صوبہ بہار میں" بہار "نامی ایک قصبہ بھی ہے جو اسلامی عہد میں بہار کا عاصمہ (پایہ تخت) تھا اور اب ضلع پٹنہ کا ایک معمولی سب ڈویژن کی حیثیت رکھتا ہے۔ بہار ایک قدیم آبادی کا قصبہ تھا اور آج مسلمانوں کی آبادی کا اچھا خاصا شہر ہے حضرت مخدوم الملک بہاری رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ اور آپ کا مزار مبارک اسی قصبہ میں ہے ۱۲

[3] حضرت مولینا عبد الماجد دریاآبادی (ع)

جواب ملا لیکن جب چند قدم آگے بڑھا تو ایک صاحب نے حتماً اطلاع دی کہ آج بارہ بجے کی ٹرین سے وہ باہر گئے۔ زمین پاؤں سے نکل گئی۔ لیکن شکر ہے کہ گاڑی پانی لینے کے لئے ٹھہری ہوئی تھی، الٹے پاؤں قلی کو ساتھ لے کر اسی ڈبہ میں واپس آگیا۔ ٹکٹ تو پٹنہ ہی کا تھا۔ بھوکا بھی تھا۔ کباب روٹی والے سے چند چپاتیاں اور کباب لے کر رات کا کھانا دریاآباد کے اسٹیشن پر کھایا۔ لکھنؤ سے بہار کے ایک رضائی عالم مولوی ظفیر الدین[1] وہی جنہوں نے مشرقی کے قبلہ کو معارف میں درست کیا ہے ساتھ ہوگئے تھے۔ ان ہی کے ساتھ صبح کو بانکی پور پہونچا۔ مولوی لطف اللہ[2] کو دیکھ کر ہوش اڑ گئے۔ بہت نازک حال میں پایا۔ اور ان سے زیادہ نازک حال بہن سلمہا کا تھا۔ ڈیڑھ سال سے یعنی آغاز سفر حج سے اس وقت تک عافیت کی زندگی سے محروم ہے، اتنا غنیمت ہے کہ ٹی، بی کا جو شبہ تھا جس دن میں پہونچا اسی دن ڈاکٹر نے رپورٹ بول وبراز کے امتحان کے بعد دی تھی۔ اس کے جرم برآمد نہ ہوسکے۔ باقی معدہ، گردے دونوں ماؤف ہیں چونکہ آنتوں میں دانے ہیں اس لئے زبان اور منھ بھی پک پک جاتے ہیں۔ ڈاکٹری علاج ہو رہا ہے۔ بہن کے اصرار سے تین دن بانکی پور ٹھہر رہا۔ اور علاج ومعالجہ کے متعلق ان کے

[1] علوم عربیہ کے فاضل اور علم ہیئت کے نامور اور جید عالم ایک عرصہ تک مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ میں مدرس رہے اور پھر پرنسپل ہو کر ریٹائر ہوئے۔ نظام شمسی پر "مئوذن الاوقات" نامی ایک کتاب لکھی جو اہل علم میں مستند شمار کی گئی اور مقبول ہوئی۔ ماشاء اللہ بقید حیات ہیں اور کچھ درس وتدریس میں مشغول ہیں حدیث میں ایک کتاب "صحیح بہاری" کے نام سے لکھی ہے۔

[2] مولانا کے بہنوئی اور راقم الحروف کے بڑے بھائی مرحوم ۱۲۔

تھانوی[1] اور دوستوں سے مشورہ ہوتا رہا۔ حق تعالیٰ رحم فرمائے۔ آپ بھی دعا کیجئے۔ سب سے بڑی مصیبت ان کی معکوس فطرت ہے۔ جو کچھ کہا جاتا ہے اس کے خلاف کرنا ان کے فرائض میں سے ہے ان کے مریدوں کا خیال ہے کہ حضرت نے سال بھر کا تپسیا کیا ہے اور جب میقات تمام ہو جائے گی اچھے ہو جائیں گے۔ خدا کرے اس حسن ظن کے ساتھ ان کا رب بھی ہو۔

اور کوئی نئی خبر نہیں ہے۔ البتہ پیام[2] اخبار سے یہ معلوم کر کے سخت صدمہ ہوا کہ بیچارے سمی کو تا حکم ثانی میڈیکل کالج منتقل کر دیا گیا ہے اور کونسل یا حکومت میں ان کا مسئلہ پیش ہونے والا ہے۔ رہبر[3] تو آپ کے پاس آتا ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب کا خط آیا ہے اس سے بھی معلوم ہوا، بڑا افسوس ہے خدا کرے بیچارہ اس مصیبت سے نکل جائے۔

اور ناروے و ڈنمارک سوئڈن کے انضمام کا قصہ تو معلوم ہی ہو رہا ہوگا۔ عجب شان الٰہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب سے میرا اسلام فرما دیجئے اور والدہ صاحبہ کی خدمت میں سلام میاں شعیب کو دعا۔ بچوں کو دعا۔ گیلانی میں بحمد اللہ اس وقت تک سب لوگ بعافیت ہیں اگرچہ آم کے متعلق صفر کی رپورٹ تھی لیکن ذائقہ کی حد تک ہے۔

مناظر احسن گیلانی

---

[1] راقم الحروف ۱۲

[2] قاضی عبدالغفار صاحب مرحوم نے حیدرآباد سے "پیام" نام کا ایک روزنامہ نکالا تھا (ع)

[3] "رہبر دکن" مرحوم حیدرآباد کا سب سے مقبول روزانہ اخبار ۱۲ (ع)

محراب الہدایت والارشاد گیلانی (بہار)

۱۹ / مئی ۱۹۴۰ء ، ۱۰ / ربیع الاخر ۱۳۵۹ھ

مہدیتی الکریم   دمتم بالعافیہ   السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

ایک مدت سے میں نے آپ کو کچھ نہیں لکھا۔ آپ کا ایک کارڈ آیا تھا۔ اس کا بھی جواب نہیں دیا ہے واقعہ بھی ہے کہ اس کا سبب وہی پرانی بات ہے کسی خبر کا نہ ملنا اچھی خبر کی دلیل ہے بحمد اللہ یہ چند دن امن و عافیت سے گذرے۔ اس عرصہ میں صرف ایک دفعہ پٹنہ مدرسہ بورڈ کے جلسہ کی شرکت کے لئے جانا پڑا۔ اور پٹنہ سے ایک دن کے لئے آرہ میلاد پڑھنے گیا۔ سید صاحب قبلہ اس کمیٹی کے صدر تھے ہم دونوں کا قیام ایک ہی جگہ تھا چند دن بڑے اچھے گذرے۔

ادھر خلاف معمول حضرت تھانوی مدظلہ العالی سے مراسلت کی آخر مجھے جرأت ہو ہی گئی۔ اور جرأت جب ہوئی تو خوب ہوئی خدا کا شکر ہے کہ چند خطوط کی آمد و رفت نے دل کے بہت سے کانٹے نکال دیئے۔ حضرت سے صرف دینی ہی نہیں بلکہ بعض دنیوی مسائل میں بھی مشورہ طلب ہوا[1] تھا۔ ہر ایک کا شافی حکیمانہ جواب ما قل و دل عطا فرمایا گیا۔ کلیات اشرفیہ میں ان دنوں یا مجیبؔ قادر بقدرت غیر قادر نہیں ہے کا زیادہ

---

[1] جی ہاں! جن کو تجربہ ہے خوب جانتے ہیں کہ حضرت دنیوی مسائل و مشکلات کے بھی ماشاء اللہ بڑے مشکل کشا تھے ۱۲ (ع)

اثر ہے کہ چند دنیاوی مشکلات کا حل اس کے سوا کچھ نہ تھا۔ مسئلہ خاص[1] کے متعلق حضرت نے خلاف معمول اطناب سے اپنے مکاتیب میں کام لیا۔ بحمد اللہ اس سے مجھے نفع پہونچا لیکن ابتک اس باب میں تشفی نہ ہوئی کہ اتنا ستر اس کے لئے کیوں ضروری قرار دیا جا رہا ہے؟[2]

اور کوئی خاص بات جو قابل ذکر ہو سامنے نہیں ہے البتہ حیدرآباد سے خبر آئی ہے کہ سید محی الدین صاحب شریک معتمد ہو کر بمبوم آفس آگئے۔ لیکن خود ان کا کوئی خط نہیں آیا ہے۔ آج کل اگرچہ میں ایک کوردہ گاؤں میں ہوں لیکن اخبارات اُردو اور انگریزی کے جو یہاں آتے ہیں ان سے قرن بدن انتشار بڑھ رہا ہے بہرحال دنیا ایک قیوم کی قیومیت کے ساتھ مربوط ہے جو کچھ ہوگا علم و حکمت و ارادہ کے تحت ہوگا مگر خدا ہی جانتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے حالات تو کسی شدید طوفان کی خبر دے رہے ہیں۔

ڈاکٹر عثمان صاحب کا خط بھی آیا تھا۔ لڑکی کی رخصتی کی خبر دی تھی۔ آپ کی اور میری عدم شرکت پر انھوں نے افسوس کا اظہار فرمایا ہے۔ انھیں کے خط سے معلوم ہوا

---

[1] مولینا کے ذوق کا خاص مسئلہ وحدۃ الوجود مراد ہے۔ ۱۲ (ع)

[2] حضرت علیہ الرحمہ کے نزدیک یہ مسئلہ ضروریات دین میں تو کسی درجہ میں تھا نہیں اور فتنوں یا غلط فہمیوں سے اس کی کوئی تعبیر بھی مشکل ہی سے خالی ہوتی ہے۔ اس لئے تعمیم پسند نہ فرماتے تھے۔ مکتوب الیہ نے ایک مرتبہ تھانہ بھون حاضری کے موقعہ ہی پر اس باب میں بالمشافہ جی کھول کر استفادہ کیا تو سب سے پہلے اپنا ایک مطبوعہ رسالہ عطا فرمایا جو اسی مسئلہ پر تھا۔ مگر مطبوعہ ہونے پر بھی اشاعت عام نہیں، بہت خاص ہی تھی۔ ۱۲ (ع)

کہ سید حسین کی رسیجتی پھر معرض خطر میں آگئی۔

مکرم و مخدوم ڈاکٹر عبد العلی صاحب کی خدمت گرامی میں سلام و نیاز پہونچا دیجئے۔ سید صاحب سے معلوم ہوا کہ آپ نے ندوہ کی رکنیت سے استعفا دے دیا ہے آخر اس میں کیا مصلحت پیش نظر ہے لعینی کُل چونکہ نہیں مل سکتا اس لئے جز کو بھی چھوڑ دینا چاہئے۔ والدہ صاحبہ کا کیا حال ہے۔ میری طرف سے بہت بہت سلام عرض کر دیجئے برادرم مکارم سلمہ سلام عرض کرتے ہیں۔ اور یہ کہ ہمارے باغ میں اگر آم نہ آیا تو لکھنؤ میں بھی اس سال خربوزے نہ آئے۔ فقط

مناظر احسن گیلانی

رفیقی و صدیقی! عافاکم اللہ ورزقکم شفاءً عاجلاً، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آپ کا کارڈ جس میں راستہ ہی میں پھر مرض کے حملہ کی اطلاع تھی۔ بنام ڈاکٹر صاحب مل گیا۔ کیا کیا جا سکتا ہے۔ "بیدہٖ ملکوت کل شیٔ" کے افعال کے متعلق کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔ آپ جس دن گئے، اس کے دوسرے دن میں افطار کے لئے مسجد کی سیڑھیوں پر چڑھ رہا تھا اوپر پہونچا کہ منھ کے بل گرا۔ اور بری طرح گرا، گھٹنہ پھوٹا، اور آنکھ کے نیچے ایک سخت گھسا لگا۔ گھٹنہ میں اب تک پٹی بندھی ہوئی ہے۔ شکر ہے کہ ہڈی وڈی محفوظ رہی تاہم عید کی نماز مجھے پڑھانی پڑی۔ بارہ ہزار کا مجمع تخمیناً عیدگاہ سکندرآباد میں تھا۔ تمام مساجد میں نماز موقوف کر دی گئی تھی۔ گرامی نامہ سے معلوم ہوا کہ باوجود ڈاکٹر صاحب کے

حکم کے آپ کا ارادہ واپسی کا ہے۔ دیکھوں آئندہ کیا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ آپ پر اپنی مہربانیاں نازل فرمائے۔ امام مسجد کو آپ کے جانے کے بعد اب آپ کی نوازشوں کا احساس ہوا میرے پاؤں پر آ گر گرتا ہے کہ مولینا سے معافی کرا دو۔ ایک خط بھی لکھ کر دیا تھا لیکن اس کی ضرورت کیا ہے۔ اب بہت روتا اور پچھتاتا ہے۔

میں نے اس سے کہہ دیا کہ بھائی مولینا ان دنوں جس حال میں ہیں فکر نہ کرو، وہ عفو و درگذر سے کام لیں گے۔ جب عمر کو ان جرائم کے بعد بھی وہ بخشتے رہے تو تمہیں کیوں نہ بخشیں گے۔ دراصل ایک دن میں اس پر برس پڑا تھا کہ مولینا جیسے بزرگ آدمی کے دل کو تم دکھلاتے ہو اور سمجھتے ہو کہ ہم لوگ اس کے بعد بھی تم سے راضی رہیں گے۔ ہماری ظاہری مروّت اور نرمی نے تم کو دھوکہ میں ڈال رکھا ہے۔ اسی کے بعد اس کے ہوش درست ہوئے۔ بہرحال اس کی ضرورت نہیں کہ آپ سے اس کی سفارش کروں آپ خود ان حالات کے عالم مجھ سے زیادہ ہیں۔

والدہ صاحبہ کی خدمت میں سلام عرض کر دیجئے۔ بچوں کو دعا اور گھر میں سلام

ؔ۱ جس میں ذرا بھی صلاحیت ہوتی کہ مولانا اس سے تفریحی دلچسپی لیں۔ ضرور لیتے۔ ہماری مسجد کے امام میں یہ صلاحیت بدرجہ اتم تھی۔ پھر بھلا مولینا کہاں تک ضبط فرماتے۔ مکتوب الیہ اپنی عادت کے مطابق خود ان "حضرت امام" سے چاہتا کہ اپنے منصب "امامت" کا کچھ تو پاس رکھا کریں۔ اس کو بے چارے کبھی کبھی زیادہ بُرا مان جاتے اور بعد کو پچھتاتے۔ ۱۲ (ع)

فرما دیجئے۔ ڈاکٹر صاحب سے بھی سلام فرما دیجئے۔

مناظر احسن گیلانی

۲ر جنوری سنہ ۱۹۴۱ء مطابق ۳ر ذی الحجہ سنہ ۱۳۵۹ھ

مکرم و مخدوم صدیقی المحترم السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

بحمد اللہ بخیر و عافیت ہم لوگ کلکتہ پہونچے۔ مکارم سلمہٗ کلکتہ اسٹیشن پر موجود تھے۔ انھوں نے نکاح محی الدین کے متعلق ایک نیا پروگرام طے کیا تھا یعنی بجائے خرما کے تمر (ین کھجور) اور بجائے ایک خاص قسم کی مٹھائی جسے بہار میں لقم دانہ کہتے ہیں اور ایک چنے میں لپٹی ہوئی شکر مختلف رنگوں کی ہوتی ہے۔ انھوں نے عہد جدید کی ٹافی اور لیمن چوس وغیرہ کا تقسیم کرنا طے کیا ہے۔ بہار میں کچھ دنوں سے علاوہ لٹانے کے شرکار محفل عقد کو کاغذ کی تشتریوں میں خرما و لقم دانہ دیا جاتا ہے۔ انھوں نے بجائے کاغذ کے طے کیا تھا کہ چینی کی تشتریاں بانٹی جائیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ ان چیزوں کی خریداری اور پھر بہار کی رسم کے مطابق لڑکی کا جوڑا اور میاں محی الدین کے لئے بھی ایک جوڑا بنانا تھا ان ہی چیزوں کی خریداری میں چار دن لگ گئے۔ عجب شہر ہے، مختلف بازاروں میں چیزوں کا مختلف بھاؤ تھا۔ بڑی دماغی کوفت میں مبتلا ہونا پڑا۔ تاہم چیزیں حتی الوسع ارزاں ملیں۔ لیمن چوس کے تو کارخانے میں پہونچے۔ جہاں گنے سے ٹوفی و چوکلیٹ تک تمام منازل طے ہوتے تھے۔ خرما سے زیادہ پن کھجور سستی تھی اور دیسی مٹھائی سے

وہ ولایتی مٹھائی ارزاں یعنی شکر کا جو عام بھاؤ ہے اس سے ایک سیر زیادہ۔

بہرحال چار روز کے بعد لدے پھندے ہم لوگ بعافیت گیلانی پہونچ گئے۔ فریق[1] ثانی کی طرف سے بڑا تکلف تھا۔ ایک خاندان ہے جو صرف ایک دن امیر[2] بننے کے لئے عمر بھر غریبی میں کاٹتا ہے۔ ۳۰ر دسمبر کو تاریخ عقد تھی اسی حساب سے ہماری طرف بھی کچھ نہ کچھ کرنا پڑا۔ خداوند تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ بخیر و خوبی ۳۰ر دسمبر کو محی الدین سلمہ کا عقد انجام پاگیا۔ بہار کے دستور کے مطابق ان کو لڑکی کے والد نے سونے کی گھڑی فونٹن پن اور انگوٹھی ایک سو ایک نقد سلامی دی۔ بستی بھر کا کھانا تھا اور مہمان بھی باہر سے آئے تھے۔ ان ہی مشغولیتوں میں اب تک خط نہ لکھ سکا۔ اب دماغ خالی ہوا ہے بہمہ وجوہ خیریت ہے والدہ صاحبہ کی خدمت میں سلام فرمادیجئے۔ میاں مکارم سلمہ سلام عرض کرتے ہیں اور بھتیجے کے عقد کی مبارکباد عرض کرتے ہیں مولوی فضل صاحب کا ایک خط آیا تھا لیکن ان کا پتہ نہیں جواب کہاں دوں۔ ابھی آپ کا کارڈ ملا۔ آپ نے پوچھا ہے کہ محی الدین کا عقد ہے؟ متعدد جا ذکر آیا لیکن بات پختہ نہ تھی۔

مناظر احسن گیلانی

---

[1] جناب معین الدین صاحب وکیل پٹنہ میں پریکٹس کرتے ہیں راقم الحروف کو بھی نیاز حاصل ہے ۱۲۔

[2] یعنی آل و اولاد کی شادی بیاہ کے دن، رسومات اور تقریبات کے بندے کم و بیش سب ہی عمر بھر اسی طرح کی مصیبتوں میں مرتے رہتے ہیں اور ہمارے مولانا وہی بقول خود اپنی "خوش کرنی" کی مد میں یا دل ناخواستہ کچھ نہ کچھ مبتلا ہو جاتے تھے۔ ۱۲ (ع)

۲ر مئی ۱۹۴۱ء مطابق ۶ر ربیع الاول ۱۳۶۰ھ

رفیقی الصادق والصدوق، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ـــ میں پندرہ دن سے اس دنیا میں موجود نہیں ہوں میں کیا عرض کروں کہ کیا گذر گئی۔ غالباً اپریل کی ۲۲ر تھی۔ کھا پی کر بستی کے لوگ سب سوئے ہوئے تھے۔ یکایک ایک بجے اٹھایا گیا۔ آواز تھی ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا ہوش و حواس غائب۔ میاں مکارم میرے زنانہ میں آگئے، کوٹھے پر جھانکنا شروع کیا بستی کے مغربی حصہ میں ہمارے عزیزوں کا ایک مکان تھا معلوم ہوا کہ ڈاکوؤں نے اس کو گھیر لیا ہے۔ سو سے اوپر ان کے ساتھ آدمی ہیں۔ بہرحال ادھر میاں مکارم اپنی فوج لے کر اس پر حملہ آور ہوئے غنیمت ہے کہ ڈاکوؤں نے مقابلہ نہیں کیا، اور بھاگ گئے۔ اب دیکھا گیا کہ اس گھر کے رہنے والے جن میں ایک بوڑھے بزرگ آدمی ایک نوجوان گھر کھوسٹ، ایک بیوہ عورت تینوں بری طرح لاٹھیوں، بھالوں وغیرہ سے زخمی ہیں۔ گھر کے کواڑ توڑ دیئے گئے ہیں لیکن مال بیچاروں کے پاس تھا ہی نہیں لیتے کیا۔ یہ واقعہ تو گذرنے کو گذر گیا لیکن اس کے بعد دہشت، ہراس خوف پوری بستی پر مسلط ہے۔ رات بھر بندوقوں کے ساتھ ہم لوگ بستی کا پہرہ دیتے ہیں، اور دن کو سوتے ہیں۔ شرفاء کے گھر کے بچے اور عورتیں ایک ہی مکان میں جمع کر دیئے جاتے ہیں۔ ڈے لائٹ (Day Light) جلا دی جاتی ہے اور ہم لوگ باری باری سے بندوق لئے پہرا دیتے ہیں۔ اسی عرصہ میں بہار شریف میں ہندو مسلم فساد بھی ہوگیا اب کمیونل کے اندیشوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ نہیں کہہ سکتا تھا کہ زندگی میں کبھی اس قسم کے واقعہ کا

تجربہ ہوا تھا۔ طاعون کے ہنگاموں کو بھی دیکھا، زلزلہ دیکھا، لیکن بشیٔ من الخوف (البقرہ)
کا تجربہ اس سے پہلے نہیں ہوا تھا۔ اندھیری رات کبھی اتنی دہشتوں کے ساتھ ہمارے سامنے
نہیں آئی۔ رب الفلق[1] کا انتظار اور اس کی دہائی دل سے کبھی اس شدت سے نکلی جیسی
آج نکل رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں سلام فرما دیجئے اور التجا کیجئے کہ اس وقت
ان کی دعاؤں کا سخت محتاج ہو گیا ہوں آپ اپنی خیریت سے مطلع فرماتے رہیں گے۔
ماجد میاں کی والدہ کی وفات کی خبر صدق میں پڑھی۔

ہاں ایک واقعہ کا ذکر بھول گیا۔ غالباً خبر دی تھی کہ ریل میں میری شیروانی چوری گئی
تھی میرے ساتھ اور مسافروں کا بھی سامان گیا تھا۔ سبھوں نے وردھا میں ریلوے پولیس
میں اطلاع درج کرادی تھی۔ ایک ہفتہ ہوتا ہے کہ قاضی پیٹ کا ایک ہیڈ کانسٹبل گیلانی
میں نمودار ہوا۔ میری شیروانی جس میں پان کا ڈبہ، فونٹین پن، گھڑی بھی تھی بجنسہ لے کر
آرہا تھا۔ چور کو جنگل میں پکڑا، اور شناخت مال کے لئے گیلانی آیا تھا۔ جس کا پتہ لکھوا دیا
تھا۔ شناخت کرانے کے بعد اس مال کو واپس لے گیا اور سکندر آباد میں ٹرائی کے بعد
واپس کرنے کا وعدہ کیا۔ فللہ الحمد والشکر۔

میرا خیال تو یہ ہے کہ اس سال ڈاکٹر صاحب کی قدم بوسی حاصل کئے بغیر جو گیلانی
آیا یہ اسی کا خمیازہ ہے ان سے فرمائیے کہ میرے قصور کو معاف فرما دیں۔ تازہ زخم ہے

---

[1] "قل اعوذ برب الفلق" کی طرف اشارہ ہے۔ ۱۲ (ع)

کہ ہم لوگوں کے رفیق قدیم حاجی معین الدین[1] ندوی بلڈ پریشر کے عام مرض میں پرسوں
پٹنہ میں رحلت فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مناظر احسن گیلانی

---

۱۳ مئی سنہ ۱۹۴۲ء مطابق ۲۶ ربیع الاخر سنہ ۱۳۶۱ھ

مخدوم محترم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ تیمور بنے لکھنؤ میں براج رہے ہیں۔ اس لئے تھانہ بھون ہی
لکھا تھا۔ امید ہے کہ اب آپ اچھے ہو چکے ہوں گے۔ محی الدین سلمہ کی تقریب رخصتی بحمد اللہ
خیر و خوبی کے ساتھ انجام پا گئی۔ سید صاحب گو دسنہ آ چکے تھے اور کہلا بھی بھیجا تھا کہ ولیمہ
میں شرکت کروں گا۔ لیکن عین وقت پر کوئی عذر شدید پیش آیا تشریف نہ لا سکے۔ میں
خود دسنہ جانے کا ارادہ کر رہا ہوں، اور حالات بدستور ہیں۔
آم غائب ہے تاہم اکے دکے پھل مختلف درختوں میں اب دکھائی دیتے ہیں ـــــ

---

[1] مولانا حاجی معین الدین صاحب نے ندوہ میں تعلیم حاصل کی۔ کتب خانہ خدا بخش خاں
پٹنہ (اورینٹل لائبریری) میں کیٹلاگر رہے۔ کتب خانہ کی فہرست کی کئی جلدیں آپ نے
ہی ترتیب دیں۔ اس کے بعد مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کے صدر مدرس اور پرنسپل
ہوئے۔ اور اسی منصب پر پانچ ربیع الثانی سنہ ۱۳۶۰ھ مطابق یکم مئی سنہ ۱۹۴۱ء کو پٹنہ میں
وفات پائی۔ اللھم اغفر لہ ولنا۔ ۱۲

محی الدین سلمہٗ کی جس دن برات جارہی تھی عین ان ہی دنوں میں اس کی میٹرک میں بدرجہ دوم کامیاب ہونے کی خبر بھی آگئی۔ سسرال میں بیچارے کی رسوائی کا جو اندیشہ تھا اللہ تعالیٰ نے اس سے بچالیا۔ باقی اور دوسرے حالات اس کے وہی ہیں جو تھے۔ ترمذی میں ہے کہ تین دعائیں مسترد نہیں ہوتیں جن میں دعاء الوالد لولدہٖ بھی ہے۔ دیکھئے ان دعاؤں کا

۱؎ پورا نام جامع کبیر ترمذی ہے۔ حدیث کی مشہور کتاب اور صحاح ستہ میں داخل۔ الامام الحافظ ابو عیسیٰ محمد بن موسیٰ الترمذی اس کے جامع ہیں۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ علم حفظ اور زہد و تقویٰ میں امام بخاری نے ترمذی جیسا جانشین نہیں چھوڑا۔ ان کی قوت حافظہ سے متعلق ایسے واقعات تاریخوں میں مذکور ہیں کہ تعجب ہوتا ہے۔ تقویٰ اور خشیت الٰہی کا یہ حال تھا کہ روتے روتے آنکھیں جاتی رہیں۔

جامع کبیر ترمذی کے متعلق حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے۔

"این جامع بہترین کتب است بلکہ بعضے وجوہ و حیثیات از جمیع کتب حدیث خوب تر واقع شدہ اوّل از جہت ترتیب و عدم تکرار، دوم ذکر مذاہب فقہاء و وجوہ استدلال ہر یک از اہل مذہب سوم بیان انواع حدیث از صحیح و حسن و ضعیف و غریب و معلل بعلل، چہارم بیان اسماء رواۃ و القاب و کنیت ہائے آنہا و دیگر فوائد متعلقہ بعلم رجال۔"

خود امام ترمذی کا بیان ہے کہ میں نے اس کتاب کو علمائے عراق و حجاز و خراسان کے سامنے پیش کیا انھوں نے بہت زیادہ پسند کیا اور فرمانے لگے کہ جس گھر میں یہ کتاب ہو گیا اس گھر میں رسول ہے جو گفتگو کرتا ہے۔ حضرت امام ترمذی ۲۰۹ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۷۹ھ میں وفات پائی۔ رضی اللہ عنہ ۱۲

ظہور کب ہوتا ہے۔ آپ سے بھی ملتجی ہوں کہ اس کے دینی صلاح کی دعا فرمائیے۔

مولینا عبدالماجد صاحب کا خط آیا تھا اس میں آپ کی سند سے انھوں نے لکھا تھا کہ لکھنؤ کی راہ دریاآباد کی وجہ سے اس نے چھوڑ دی۔ میں نے لکھا ہے کہ مولینا کا یہ استنباط ہے۔

مناظر احسن گیلانی

۱۶؍ جون ۱۹۴۲ء مطابق یکم جمادی الآخر ۱۳۶۱ھ

گیلانی (بہار)

مکرم و مخدوم دام مجدکم العالی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

عجیب اتفاق ہے۔ بصیغۂ اشد ضروری یہی سوچ کر کہ آپ جون ہی میں لکھنؤ پہنچیں گے میرا کارڈ آپ کو ملے گا لیکن اب میں کیا کہوں کہ کیا ہوا۔ خط کیوں نہ ملا۔ حالانکہ آپ ہی کی تسلی دلانے پر میں نے اپنا موازنہ تیار کیا تھا۔ اب اس کے سوا اور کوئی صورت نظر نہیں آرہی ہے کہ تار سے آپ کو اطلاع دوں۔ تار بھی دے رہا ہوں اور احتیاطاً یہ لفافہ بھی ڈال رہا ہوں۔ خدا کرے کہ آپ نے اپنے کو مطمئن پا کر جو رقم میرے نام محفوظ کی تھی اس میں ہاتھ نہ ڈال دیا ہو۔ اگر ایسا ہوا تو میرے لئے کافی دشواری ہو جائے گی لیکن "لن یصیبنا الا ما کتب اللہ لنا"۔ وہاب العطایا حلال المشکلات نے بحمداللہ اس تعطیل میں تین بڑے مرحلوں سے نکالا۔ محی الدین سلمہٗ کی شادی سے فراغت ہوئی۔ مکرم سلمہٗ کی لڑکی

۱؎ خدا کرے صاحبزادہ میاں محی الدین سلمہٗ کی نظر بھی اس مکتوب پر پڑ جائے۔ ۱۲ (ع)

کی رخصتی ہوئی اور مکان کو بھی اس قابل بنانا پڑا جس میں محی الدین کی دلہن کو آرام ہو۔ میں خود متحیر ہوں کہ یہ تینوں کام جن میں ہر ایک بجائے خود اہم تھے کیسے سرانجام پا گئے۔ حیرت اس پر ہے کہ سونے کی اس گرانی کے زمانہ میں مکارم سلمہٗ کی لڑکی کے لئے زیور کا بھی معقول نظم ہو گیا۔ ایسا نظم جو چاہا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں کچھ نہ کچھ زائد رقم کا بار پڑ ہی جانا چاہیئے تھا۔ میں نے تو خیال کیا تھا کہ تیسیرات کے سلسلہ کے سلسلہ میں ایک تیسیر یہ بھی ہے کہ آپ کے پاس گنجائش نکل آئی لیکن خط کا نہ پہونچنا واللہ اعلم کس مصلحت پر مبنی ہے شاید صبر کے اجر سے سرفرازی مقصود ہو۔ فالحمد للہ منال فی کل حال۔ شکر کروں گا اگر آپ کے یہاں محفوظ رقم محفوظ رہ گئی ہو اور صبر کروں گا اگر حکمت الٰہیہ نے اس کو صرف کرا دیا ہو۔

میں نے اپنے اس کارڈ میں اطلاع دی تھی کہ گھر کو ساتھ لا رہا ہوں لیکن معلوم ہوا کہ روانگی پر رضامندی صرف جبری اقرار تھا۔ قلبًا وہ حیدرآباد جانے پر آمادہ نہیں ہیں جبر میرا شیوہ نہیں ہے۔ اب کم ہی امید ہے۔ قسمت نے طالب علم بنا کر زندہ رہنے کا فیصلہ جس کے لئے کر دیا ہو وہ تاہلانہ زندگی کیسے گذار سکتا ہے[1]۔

ایک بات کا خیال ضرور تھا کہ گو جاپانی حملہ کا خطرہ ادھر کچھ دنوں سے مدھم پڑ گیا ہے

[1] اصل میں محترمہ مدظلہا طبعًا بہت سکون پسند اور حرکت سے بہت نفور ہیں۔ مولینا فرمایا کرتے تھے کہ بستی اور برادری میں کسی کے گھر بھی برسوں جانا پسند نہیں فرماتیں تو اتنا بڑا سفر۔ پھر مولینا کی خاطر سے غالبًا دو مرتبہ حیدرآباد تشریف لے گئیں۔ (۱۲ ذ ح)

لیکن ابھی خطرہ کا بالکلیہ ازالہ نہیں ہوا ہے ایسی صورتوں میں عورتوں کے ساتھ حیدرآباد میں رہنا شاید زیادہ پریشانی کا باعث ہو۔ غالبًا یہی مصلحت ہو گی کہ خیر اسی کو قرار دیا گیا معلوم نہیں آپ کا فیصلہ کیا ہے۔

اسی کارڈ میں والدہ ماجدہ مدظلہا کے اس مشفقانہ گلہ کے متعلق بھی عرض کیا تھا کہ محی الدین کی شادی میں دعوت ان کو کیوں نہ دی گئی۔ واقعہ یہ ہے کہ دعوت دینا تو میرا فرض تھا گو اس دعوت کا قبول کرنا محترمہ مدظلہا کے لئے سخت صعوبت کا باعث ہوتا اس جہنمی گرمی میں جب فیح جہنم سے عالم معمور ہے گھر سے نوجوانوں کا قدم نکالنا مشکل ہے چہ جائیکہ ان جیسی ضعیفہ کا بہرحال ان کی یہ شفقت میرے لئے ان کی شرکت کی مسرت سے زیادہ ہے۔ امیدوار رہتا ہوں کہ اوقات خاص میں اپنی مخلصانہ دعاؤں میں ...... مجھے فراموش نہ فرمایا کریں گی۔ عرفات کے میدان میں جو قدرتی ایمانی ربط ہم لوگوں میں پیدا ہو چکا ہے انشاء اللہ تا قیام قیامت اس کا ازالہ نہیں ہو سکتا۔ اللہ اللہ مدینہ سے روانگی والی رات، سید الکونین صلوات اللہ علیہ وسلامہ کا براہ راست رؤیا[1] میں آپ کی والدہ صاحبہ پر ظاہر ہو کر میرے ساتھ دلچسپی کا اظہار کیا۔ یہ کرامتیں جو محض ان کی ہستی پاک کی بدولت حاصل ہوئیں قابل فراموش ہو سکتی ہیں؟ میرا بہت بہت سلام خدمت میں پہونچا دیجئے اپنی اہلیہ کی خدمت میں بھی سلام فرما دیجئے۔

[1] حاضری بیت اللہ سے پہلے بیت الرسول میں ہوئی تھی۔ آخر ذیقعدہ تک بیت اللہ حاضر ہو جانے کا قطعی پروگرام تھا سفر پورے قافلہ کا دو لاریوں پر ہوا تھا۔ مگر (باقی اگلے صفحہ پر)

بچے سب اچھے ہیں، محی الدین کو علی گڈھ بھیج رہا ہوں۔ مولوی فضل صاحب نے نظم فرما دیا ہے خلف حیدر آباد ہی آرہے ہیں۔ ایم۔ اے کے کلاس میں شریک ہونے کا ارادہ ہے اس اطراف میں ڈاک کی واردا تیں بکثرت ہو رہی ہیں حضرت مولینا تھانوی مدظلہ العالی کی صحت و عافیت کی خبر جہانیوں کی صحت و عافیت کے مرادف ہے۔

اب کی حیدر آباد سے روانگی کے وقت مولانا محمد حسین صاحب مدظلہ العالی نے جن نوازشوں سے اس عاصی کو سرفراز فرمایا ہے[2] اپنی حالت دیکھتے ہوئے ہمت نہ پڑی کہ آپ سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) واپسی میں ان کے ملنے میں اتنی دشواری ہوئی کہ ہر طرف ہاتھ پاؤں مارنے پر بھی نہ آج ملتی ہیں نہ کل حج کی تاریخیں سر پر، قدرۃً ہر شخص قافلہ کا سراسیمہ۔ حضرت والد رحمہ اللہ مسجد نبوی کے ایک بواب حضرت عبدالرحمٰن سندھی کی خدمت میں کبھی کبھی جا بیٹھتے تھے۔ انھوں نے فرمایا پریشانی کی بات نہیں۔ جب اجازت ہوگی چلے جائیے گا۔ ہم اس اجازت کا مطلب کیا سمجھتے؟ پریشانی ساعت بساعت بڑھ رہی تھی۔ دوسری ذالحجہ تک آگئی۔ سامان باندھ لیا گیا تھا مگر لاریاں آج بھی ندارد۔ کہ تیسری کی علی الصباح حضرت والدہؒ نے مسرت اور جذبات سے بھری اور بھرائی آواز میں میرا نام لے کر پکارنا شروع کیا کہ تہجد کے بعد آنکھ لگ گئی تھی کہ ابھی دیکھا آنحضرت ﷺ عصا ٹیکے سامان کے پاس اس طرح تشریف فرما ہیں کہ گویا رخصت فرما رہے ہیں میں نے عرض کیا الحمد للہ بس اجازت مل گئی۔ اور انشاء اللہ اب لاریاں بھی مل جائیں گی۔ اور دوسرے ہی دن بخیر و عافیت روانگی ہوگئی۔ ۱۲۔ (ع) [1] حضرت مولینا کے سب سے چھوٹے بھائی۔ ۱۲۔ [2] خلافت عطا فرمائی تھی ۱۲ (ع)

یا مولوی فضل صاحب سے اس کا ذکر کروں۔ اگرچہ مولوی فضل صاحب کو اس کا علم ہو چکا تھا لیکن میرے نزدیک ایک ایمانی حسن ظن کے سوا اس کے اندر اور کوئی دوسری چیز نہیں فان المومن عزا کو یحد۔ فقط

مناظر احسن گیلانی

---

۱۷ جون ۱۹۴۳ء مطابق ۱۲ جمادی الآخر ۱۳۶۲ھ

مخدوم محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آخر وقت گذر ہی گیا۔ طویل تعطیل ان راس کے سارے تصورات ختم ہو رہے ہیں۔ حیدر آباد اور اس کے مشاغل پھر چھا نکنے لگے۔ آپ نے لکھا تھا کہ باہر جانے کا خیال ہے تھانہ بھون وغیرہ کی طرف۔ ادھر ہم کچھ بہار کے میلادی جلسوں اور برادری کی تقریبات میں شریک ہوتے رہے۔ سب سے بڑی تقریب برادرم تقی الدین[1] سلمہٗ کی صاحبزادی کی تھی۔

[1] مولینا سید عبدالغنی وارثی استھانوی کے چھوٹے صاحبزادہ تھے۔ علی گڈھ، ڈھاکہ اور حیدر آباد میں تعلیم حاصل کی۔ ابتدا سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک ہر مرحلہ میں اول آئے اور نمایاں رہے۔ عرصہ تک صوبہ بہار میں ڈپٹی مجسٹریٹ اور پھر اسسٹنٹ سکریٹری گورنمنٹ ریونیو رہے۔ بہار سے مستعفی ہو کر حیدر آباد چلے گئے اور وہاں مختلف اعلیٰ انتظامی عہدوں پر فائز کئے گئے۔ اور اپنی صلاحیت کے باعث ہر منصب پر ممتاز رہے۔ دین کے مخلص اور پرجوش کارکن تھے۔ ۱۹۳۸ء میں اپنے وطن استھانواں میں مدرسہ محمدیہ کی بنیاد ڈالی مولینا ہدایت علی مجددی سے بیعت حاصل کی۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلے گئے اور ۱۹۵۶ء میں لاہور میں وفات پائی۔ ۱۲۔

بحمداللہ بخیر و خوبی سب ختم ہوگئی۔ تقی الدین صاحب، محی الدین صاحب سارے کاروبار سے فارغ ہونے کے بعد اپنے اہل و عیال سمیت راہی دکن ہو چکے۔ ہم بھی پابہ رکاب ہیں۔

اس سال بحمداللہ آموں کی بہار خوب رہی لیکن اس کا مسلسل افسوس رہا کہ آپ کو اس بہار میں شریک نہ کر سکا۔ یوں ہی ریلوے کے مقام کا بُعد اس کے ساتھ ریلوے خصوصاً مفصلاتی اسٹیشنوں پر پارسلوں کے لینے میں جو گڑبڑ پیدا ہوگئی ہے اور بھی مختلف اسباب و وجوہ ایسے ہیں کہ اب تو جو جہاں ہے جب تک جنگ ہے وہیں ہے۔ لکھنؤ کے خربوزوں کا خیال میں نے دماغ سے اسی لئے نکال دیا اور یہی خیال آپ کے متعلق بھی گذرا کہ مٹھوا سے آپ نے اپنے کو مایوس بنا لیا ہوگا۔ کوئی شبہ نہیں کہ مٹھوا اس سال پیٹ بھر کھانے میں آیا لیکن کس کام کا۔ جب احباب کو اس میں شریک نہ کر سکا۔ مٹھوا کا زمانہ تو مدت گذری کہ گذر چکا۔ درمیانی آموں کا وقت بھی گذر گیا۔ صرف لنگڑا باقی ہے۔ لیکن واللہ اعلم دنیا کو کیا ہو گیا ہے؟ پندرہ جون سے عموماً بہار میں لنگڑے کی پکائی شروع ہوتی تھی لیکن خدا ہی جانتا ہے کہ اسباب کیا ہوئے کہ پندرہ جون تک پہونچتے پہونچتے سارا موسم لنگڑے کا قریب قریب اختتام کو پہنچ رہا ہے۔ میں بہت کوشش کر رہا ہوں کہ کچھ بھی بچ جائے کہ ساتھ لیتا آؤں۔ لیکن روزانہ سَو ڈیڑھ سَو ٹپک ٹپک کر ضائع ہو رہے ہیں۔ میاں مکارم کہہ رہے ہیں کہ اس طرح ان کو برباد کرنے سے کیا فائدہ؟ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔

ڈاکٹر عثمان صاحب کا خط آیا تھا ان کے خط سے یہ معلوم کر کے تعجب ہوا کہ آپ کے نام کوئی مراسلہ گیا ہوا ہے۔ اگر تم کو رعایتی وظیفہ نہ ملے تو کیا پھر بھی تم وظیفہ پر علیحدہ ہونا

چاہتے ہوئے[1]۔ خدا جانے اس کا کیا مطلب ہے۔ اور حیدرآباد کے متعلق کوئی جدید بات معلوم نہیں۔ بہار میں بارش کے موسم کا آغاز ہو چکا ہے۔ گرانی، گرانی، بس اسی لفظ سے سارا آسمان اور ساری زمین بھری ہوئی ہے۔ لیکن اب تک کوئی موت فاقہ کی وجہ سے دیکھنے میں نہیں آئی۔ سبحان اللہ۔ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں سلام فرما دیجئے اور اپنی والدہ صاحبہ کی خدمت میں۔ باقی بحمداللہ گذر رہی ہے اور گذرتی ہی رہے گی۔ جب تک گذارنے والے خیال سے کہ گذرتا رہے۔

مناظر احسن گیلانی

---

۲۱ شب رمضان المبارک ۱۳۶۲ھ - ۲۵ ستمبر ۱۹۴۳ء

حیدرآباد دکن

مولانا المخدوم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آپ کا ایک لفافہ مدت ہوئی کتنی ملا تھا۔ پھر اس کے بعد کچھ نہ معلوم ہوا کہ آپ کہاں ہیں، کیا کر رہے ہیں میرا کارڈ خدا جانے آپ کو ملا بھی یا نہیں۔ اس وقت جو کچھ بھی حال تھا اب تک وہی ہے میں نواب مہدی یار جنگ[2] بہادر سے ملا تھا لیکن گفت گو

---

[1] مکتوب الیہ قبل از وقت سبکدوش ہونا چاہتا تھا اور حیدرآباد کی صرف قانونی نہیں انسانی حکومت کے بہت سے نظائر کے تحت رعایتی وظیفہ سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ ۱۲ (ع) [2] ابن عباد الملک بلگرامی مرحوم جو وزیر تعلیم تھے بڑے نیک شریف النفس۔ مولانا اور مکتوب الیہ کے خاص عنایت فرما۔ مکتوب الیہ کی تکمیل وظیفہ کار رہا ہوگا ۱۲ (ع)

کرنے سے معلوم ہوا کہ مسئلہ ابھی فنانس ہی میں آپ کا پڑا ہوا ہے۔ اور اب بھی یہی حال ہے کوئی خاص بات اس سلسلہ میں نفیاً واثباتاً ظاہر نہیں ہوئی ہے اس عرصہ میں مجلس اعلیٰ کا ایک اجلاس ہوا تھا لیکن آپ کا مسئلہ اس میں پیش نہ ہوا۔ دونوں باتیں ابھی گو مگو میں ہیں۔ ساری کارروائی فنانس کے جواب پر موقوف ہے اور وہاں سے کوئی جواب اب تک نہیں آیا ہے۔ آپ کے خاص مسئلہ کے سوا عام حالات میں بھی کوئی تغیر کچھ نہیں ہوا ہے۔ البتہ رہبر اور پیام میں ادھر دو مقالے جامعہ پر تنقید کرتے ہوئے شائع ہوئے ہیں۔ پیام میں تو قاضی[1] نے خود ہی لکھا تھا۔ رمضان بحمداللہ گذر رہا ہے۔ تراویح بھی اپنی مسجد میں ہو رہی ہے حافظ شریف صاحب پڑھا رہے ہیں۔ البتہ ادھر ہفتہ سے مولوی فضل بیچارے بخار کے شکار ہوئے۔ بخار تو نہیں ہے لیکن ضعف بے حد ہے۔ ایک ہفتہ کے لئے اپنے داماد[2] کو دیکھنے کے لئے وہ بھوپال رائسین بھی گئے تھے۔ عبدالقادر مرحوم کی وفات کا واقعہ تو آپ کے سامنے پیش آچکا تھا۔ ان کی جگہ کوئی نیا انتظام نہیں ہوا ہے۔ صرف حسین شور منصرمی پر کام کر رہے ہیں یعقوب الرحمن صاحب ان کی جگہ ترقی پاکر کام کر رہے ہیں۔ آپ کی جگہ پر منصرم نہیں دیا گیا۔ تقاضے پر تقاضا کیا کچھ فائدہ نہ ہوا۔ علم کلام کے بعض اسباق مجھے اپنے ذمہ لینے پڑے اور آپ کا قرآن بھی میں ہی پڑھا رہا ہوں۔ نواب مہدی یار جنگ بہادر کی

۱؎ قاضی عبدالغفار مرحوم ۱۲ (ع)

۲؎ میاں علی صابر۔ ایم۔ اے، پی، ایچ، ڈی۔ ۱۲

خدمت میں مولانا عبدالحی مرحوم والی کتاب[1] والا معروضہ میں نے پیش کر دیا ہے۔ وعدہ کیا ہے کہ اس کو مجلس تصنیف و تالیف میں بھیجدوں گا۔ ابھی تک اس کے آگے کارروائی نہیں بڑھی ہے۔ ڈاکٹر صاحب سے سلام فرما دیجئے۔ اور یہی خبر پہنچا دیجئے۔ علی میاں کو بھی میرا سلام فرما دیجئے۔ ان کے خط کے جواب میں وطن ہی سے میں نے ایک خط مدت ہوئی لکھا تھا لیکن انھوں نے اس کا جواب نہیں دیا۔ واللہ اعلم کیوں نہ دیا معلوم نہیں کہاں ہیں۔ انہوں نے لکھا تھا کہ مسودات پر نظر ثانی مولٰینا مرحوم کی کتاب کے کر رہے ہیں۔ میرے نزدیک اس کام کو ختم کرنا چاہئے کیونکہ کارروائی چھڑ چکی ہے۔ ڈاکٹر صاحب بیچارے کی توسیع نہ منظور ہوئی۔ حضرت مولٰینا[2] ادھر اچھے تھے لیکن ایک ہفتہ سے پھر درد قم معدہ کا شدید دورہ پڑ گیا تھا کبھی کبھی حاضری ہو جاتی ہے حیدرآباد میں بجلی پر بھی شدید کنٹرول قائم ہو گیا ہے اور کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں ہے آپ کے گرامی نامہ کا وہ حصہ جس میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے آخری حالات کے متعلق بعض مفید معلومات درج ہیں، میں صدق میں بھیج رہا ہوں۔

اپنی والدہ صاحبہ قبلہ مدظلہا کی خدمت گرامی میں میرا بہت بہت سلام پہونچا دیجئے معلوم نہیں اب ان کی صحت کیسی ہے۔ ان سے ضرور استدعا کیجئے کہ میرے لئے خاتمہ بالخیر کی دعا فرمائیں۔ اور یہ کہ زندگی کچھ اس طرح گذرے کہ رسوائیوں میں کچھ اضافہ نہ ہو

۱؎ نزہتہ الخواطر ۱۲ (ع)

۲؎ وہی حضرت مولٰینا محمد حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ ۱۲ (ع)

شعیب صاحب کہاں ہیں۔ ہوں تو سلام فرما دیجئے۔ بچوں کو دعا و پیار معلوم نہیں آپ کا اندنوں مشغلہ کیا ہے۔ خدا کرے کچھ کر رہے ہوں۔ یہاں تو بارش کا سلسلہ ایک ماہ سے ایسا قائم ہوا ہے کہ بلا ناغہ روز برس رہی ہے۔ عثمان ساگر حمایت[1] ساگر امنڈ آیا ہے سارا ملک جل تھل ہے لوگ اس حال سے مطمئن ہیں لیکن گرانی دن بدن مزید برسر ترقی[2] ہے۔

نیاز مند

مناظر احسن گیلانی

۱۷ر جون ۱۹۴۴ء مطابق ۲۵ر جمادی الآخری ۱۳۶۳ھ

مخدومی و محترمی! وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا کارڈ اور رقم کی رسید مل گئی مولوی سعد[3] صاحب کے بچے کا حال سنکر کلیجہ دہل گیا۔ جب مجھ پر دور سے اتنا اثر ہوا تو آپ لوگوں پر جو کچھ گذر رہی ہوگی، اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ اس کے سوا اب اور کیا دعا کی جا سکتی ہے کہ اس معصوم بچے کی مشکل کو ارحم الراحمین

[1] دونوں حیدرآباد کے مشہور بند اور تفریح گاہ ۱۲ (ع)

[2] جنگ کا تو خیر نام ہی تھا لیکن اب تو یہ دن بدن ترقی "مستقل ہی ہو گئی۔ خصوصاً "آزادی" کی نعمت کے بعد اور بھی برسر ترقی" ہی ہے۔ ۱۲ (ع)

[3] مکتوب الیہ کے چھوٹے بھائی کے ایک بڑے پیدائشی سعید و ذہین ہونہار لڑکے کا انتقال ہو گیا تھا۔ ۱۲ (ع)

آسان فرمائے۔ اف اتنی غیر دلچسپ دنیا میں دلچسپیوں پر تعجب ہوتا ہے۔ اپنا حال تو آپ کو لکھا ہی ہوگا۔ کہ میں گیلانی میں ہوں اور آپ کی گیلانیہ[1] پٹنہ ہیں۔ وہیں ان کو پیچش کا انجکشن دیا جا رہا تھا۔ ادھر ایک ہفتہ سے خبر آئی ہے کہ بخار آگیا ہے اور اترتا نہیں ہے میں خود پٹنہ جا رہا تھا لیکن سبھوں کی رائے یہی ہوئی کہ میں جاکر کیا کروں گا۔ برادرم مکارم سلمہٗ کل پٹنہ روانہ ہو گئے ہیں دیکھئے حق تعالیٰ کو کیا منظور ہے۔

محترمی جناب ڈاکٹر صاحب کا شبہ، جسے آپ نے اس روپیہ کے متعلق لکھا ہے میرے سامنے بھی تھا۔ اور ابتدا میں لوگوں نے جب یہ خبر سنائی تو وہی سوال وصیت کا میرے سامنے بھی آیا تھا لیکن بعد کو جب یہ سوچا گیا کہ وہ بے چاری تو کہاں رن کتی بذات خود مسلمان ہو گئی تھی۔ نہ شوہر ہی اس کا باقی ہے اور نہ اس کے بطن سے کوئی بچہ۔ البتہ اس کے اعزہ ہیں یعنی عصبات ہیں لیکن سب کفر ہی پر قائم ہیں۔ یہ اختلاف دین موجب حرمان ارث ہے۔ اس لئے گویا اس کا پس ماندہ متروکہ دراصل مستحق تو تھا کہ اسلامی بیت المال میں نفاذ وصیت کے بعد داخل کر دیا جائے۔ ولکن این بیت مال المسلمین۔ یہ سوچ کر کہ بیت المال میں اسی لئے ایسا اموال داخل ہوتے تھے کہ عامۂ مسلمین کی ضرورتوں میں کام آئے۔ اس وقت حرمین کے باشندے مسلمانوں میں جس حد تک محتاج امداد ہیں۔ ظاہر ہے۔ اور متوفیہ کے منشا کی بھی اس سے تکمیل ہوتی ہے لیس یہی سوچ کر یہ روپیہ بھیجا گیا ہے۔ باقی اس کے بھائی کافر کو دینے والوں نے جو روپیہ دیا تو اس کے ذمہ دار

[1] مولانا کی اہلیہ محترمہ ۱۲ (ع)

وہی لوگ ہو سکتے ہیں۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ اس کے کافر بھائی نے اپنا حصہ نکال کر لفصف رقم ان صاحب کے اموال کی جنھوں نے میرے سپرد یہ رقم کی ہے۔ یہ دار الحرب ہے اموال محصوٗ کے قوانین کا انطباق حربی ممالک کے اموال پر مشکل ہے پس میرے نزدیک بغیر کسی دغدغہ کے آپ اس رقم کو حرمین بھجوا دیجئے بمتوفیہ کے اگرچہ لفظ تو "مکہ" کا استعمال کیا تھا لیکن عوام "مکہ" سے مراد مکہ و متعلقات مکہ لیتے ہیں۔ اس لئے اگر مدینہ والوں کو بھی اس میں شریک کیا جائے تو کچھ حرج نہ ہوگا خصوصاً جب اس میں تصرف کا نقطۂ نظر بیت المال والے لاوارث مال کا رکھا جائے۔ تو بات اور زیادہ آسان ہو جاتی ہے۔ یہاں بھی کم و بیش وہی حال ہے روانگی کا زمانہ جیسے جیسے قریب آ رہا ہے دل دھڑک رہا ہے۔

مناظر احسن گیلانی

۱۲ر دسمبر ۱۹۴۳ء مطابق ۲۷ر ذی الحجہ ۱۳۶۲ھ۔

مخدوم و محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

الحمد للہ کہ آپ کے دستِ مبارک کا لکھا ہوا کارڈ نہ صرف میرے لئے۔ بلکہ ان تمام لوگوں کے لئے باعث اطمینان ہوا۔ جن کا دل آپ کی صحت کی جانب لگا ہوا تھا۔ آپ اب کچھ چلنے پھرنے بھی لگے ہیں اس سے مزید جذبۂ شکر خداوندی میں اضافہ ہوا۔ خدا کرے کہ دسمبر کی تعطیلات میں آپ اتنی قوت حاصل کر لیں کہ اختتام تعطیل کے بعد حیدرآباد آ جائیے۔ میں اپنا حال کیا لکھوں۔

تعطیل کا آغاز دو تین دن بعد ہونے والا ہے، دیوبند سے بھی طلبی آئی تھی۔ خیال تھا کہ جامعہ سے اجازت مل جائے گی تو شاید دو تین دن پہلے یہاں سے نکل جاؤں۔ لیکن کل جو مراسلہ ملا ہے۔ وہی قاضی[1] کا زمانہ یاد آ گیا۔ غصہ میں میں نے تو سفر کا بالکلیہ ارادہ ہی ملتوی کر دیا آج مراسلہ کا جواب دے رہا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ دیوبند علمی ادارہ نہیں ہے یا فقیر علمی نمائندہ بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ بہرحال سوال و جواب میں تو "تا تو "من رسمی، من بخدا رسم" خیال تھا کہ اگر دیوبند جانا ہو تو واپسی میں ایک ٹرین کو لکھنؤ کے لئے چھوڑ دوں گا۔ لیکن ــــ

آں خیال بشکست وآں ارادہ نہ ماند

فقیر کی یاوہ نویسیوں کی جب آپ بھی تعریف کبھی کر دیتے ہیں تو یہ واقعہ ہے کہ ان کے متعلق مجھے کچھ دھوکہ ہونے لگتا ہے۔ مولینا حالی کی نظموں کی تسلیم نے ایک دفعہ تعریف کی تو مولینا نے لکھا تھا کہ ؎

تسلیم نے دی کچھ اس طرح دادِ سخن
مجھ کو بھی شک اپنی بے کمالی میں ہوا

یہ واقعہ ہے کہ آپ جیسے ارباب بصیرت و نظر بھی جب ستائش شروع کر دیں تو دماغ خراب ہو، دل خراب ہو، جو کچھ بھی خراب نہ ہو کم ہے۔ بہرحال دعا فرمائیے کہ ذخیرۂ آخرت کی یہ نانگ ہو جائے اور سلیمان چاہے تو اس دعوت کو بھی قبول کر سکتا ہے۔

---

[1] قاضی محمد حسین مرحوم سابق وائس چانسلر جامعہ عثمانیہ۔ ۱۲ (ع)

خاکسار نے ایک لفافہ آپ کی دریافت خیریت میں ڈاکٹر صاحب کو بھی لکھا تھا۔ معلوم نہیں ملا یا نہ ملا۔ جواب نہ ملا۔ اور وہ مجھ جیسے عاصی و سرکش کو اپنے محسن ڈاکٹر سے پہلے کب تھی جواب اس کی شکایت کروں بشرطیکہ ملا بھی ہو۔ میں نے اپنی کتاب قرآنی[1] اور بھی ان کے پاس بھیجی تھی معلوم نہیں ان کے ملاحظہ سے گذری بھی یا نہیں میرا بہت بہت سلام عرض کر دیجئے "والتمس عاء استغفار فی الساعات الخاصہ" اپنی والدہ صاحبہ کو بھی سلام فرما دیجئے کوئی خاص بات ادھر قابل ذکر نہیں ہے۔ آپ کی رخصت کی درخواست آپ کی درخواست آنے سے پہلے ہی خاکسار نے داخل کر دی تھی کیونکہ آپ کی درخواست بعد کو پہنچی تنخواہ کی برآمدگی کی کارروائی بھی کر دی گئی ہے۔ ہاں آجکل لاٹ[2] صاحب پانچ دن سے آئے ہوئے ہیں آج جا رہے ہیں اس وقت تک کسی نئی بات کا اظہار نہیں ہوا ہے۔ فقط

مناظر احسن گیلانی

۱۲ر جون ۱۹۴۵ء یکم رجب ۱۳۶۴ھ، گیلانی (بہار)

مولینا المحترم! السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

یقیناً میرے عریضہ کا انتظار آپ کو کرنا چاہئے لیکن سچ عرض کرتا ہوں شرمندگی

---

[1] مولینا نے یہ کتاب اُردو دانوں کے لئے قرآن فہمی کو آسان فرمانے کے لئے لکھی تھی ۱۲ (ع)

[2] وائسرائے۔ ۱۲ (ع)

قلم پکڑنے کی اجازت نہیں دیتی۔ ہو یہ رہا ہے کہ آج پچیس چھبیس دن سے گھر کی فوج کے ساتھ ناشتے اور کھانے کے وقت اس بندۂ کمینہ کی مسلسل

فاکھۃ و اباً[1] (عبس)

کی نعمتوں سے سرفرازی فرمائی جا رہی ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلائے تو کہہ سکتا ہوں کہ سَو سے اوپر ہی آم کٹتے ہیں۔ بازار میں جو قیمت آموں کی ہے اس کے حساب سے دس بارہ روپیہ روزانہ کی رقم کا اسراف نہیں ہے۔ لیکن سوچتا ہوں کہ بچوں کے منھ سے چھین کر گراں آموں کو روپے کی شکل میں بدل بھی دیا جائے اور بالفرض بیچنے کی جو سزا ایک دفعہ بھگت چکا ہوں اس کا اعادہ نہ ہوا تو اس روپے کا مطلب بھی تو یہی ہے کہ گھر کے لوگ نفع اٹھائیں۔ اور دوسرے ارباب حقوق تک ان کے حقوق پہونچا دیئے جائیں۔ پھر وہ آم ہی کی شکل میں کیوں نہ پہونچے۔ بہرحال آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ ایسی حالت میں قدرتاً اپنے ان احباب کا خیال آتا ہی چاہئے جنہیں آم کے قدر شناسوں میں جانتا ہوں۔ لیکن حالت یہ ہے کہ اسٹیشن (شیخپورہ) تک کسی پارسل کا بھجوانا ایک ایسا مسئلہ بنا ہوا ہے جس کے حل کی کوئی شکل نہیں ہے آدمیوں کا قحط ہے۔ کمینے عموماً ملازمتوں میں جا کر داخل ہو گئے ہیں، رسید ہے منھ سے کوئی بات تک کرنے پر رضامند نہیں ہے۔ ایک آنے کی جگہ ایک روپیہ تک دیجئے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کوئی بات سنی ہی نہیں۔ عجب زمانہ ہے سمجھتا تھا کہ جرمنی کے خاتمہ کے بعد مصائب کا خاتمہ ہوگا لیکن

---

[1] مولانا کی زبانی، کا اشارہ یہ تھا کہ "اباً" اور "انبہ" نام کہیں ایک ہی تو نہیں؟ ۱۲- (ع)

بظاہر ان میں کچھ اضافہ ہی ہوگیا ہے[1]۔ میں کیا عرض کروں منہ میں آموں کی قاش ڈالتا ہوں آپ کو یاد کرتا ہوں۔ میاں مکارم پر بگڑتا ہوں اور ان کی ایک لچھے دار تقریر (علی الموانع) سن کر چپ ہو جاتا ہوں۔ بہرحال ہو سکتا ہے کہ اپنے ساتھ کچھ آم لے چلوں لیکن ریل کی کشمکش کا خیال جس کی تسلیط کا آغاز ہو چکا ہے جب اسے سوچتا ہوں تو ہڈی کانپنے لگتی ہے۔

سید صاحب تو آجکل میرٹھ براج رہے ہیں۔ ایک نوازش نامہ ان کا آیا تھا۔ مولوی فضل صاحب اپنے خسر[2] کو چھ مہینے کی توسیع دلانے میں کامیاب ہوئے۔ اخبار سے معلوم ہوا۔ ڈاکٹر صاحب سے سلام فرما دیجئے گا۔ اخبارات سے معلوم ہوا کہ لکھنؤ میں گرمی سخت پڑ رہی ہے یہ گرمی تو یہاں بھی ہے لیکن نہ اتنی جس کی خبر لکھنؤ سے آ رہی ہے۔ فقط

مناظر احسن گیلانی

۶ر نومبر ۱۹۴۵ء، ۳۰ر ذیقعدہ ۱۳۶۴ھ

جوار الجامعۃ العثمانیہ، محلہ مسجد اقصیٰ

مولینا المحترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

چہ خوش! یہاں انتظار کی گھڑیاں شمار کرتے کرتے، اکیلے نیاز مند ہی نہیں مولینا فضل،

---

[1] اور انسان کی لغاوت کے اضافہ کے ساتھ بظاہر آئندہ بھی ہوتا رہنا چاہئے اور اس مکتوب پر پندرہ سال گذر رہے ہیں یا روز افزوں اضافہ ہی ہے ۱۲ (ع)

[2] مولینا مفتی عبداللطیف صاحب مرحوم صدر شعبۂ دینیات عثمانیہ یونیورسٹی ۱۲ (ع)

ڈاکٹر عثمان صاحب سب کے سب تھکے چلے جا رہے ہیں۔ اور آپ کا گرامی نامہ آنا بھی ہے تو کس کے پاس حافظ زریں المعروف بہ حافظ محمد شریف[1] (مولوی فاضل) کے پاس یعنی مولوی فاضل کے امتحان میں وہ کامیاب ہو گئے۔ اب بہ تلاش ملازمت سرگرداں ہیں۔ خیر تو اچانک ان کے نام جو آپ کا کارڈ آیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ نہ فقیر کا لفافہ ہی آپ کو ملا ہے اور نہ کوئی حیدرآباد کی دوسری ڈاک ــــ "انا للہ وانا الیہ راجعون"ــــ

علی میاں سلمہٗ کا بھی ایک خط رائے بریلی سے اسی مضمون کا مل کر میرے لئے باعث حیرت بنا ہوا تھا، کہ تم نے خط کا جواب نہیں دیا۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ سفر پر جو روانہ ہوئے تو یاروں نے آپ کی ڈاک کو خورد برد کر دیا۔ مولوی فضل چار عدیم الجواب خطوط کے مدعی ہیں۔

خاکسار نے اپنے اس عریضہ میں لکھا تھا کہ کدوکاوش کے بعد علی میاں کے متعلق دو راہیں لوگوں نے نکالی ہیں ان میں سے جس طریقے کا چاہیں انتخاب کریں۔ اگر حیدرآباد آ کر کام کرنا چاہتے ہیں تو ڈاکٹر نظام الدین صاحب نے دو سو کلدار سفر خرچ دینے کا وعدہ کیا۔ یعنی طباعت کی مد سے اور لکھنؤ میں رہ کر کام کرنا چاہتے ہیں تو اس سے بہتر کیا ہوگا، کتاب[2] کو

---

[1] یہ بے چارے ایک ندوی فوجی سے مفرور مکتوب الیہ کے پاس پناہ گزیں تھے۔ مولینا نے یاد نہیں کسی مناسبت سے ان کو حافظ زریں کا لقب دے رکھا تھا۔ ۱۲ (ع)

[2] علی میاں سلمہٗ کے والد رحمہ اللہ کی کتاب نزہۃ الخواطر مراد ہے جس کی طباعت دائرۃ المعارف نے منظور کر لی تھی۔ ڈاکٹر نظام الدین صاحب پروفیسر فارسی (جامعہ عثمانیہ) اس زمانہ میں دائرہ کے ناظم تھے۔ (ع)

قابلِ طباعت بنا بنا کر وہ بھیجے جائیں۔ دائرۃ المعارف چھاپتا جائے گا۔ میں نے لکھا تھا کہ حیدرآباد آنے کے لئے سفر خرچ ہی کا سوال ہے باقی قیام کے لئے تو خاکسار کا غریب خانہ جب تک ہے، علی میاں کو دوسری جگہ ٹھہرنے کا حق ہی کب دیا جائے گا۔

افسوس ہے کہ خط آپ کو نہیں ملا ورنہ اب تک کارروائی آگے بڑھی ہوتی۔ اب تو نومبر کا مہینہ آگیا دسمبر کی تعطیل سر پر ہے ایسی صورت میں علی میاں حیدرآباد کیا آئیں گے میں نے بریلی بھی ان کو اسی مضمون کے ساتھ جواب دیا ہے۔ آپ کے متعلق برنی صاحب[1] اور علی یاور جنگ[2] دونوں سے متعدد بار مل چکا ہوں، مگر اب تک تصفیہ نہیں ہوا ہے اور کوئی خاص نئی بات ادھر پیدا نہیں ہوئی۔

---

[1] مولانا اور مکتوب الیہ دونوں کے خاص عنایت فرما پروفیسر محمد الیاس برنی صاحب مرحوم اس زمانہ میں رجسٹرار ہو گئے تھے ۱۲ (ع)

[2] نواب علی یاور جنگ اس وقت یوگوسلاویہ میں حکومت ہند کے سفیر ہیں اس سے پہلے اسی عہدہ پر مصر اور ارجنٹائن میں رہ کر کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ حکومت عثمانیہ کے دور میں مختلف بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ جامعہ عثمانیہ کے وائس چانسلر اور حکومت عثمانیہ میں وزیر بھی رہے۔ انقلاب حیدرآباد کے بعد حکومت ہند نے دوبارہ انھیں جامعہ عثمانیہ کا وائس چانسلر مقرر کیا۔ نواب عماد الملک سر سید حسین بلگرامی کے حقیقی نواسے ہیں۔ غیر معمولی شکل و صورت قد و قامت اور دل و دماغ پایا ہے۔ نام علی یاور ہے جنگ کا خطاب نواب حیدرآباد نے دیا۔ مولانا گیلانی انھیں کی وائس چانسلری کے دور میں وظیفہ حسن خدمت پر ۱۹۴۹ء اپریل میں سبکدوش ہو کر گیلانی میں آکر رہ گئے تھے۔ ۱۲

ہاں مولوی شریف صاحب سے معلوم ہوا کہ اسی خط میں آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ اعظم گڈھ گئے تھے اور وہاں بیمار ہو گئے۔ شاید سید صاحب قبلہ کی عیادت ہی میں جانا ہوا ہو گا معلوم نہیں سید صاحب اب کیسے ہیں۔ اور آپ کا کیا حال ہے۔ سید صاحب نے تو مجھے لکھا تھا.... کہ دار المصنفین کی نظامت اب مولانا عبا[1]دی کے سپرد کر دی جائے، تو مناسب ہے، کہئے تیار ہیں۔

اپنی والدہ صاحبہ محترمہ کی خدمت میں سلام فرما دیجئے۔

خاکسار

مناظر احسن گیلانی

---

۱۹ دسمبر ۱۹۴۵ء ، ۱۳ محرم ۱۳۶۵ھ

گیلانی

محب و رفیقی فی الدنیا والآخرہ — السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا لفافہ گیلانی کے پتے سے لکھا ہوا مجھے گیلانی ہی میں مل گیا۔ آپ کے گرامی نامہ نے میری ان کلفتوں کو سچ پوچھئے تو دھو دیا جو کمیل وظیفہ کی کارروائی[2] کی ناکامی کی وجہ

---

[1] مکتوب الیہ نے ابتداءً بعض مضامین "عبد شمس" (عبد شمس) وغیرہ کے قیاس پر "عبدی" کے نام سے لکھے تھے ۱۲ (ع)

[2] وہی مکتوب الیہ کے وظیفہ کی کارروائی ۱۲ (ع)

پیدا ہوگئی تھی۔ بحمد اللہ حق تعالیٰ نے آپ کو بڑی دولت سے سرفراز فرمایا۔ جو کچھ آپ سے لیا گیا ہے وہ اس کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہے جو آپ کو دیا گیا ہے۔ فہنیئاً لکم ثم ہنیئاً لکم۔ صحت و تندرستی کی دولت مزید برآں ہے۔ امید ہے کہ اس نعمت کے شکر میں مسلمانوں کو اپنا علم عطا فرمانے میں اب تقاعد نہ فرمائیں گے۔

البتہ آپ کے خط سے پھر میں خیال کرتا ہوں کہ آپ کی کارروائی اٹھائی جا سکتی ہے اور حیدرآباد پہونچ کر انشاء اللہ پھر اس کی کوشش کا عزم کئے ہوا ہوں۔ میں نے فرمان مبارک کے ان الفاظ کو نہیں دیکھا تھا جو وہیں کی کارروائی کے سلسلہ میں شرف صدور لائے ہیں۔ ان الفاظ سے اس نتیجہ کو پیدا کرنا یقیناً صحیح نہیں ہے جسے ان حضرات نے مانع کی حیثیت سے استعمال کیا ہے[1]۔

اور کیا عرض کروں۔ گھر آنے کے بعد جن حالات میں گھر جاتا ہوں ان ہی میں گھر اہوا ہوں۔ ایک ہفتہ بھی گیلانی میں سکون کے ساتھ بیٹھنے کا موقع نہیں ملا ہے۔ آج یہاں، کل وہاں۔ کسی کی شادی کبھی کی غمی۔

آج کل زیادہ تر مسلم لیگ کا زور ہے دیوبند میں مجلس شوریٰ کا اجلاس منعقد ہو رہا ہے مجھے بھی بلایا گیا ہے شاید اس اہم جلسہ میں ضرور شریک ہوں۔ لیکن حیدرآباد ہی میں ایک دن سڑک پر کیلے کے ایک چھلکے پر میرا پاؤں پھسل گیا۔ اگر سنبھالنے والے سنبھال نہ لیتے تو خدا ہی جانتا ہے کہ مجھ پر کیا گذرتی لیکن سنبھل جانے کے باوجود پاؤں پر ایک سخت جھٹکہ تو

[1] یہ معاملہ خود مکتوب الیہ کا تھا مگر صورت کیا تھی؟ اب ذہن سے بالکل محو ہے۔ ۱۲ (ع)

لگ ہی گیا۔ گھٹنوں اور پٹھوں پر کافی اثر اس جھٹکے کا رہ گیا ہے۔ گو مالش وغیرہ سے اب اچھا ہو رہا ہوں۔ لیکن تاریخ انعقاد تک میں سفر کے اور کسی طویل سفر کے قابل ہو جاؤں گا مشکل ہے۔ ڈاکٹر صاحب اور مولوی سید ابوالحسن[1] صاحب کو میرا سلام فرما دیجئے۔ والدہ صاحبہ کو میرا سلام فرما دیجئے۔ فقط

مناظر احسن گیلانی

۳؍ جنوری ۱۹۴۶ء - ۲۹؍ محرم ۱۳۶۵ھ

گیلانی (بہار)

حبی وصدیقی فی الدنیا والآخرہ   السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ابھی آپ کا نوازش نامہ باعث سرفرازی ہوا۔ جی ہاں پاؤں تو اب اچھا ہے ابوالکلامی[2] مقام تک پہونچتے پہونچتے رہ گیا۔ واقعی وطن میں وطنی مشغولیتوں نے دماغ کو کھلا دیا۔ اب کی ۹؍ جنوری کو کالج کھلے گا۔ امروز فردا میں خاکسار دکن انشاء اللہ روانہ ہو جائے گا۔ مناسب تھا کہ تین چار دن بعد آپ ایک خط ذرا مفصل لکھ کر بھیجتے۔ مطلب یہ ہے کہ آئندہ اس کارروائی کو پھر کس طرح اٹھایا جائے۔ جو نکات دماغ میں ہیں وہ تو خیر اپنی جگہ

[1] مولانا علی میاں صاحب ۱۲

[2] مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ پھسل کر گر گئے تھے اور پیر دان میں سخت چوٹ آئی تھی۔ ایک عرصہ تک فریش رہے۔ ۱۲

ہیں۔ لیکن اس عرصہ میں جو باتیں آپ کے قلب پر وارد ہوئی ہوں ان کو لکھ کر بھیجئے۔ میں شدت سے آپ کے خط کا انتظار کروں گا۔ دیوبند[1] نہ جانے کی مجھے بھی مسرت ہوئی نتائج کا علم مجھے بھی نہیں ہے۔ اخباروں سے بھی پتہ نہ چلا۔

اپنی والدہ صاحبہ کی خدمت میں میری طرف سے سلام عرض کرتے ہوئے دعا کی بھی درخواست دیجئے۔ اب دل بہت گھبراتا ہے اس لئے زیادہ گھبراتا ہے کہ دکن سے وطن تک ایک آدمی بھی اب ایسا کوئی باقی نہ رہا جس سے میں گفتگو کر کے اپنے دل کی کم از کم بھڑاس نکالوں۔ اور نہ کوئی ایسا ہے جس سے کچھ سن کر سکینت قلب حاصل کر لوں۔ ایسی تنہائی محسوس کر رہا ہوں، گویا دنیا میں تنہا پیدا کیا گیا ہوں۔ گویا اگر میں آدمی ہوں تو دوسرے آدمی نہیں ہیں۔ اور وہ آدمی ہیں تو میں جانور ہوں۔

معارف میں دوسرا نمبر بھی سود والے مضمون کا آگیا ہے نظر مبارک سے گذرا ہوگا ماجد میاں نے مطلع کیا ہے کہ کوثر اخبار جو ابوالاعلائی تحریک کا آرگن ہے خاکسار پر سب و شتم لعن طعن اسی سود والے مضمون کی بنیاد پر کر رہا ہے۔ وانما اشکو بثی وحزنی الی اللہ (یوسف) والی اللہ المشتکی۔ اس کے سوا اور کیا جواب دوں۔ ڈاکٹر صاحب کو سلام فرما دیجئے دارالمصنفین کی رکنیت کے متعلق خط آیا تھا اس سے ضرور مطلع فرمائیں گے کہ آپ آج کل

---

[1] مولانا وہاں کی مجلس شوریٰ کے رکن تھے۔ کوئی ہنگامہ خیز مسئلہ تھا اور مولانا کسی فریق کا ساتھ دینے سے احتراز فرمانا چاہتے تھے۔ ۱۲ (ع)

اپنے تصنیفی کام میں مشغول ہیں یا نہیں۔ خدا کرے آپ کی سوانح و واردات[1] عام مسلمانوں تک پہونچ کر ایمانی قوت کے بڑھانے میں ممد و معاون ہو۔

نیاز مند

مناظر احسن گیلانی

۱۲ر جنوری ۱۹۴۶ء، ۷ صفر ۱۳۶۵ھ

حیدرآباد دکن

مخدومی و صدیقی وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

افرغ اللہ علیکم من لدنہ صبراً و ثباتاً۔ ہوش اڑ گئے جوں ہی آپ کے کارڈ پر نظر پڑی۔ کالج ہی میں ملا۔ ایک دفعہ نہیں ابتدائی سطروں کو کارڈ کی دوبارہ سہ بارہ پڑھتا تھا یا اللہ یہ کیا مضمون ہے۔ مولوی فضل صاحب سامنے بیٹھے تھے۔ آخر ان کی طرف متوجہ ہوا — بھائی! مولانا کیا لکھ رہے ہیں! آخر جو واقع ہو چکا تھا ماننا پڑا کہ وہ ہو چکا۔ انا للہ... شان نہ گمان۔ اف کیا دھوکہ ہے۔ زندگی صرف فریب ہے مگر کیا کیجئے۔ ان ہی دھوکوں میں خود بھی جینا ہے۔ دوسروں کو مرتے ہوئے خود دیکھنا، اپنے مرنے کا تماشا دوسروں کو دکھانا بس یہی حاصل حیات ہے۔ اللہ اللہ آپ کی بیچاری ضعیفہ والدہ کے لئے یہ کیا ہدم ہے۔ اور

---

[1] حضرت مرشدی (مولانا حکیم الامت علیہ الرحمہ) پر کچھ تحریر کی توفیق شروع ہوئی تھی جس نے بالآخر "سلسلہ تجدید" کی صورت اختیار کر لی۔ ۱۲ (ع)

آپ کے لئے بھی کیا کم ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اپنے گھر کے لوگوں میں جو تعلق مولینا مرحوم[1] سے آپ کے قلب کو تھا کسی سے نہ تھا۔ بڑی ذمہ داریاں چھوڑ کر وہ آپ پر چلے گئے۔ کیا بتاؤں کہ اچانک آپ کن حالات میں اس حادثے کی بنا پر گھر گئے۔ بس ایک ہی بات شروانی صاحب کی یاد آتی ہے کہ "گھوڑا چھوٹا نہیں پڑا ہے"۔ باگ والے کے ہاتھ میں ہر کلی و جزئی واقعہ کی باگ ہے۔ علیم و خبیر۔ رحیم و کریم ارحم الراحمین اس عالم کا "حی القیوم" ہے۔ جاہل کو کیا حق ہے کہ عالم حکیم کے کسی فعل پر نکتہ چینی کی جرأت کرے۔ اور یوں بھی اگر سوچئے کہ ایک مرحوم سعد آپ سے لئے گئے ہیں لیکن ان ہی کے ذریعہ سے چھ افراد کا اضافہ آپ کے کنبے میں ہوا ہے۔ آپ کو اور آپ کی والدہ کو چاہئے کہ ان ہی بچوں کو ان کا قائم مقام تصور کریں۔ ماشاء اللہ ان کے بعض بچے اب ہوشیار اور سعید ہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ وہ جلد اپنے والد کی جگہ کو پُر کریں گے۔ لیکن پھر بھی سعد سعد ہی تھے۔ ایمان کے ساتھ گئے ہیں، بحمد اللہ ایمان والوں کو چھوڑ گئے ہیں۔ والذین آمنوا واتبعتهم ذریتهم بایمان الحقنا بهم ذریتهم وما التنا من عملهم من شيء كل امرء بما كسب رهين[2] (طور) جنت عدن يدخلونها ومن صلح من آبائهم وازواجهم وذريتهم والملئكة يدخلون عليهم من كل باب سلم عليكم بما صبرتم فنعم عقبى الدار[3] (رعد)

---

[1] مکتوب الیہ کے چھوٹے بھائی سعد الدین مرحوم کا اچانک اس حال میں رات کو انتقال ہوا کہ عشاء پڑھ کر اچھے خاصے سوئے اور صبح ہی دہلی کا سفر تھا مگر بارہ بجے رات سے پہلے آخرت کا سفر پیش آگیا۔ فغفر اللہ لہ ولنا۔ ۱۲ (ع)

[2] (ترجمہ) جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد نے بھی ایمان میں ان کا ساتھ دیا (باقی اگلے صفحہ پر)

انہوں نے صبر کی زندگی گذاری تھی۔ انشاء اللہ۔ "سلام علیکم بما صبرتم فنعم عقبی الدار" کے ساتھ عالم ملکوت میں ان کا استقبال ہو رہا ہوگا۔ حق تعالیٰ سے مغفرت کی التجا ہر مومن و مسلم کے لئے فرض ہے۔ پھر ان جیسے مومن باللہ کے لئے کیوں نہ کروں گا۔ خدا جانے میں نے کیا کچھ دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس خبر نے خود میرے ہوش و حواس کو ایک حد تک مختل سا کر دیا ہے۔ حالانکہ ان سے جسمانی قرب کے مواقع کم ہی میسر آئے۔ لیکن دل میں ان کی بڑی جگہ تھی۔ جس کا اندازہ اب ہو رہا ہے۔ اللہم اغفر لہ وارحمہ۔ آپ کی والدہ صاحبہ کو کیا لکھوں۔ تعزیت سے ان کا غم گذر چکا ہے۔

مناظر احسن گیلانی

(حاشیہ صفحہ گذشتہ)

ہم ان کی اولاد کو بھی درجہ میں ان کے ساتھ شامل کر دیں گے۔ اور ان کے عمل میں سے کوئی چیز کم نہ کریں گے۔ ہر شخص اپنے اعمال میں گرفتار ہے۔

[3] (ترجمہ) ہمیشہ رہنے کی جنتیں، جس میں وہ لوگ بھی داخل ہوں گے۔ اور ان کے ماں باپ ازواج و اولاد میں جو لائق ہوں گے۔ وہ بھی اور فرشتے ان پر ہر دروازہ سے داخل ہوں گے کہ تم سلامت رہو۔ اس کی کہ تم نے صبر کیا۔ بس یہاں تمہارا انجام بہتر ہے۔

۱۱ر فروری ۱۹۴۶ء، ۸ ر ربیع الاول ۱۳۶۵ھ

حیدرآباد دکن

مولینائے محترم! افرغ اللہ علیکم من لدنہ صبرا جمیلا

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کئی دن ہوگئے کہ آپ کا عنایت نامہ آیا ہوا رکھا ہے۔ جواب میں تاخیر کی وجہ کیا عرض کروں۔ حوادث کا عجب حال ہے۔ عشاء کی نماز کے لئے مسجد جا رہا تھا۔ پارؤیوں[1] کے لونڈوں نے راستہ میں "حبالہم" کو "یخیل الیہ انہا تسعیٰ" کی شکل میں ڈال دیا تھا اور کسی طرف چھپے ہوئے ڈور کے ایک سرے کو ہلا رہے تھے۔ خدا جانے دام کس لئے بچھایا گیا تھا۔ آگیا اس میں بندہ۔ تاریکی میں اندازہ زیادہ نہ ہوسکا۔ سانپ ہی کا خیال گذرا۔ بزدل تو فطرتاً ہوں۔ تڑپ کر آگے کی طرف بھاگا۔ لیکن پاؤں میں دوڑنے کی قوت کہاں تھی چاروں شانے چت گرتا تو شاید زیادہ تکلیف نہ ہوتی۔ سینے کے بل گرا۔ گھٹنوں اور مونڈھے میں چوٹ تو خیر معمولی تھی لیکن سینے پر شدید ضرب آئی۔ تاہم بدن جھاڑ کر اٹھ گیا۔ رات کو کسی سے کہا بھی نہیں۔ چپ چاپ نماز پڑھ کر سو رہا۔ صبح کو سینے کی تکلیف ناقابل برداشت حد تک پہنچی ہوئی محسوس ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب کو بلایا۔ سینے کی غالباً کوئی ہڈی ٹوٹ گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے ظن غالب کی شکل میں اپنی تجویز پیش کی۔ سن کر دم نکل گیا۔ ایکسرے کرانا ہوگا۔ سپرد کر دیا،

---

[1] اوپر کہیں ذکر آچکا ہے پھیری سے پھل بیچنے والی ایک خانہ بدوش قوم۔ جو مولینا کے بنگلے کے سامنے جھونپڑیوں میں رہتی تھی۔ ۱۲ (ع)

سکندر آباد ہسپتال میں جاکر ایکسرے کرایا گیا۔ خدا کا شکر ہے کہ شکست کا پتہ نہ چلا۔ اس کے بعد چار دن تک مرہم پٹی درد کے ازالہ کے لئے ہوتی رہی۔ تقی صاحب اپنے گھر اٹھا کر لے گئے تھے ان کے داماد ڈاکٹر ہیں۔ انہوں نے مرہم پٹی کی۔ آہستہ آہستہ درد میں کمی ہوئی۔ اب کالج جا رہا ہوں اگرچہ ابھی بالکلیہ درد کا ازالہ نہیں ہوا ہے۔ اس دکھڑے کو رونے کی ضرورت اس لئے ہوئی کہ جواب میں تاخیر کی وجہ معلوم ہو۔ ورنہ سچ یہ ہے کہ آپ کا غم اس وقت الیم غم ہے۔ ع

صبت علی الایام صرن لیالیا

کیا تسلی دوں۔ میرے الفاظ اور معنی کا ذخیرہ ختم شدہ معلوم ہوتا ہے۔ "بڑے زلزال شدید" کا وقت ہے۔ اللہ ایمان کو صحیح و سلامت رکھے۔ آٹھ سال کی مہاجرت کے بعد حبشہ سے اللہ کے محبوبؐ کے بھائی مدینہ آئے تھے۔ خیبر کے فتح ہونے کی زیادہ خوشی ہے یا جعفرؓ کی واپسی کی۔ پیغمبرؐ کو اس تعین میں دشواری ہو رہی تھی۔ لیکن چند ہی مہینے کے بعد پیغمبرؐ کے بھی محبوب بھائی موتہ جا کے "میرا ایک ہاتھ کٹتا ہے۔ دوسرے سے اسلام کا پھریرا بلند رکھتے ہیں۔ وہ بھی کٹتا ہے تو کٹے ہوئے ہاتھ اور سینہ سے تھامتے ہیں۔ آخر اسی زخم جو سینہ کے سب سامنے ہی کی طرف تھے کھا کر اس دنیا سے ہجرت کر جاتے ہیں۔ پیغمبرؐ روتے جاتے ہیں اور خبر دیتے جاتے ہیں، جعفر شہید ہوئے، زید شہید ہوئے، جو کبھی زید بن محمدؐ کہلاتے تھے۔ سب سے بڑے محبوبؐ کے ساتھ جب یہ واقعات پیش آسکتے ہیں اور آئے ہیں تو اس کے بعد اب بات ہی کیا رہ جاتی ہے۔ میرا تو قلم کانپ رہا ہے، کس طرح آپ کی اور آپ کی والدہ کی تسلی کروں۔

مولوی سید ابوالحسن علی کے پاس "نزہۃ الخواطر" ترتیب و تصحیح و تنظیم کے لئے بھیجی

گئی ہے معلوم نہیں پہونچی یا نہ پہونچی۔ مولوی فضل کا معاملہ ہنوز روزِ اول ہے۔ کیا عرض کروں۔ بے چارے[1] غلہر کو ان لوگوں نے پارٹ ٹائم لکچرار بنا کر اس وعدے سے بھیجا تھا کہ تین چار ماہ بعد اس کو مستقل کر دیا جائے گا۔ لیکن ڈھائی سال گذر گئے نہ اس کی سروس ہی مستقل ہوئی اور نہ تنخواہ میں ایک پائی کا اضافہ۔ جو بساط بھی ہے اس کے مصروں کے متعلق کیا عرض کروں، بجز اس کے ربِّ نجنی من القوم الظالمین۔ ڈاکٹر صاحب سے سلام فرما دیجئے۔ آپ کی والدہ صاحبہ کا صدمہ سخت ہے۔ ان سے کیا عرض کروں، ایمان والقان ان کی شکل میں مجسم بنے۔

مناظر احسن گیلانی

۲۸؍ فروری ۱۹۴۶ء ۔ ۲۵؍ ربیع الاول ۱۳۶۵ھ

حیدرآباد دکن

اخونا فی اللہ صدیقی فی الدنیا والآخرہ۔ ثبتکم اللہ علی صراط المستقیم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ایک ہی مضمون کے دو کارڈ جن سے یکے بعد دیگرے ایک دن کے تقدم و تاخر سے سرفرازی ہوئی۔ مجھ پر تو ایک بڑا مسئلہ منکشف ہو گیا۔ آپ کا سہو میرے لئے سجدۂ سہو کا

[1] مولانا کے سب سے چھوٹے بھائی جناب ماشاء اللہ مستقلاً عثمانیہ یونیورسٹی ہی میں معاشیات کے استاد ہیں۔ ۱۲ (ع)

قائم مقام بن گیا۔ روایت بالمعنی پر منکرینِ حدیث کے اعتراضوں میں ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ ایک مقصد کی تعبیر میں چند آدمی نہیں بلکہ ایک ہی شخص دوسری دفعہ ان ہی الفاظ کو دہرا نہیں سکتا جن سے پہلی دفعہ اپنے مافی الضمیر کو اس نے ادا کیا ہو۔ شک اندازی کا ایک مشہور حربہ ان کے پاس یہ بھی ہے

لیکن آپ کے ان دونوں گرامی ناموں کو ملا کر میں نے جو دیکھا تو جو کچھ ایک میں تھا وہی دوسرے میں۔ معانی ہی نہیں الفاظ تک قریب قریب دونوں کے ایک ہی ہیں۔ میں نے تو دونوں کو رکھ لیا ہے۔ "تدوینِ حدیث"[1] میں روایۃ بالمعنی کی بحث میں انشاء اللہ منجملہ دوسرے دلائل کے یہ دونوں کارڈ بھی دلیل کا کام دیں گے۔ خصوصاً ایسی حالت میں جب بولنے والے کے سامنے نہ معانی ہی کا اعادہ چنداں اہم تھا، اور نہ الفاظ کا۔ آپ کے حافظہ کی داد دوں، یا ذہنی گرفت کی استواری کی تحسین کروں۔ بہرحال ایک

[1] فاضل گیلانی نے فتنۂ انکارِ حدیث کے پیش نظر خالص علمی نقطۂ نظر سے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے پہلے چار محاضرات خاص تدوینِ حدیث کے موضوع پر جامعہ عثمانیہ کے توسیعی لکچرز کی صورت میں پیش فرمائے جسے بعد میں مولانا نے کتابی شکل دے دی۔ اب یہ کتاب تدوینِ حدیث کے نام سے ۴۰۰ صفحات پر ادارہ مجلس علمی کراچی (سابق ڈابھیل) سے شائع ہوئی ہے۔ کتاب میں حدیث کی شرعی حقیقت، دینی اہمیت، اس کی تدوین و حفاظت، حدیث کے معیارِ رد و قبول پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے اور ان شکوک و شبہات کا بھی اطمینان بخش جواب دیا گیا ہے جو حجیتِ حدیث کے منکرین پیش کرتے ہیں ۱۲

دلچسپ مسئلہ آپ کا یہ ہو بن گیا ہے آپ نے خیال کیا کہ پہلا کارڈ گم ہو گیا لیکن وہ گم نہ ہوا میں تو سمجھتا ہوں کہ ہمیشہ کے لئے باقی رہ گیا۔

اس وقت یہ عریضہ اسی واقعہ کے اظہار کے لئے لکھ رہا ہوں آپ نے اپنے جس ابتلاء کا ذکر فرمایا ہے انشاء اللہ اس کو شفا ہی سنوں گا۔ الیوم یئس الذین کفروا من دینکم (مائدہ) انشاء اللہ اب شیطان بھی آپ کے دین سے مایوس ہو چکا ہے۔ بلاشبہ حق تعالیٰ ہی کا فضل ہے لیکن اس کے فضل کے ظہور کی شکل اللہ والوں کی صحبت ہوتی ہے حضرت مدنی[1] کا ہاتھ پکڑنے والا اور حکیم الامت کی صحبت طیبہ سے استفادہ کرنے والا کیا محروم رہ سکتا ہے؟ اور سب سے بڑی ولایت کا سایہ تو آپ پر اُن ہی ماقدام کا سایہ ہے جس کے نیچے آپ کی جنت ہے۔ میرا بہت بہت سلام والدہ صاحبہ سے عرض کر دیجئے۔ دعاؤں کا سخت محتاج ہوں۔

مولانا فضل کا معاملہ ہنوز روز اول کے حال میں ہے۔ اب تو مجھے مایوسی سی ہو گئی ہے برنی[2] صاحب کی سجلیت اس وقت ان کے حق میں ہے۔

مناظر احسن گیلانی

---

[1] مولینا عبدالباری صاحب کو بیعت حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی سے تھی جس وقت موصوف اور مولانا عبدالماجد دریا آبادی حضرت علیہ الرحمۃ سے بیعت کے لئے دیوبند حاضر ہوئے تھے، راقم الحروف دارالعلوم دیوبند میں زیر تعلیم تھا۔ ۱۲

[2] پروفیسر محمد الیاس صاحب برنی مرحوم (مؤلف "قادیانی مذہب") اس وقت جامعہ عثمانیہ کے رجسٹرار تھے۔ اور مولینا فضل اللہ صاحب کا کوئی مسئلہ جامعہ ہی میں پیش تھا۔ ۱۲ (ع)

مکاتیب بنام

علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ ۲ سنہ ۱۳۰۲ھ مطابق سنہ ۱۸۸۴ء میں اپنے وطن دیسنہ میں پیدا ہوئے۔ اُردو فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم مکان میں پھلواری شریف ضلع اور مدرسہ امدادیہ دربھنگہ میں حاصل کی۔ پھر ندوۃ العلماء جا کر تکمیل کی۔ اور وہیں سنہ ۱۹۰۸ء میں استاد مقرر ہوئے کچھ دنوں مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبار الہلال کی ادارت میں شریک رہے۔ سنہ ۱۹۱۲ء سے سنہ ۱۹۱۴ء تک دکن کالج پونہ میں لکچرار رہے۔ سنہ ۱۹۱۴ء ہی میں آپ مستعفی ہو کر چلے گئے اور سیرۃ النبی صلعم کی تکمیل اور دارالمصنفین کے قیام و ترقی میں مصروف ہو گئے۔ علامہ شبلی سیرۃ النبی کی صرف جلد اول مکمل کر سکے تھے اور جلد ثانی کا مسودہ تکملہ اور اضافہ کا محتاج تھا جسے سید صاحب نے مکمل فرمایا۔ اس کے بعد چار ضخیم جلدیں لکھیں، اور دارالمصنفین کو ترقی دے کر اس مقام تک پہونچایا جہاں وہ آج نظر آ رہا ہے۔ سنہ ۱۹۱۶ء سے سنہ ۱۹۳۶ء تک آپ سیاسیات حاضرہ میں بہت محفوظ طریقے پر شریک ہوتے رہے۔ مختلف کانفرنسوں اور

جمعیتوں اور اجلاسوں کی آپ نے صدارت کی۔ کانگریس میں شریک ہوئے پورے ملک کا دورہ کیا۔ وفد خلافت کے ایک رکن کی حیثیت سے انگلستان اٹلی و فرانس کا سفر کیا، ایک وفد لے کر حجاز بھی گئے، شاہ کابل کی دعوت پر کابل یونیورسٹی کے قیام پر مشورہ دینے کابل تشریف لے گئے۔ جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس کلکتہ اور آل انڈیا فلسطین کانفرنس دہلی کی صدارت کی۔ اور یادگار خطبات دیئے۔ ۱۹۲۷ء سے آپ نے سیاسیات سے کنارہ کشی اختیار کی، آپ کی شخصیت سراسر علمی تھی ادب و تاریخ میں آپ کا مقام بہت بلند تھا اور سیرت کے تو امام ہی تھے، سینکڑوں مضامین لکھے۔ دسیوں خطبات صدارت تحریر فرمائے، آپ کی چھوٹی بڑی تصانیف کی تعداد تقریباً بیس ہے۔

ہندوستانی اکیڈیمی الٰہ آباد کے صدر، ہندوستانی کمیٹی صوبہ بہار، یونیورسٹی کورٹ علی گڑھ، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، مدرسہ اگزامینیشن بورڈ پٹنہ کے ممبر رہے آپ نے تزکیہ باطن اور اصلاح نفس کے لئے حضرت تھانوی رح کی طرف رجوع کیا اور اس راہ کو بھی جلد ہی طے کیا اور بالآخر ۱۹۴۲ء میں حضرت تھانوی کی خلافت سے سرفراز ہوئے۔

اسی سال علی گڑھ یونیورسٹی نے آپ کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دی جو دراصل یونیورسٹی کی طرف سے آپ کے علم و تبحر کا اعتراف تھا۔ اس موقع پر علامہ گیلانی نے اپنے ایک مکتوب بنام سید صاحب میں تحریر فرمایا ہے۔

"لیجئے ایک ہی سال میں حق تعالیٰ نے ظاہری اور باطنی نعمتوں سے سرفراز فرمایا۔ ہندوستان کے دونوں علمی مرکزوں کو اتفاق کرنا پڑا کہ جن نیک نیت بزرگوں نے جس نصب العین کو پیش نظر رکھ کر ندوۃ العلماء کے دارالعلوم کی بنیاد رکھی تھی بالآخر وہ اس نتیجہ پر اپنے غریبوں کو پہونچا کر رہا کہ آن واحد میں دیوبند و علی گڑھ دونوں نے اس کی تصدیق کی"

۱۹۴۹ء میں آپ نے حج کیا، ۱۹۵۰ء میں آپ کراچی تشریف لے گئے اور وہیں مقیم ہو گئے۔ نومبر ۱۹۵۳ء میں آپ نے رحلت فرمائی۔ اور کراچی ہی میں مدفون ہوئے۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

حیدرآباد دکن

۲۴ رمضان المبارک ۱۳۵۶ھ - ۲۰ نومبر ۱۹۳۷ء

سیدی الامام! دمتم بالعافیہ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آپ کو خط لکھتے ہوئے بھی ڈرتا ہے، کچھ نہیں تو کم از کم یہی اعتراض سہی کہ خط غبار کا خط تھا۔

امید ہے کہ آپ بعافیت اپنے اہل بیت میں پہونچ گئے ہوں گے ہم لوگوں کا اسی عالم مسافرت میں چھوڑ رونا ہے۔ آپ کے جانے کے بعد تیسرے دن یکایک ایک خبر ہم لوگوں کو ملی کہ آپ کے متعلق اعلیٰ حضرت[1] خلد اللہ ملکہٗ کا کوئی فرمان اقدس شرف صدور لایا ہے، اس وقت دفاتر بند ہو چکے تھے۔ دوسرے دن شہر ہی میں معلوم ہوا کہ وہ فرمان آیا ہے۔ میں نے اور مولوی عبدالباری صاحب نے پڑھا۔ غالباً اس فرمان کی نقل آپ کو مولوی صاحب بھیجیں گے۔ میں تو اس وقت صرف جناب کو مبارکباد دینا چاہتا ہوں اور دیکھئے کہ جب ملنے کا ارادہ نہ تھا تو ملنے کا کیا عجیب سامان ہوا اور بحمد اللہ ملاقات جتنی بار ہوئی اس سے پیشتر کی کوئی ملاقات ایسی ثابت نہ ہو سکی، افسوس ہے کہ سرکار کے سامنے تمام واقعات اپنے اصلی شکل میں نہ تھے اور اس سے انہوں نے یہ خیال فرما لیا کہ تین سو روپے تو ان کو مل ہی رہے ہیں اس میں سو کلدار[2] کا اور اضافہ

---

[1] نواب میر عثمان علی خاں، حیدرآباد دکن۔ ۱۲

[2] حیدرآباد کی اصطلاح میں کلدار ہندوستانی سکّہ کو کہتے تھے اور حالی حیدرآباد کے سکّہ کو کلدار کی قیمت حالی سکّہ کے مقابلہ میں زیادہ ہوتی تھی۔

کیا جائے۔ گویا ان کے خیال میں آپ کا وظیفہ اب چار سو ہے لیکن واقعہ کے اعتبار سے یہ سو ہی روپیہ ہوا۔ کل ہم لوگ متعدد لوگوں سے اس باب میں مشورہ لینے کے لئے دوڑے خود ہوش[1] صاحب کے پاس بھی گئے۔ سب کی رائے یہی ہوئی کہ اس وقت اس سو کی منظوری کونسل سے حاصل کر لینی چاہئے اور بقیہ سو کے لئے اس وقت جد و جہد کی جائے جب بیرت کی اعانت کا مسئلہ پیش ہوگا یعنی اس کی توسیع کا۔ مینائی[2] صاحب کی تحریک مسل میں موجود ہے کہ

---

[1] سید ناظر الحسن ہوش بلگرامی ڈاکٹر سید علی بلگرامی (مصنف تمدن عرب و تمدن ہند) اور نواب عماد الملک کی تربیت میں رہے۔ انگریزی کی اعلیٰ تعلیم کے ساتھ عربی و فارسی بھی بقدر ضرورت جانتے تھے۔ مطالعہ وسیع تھا، اور علم مجلس کے ماہر، ایک زمانہ "نیّر ذخیرہ" نامی ایک رسالہ نکالتے تھے۔ ۱۳۲۳ھ میں ریاست حیدرآباد میں سیونگ بینک کے انسپکٹر ہوئے، پھر ترقی کی اور مختلف عہدوں پر رہے۔ بے قاعدہ فوج کی تنظیم کی اور ہوش یار جنگ کا خطاب ملا۔ اور معتمد سررشتہ تعمیرات ہو کر پنشن پائی۔ آپ کے مضامین کا ایک مجموعہ "عروس ادب" کے نام سے شائع ہوا۔ آخر میں ساڑھے پانچ سو صفحات پر مشتمل ایک کتاب بنام "مشاہدات" لکھ کر شائع کی جسے لوگوں نے پسند کیا نومبر ۱۹۵۵ء میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

[2] استاذ الاساتذہ حضرت امیر مینائی مرحوم کے صاحبزادے، نام اختر احمد، تخلص اختر، دربار آصفی سے اختر یار جنگ کے خطاب سے سرفراز کئے گئے۔ ناظم ([illegible]) امور مذہبی کے عہدہ سے وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے اور اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد غالباً ۱۹۴۱ء یا ۱۹۴۲ء میں انتقال کر گئے۔

سیرت کی امداد آپ کے نام شخصی طور پر منتقل کر دی جائے۔ اسی کو بنیاد بنا کر انشاء اللہ اس وقت اس مسئلہ کو چھیڑا جائے گا۔

ہوش صاحب فرماتے تھے کہ آپ سے ملنے کے بعد دو تین دن تک تقریباً زیادہ وقت آپ ہی کے ذکر و فکر میں گذرا۔ سیرت النبی جلد پنجم نظر مبارک سے نہیں گذری تھی۔ ہوش صاحب سے منگوائی گئی۔ آج کل زیر مطالعہ ہے اور دادِ تحسین مل رہی ہے۔ اور کیا عرض کروں۔ مجھے اس کا افسوس ہوا کہ آپ حضرات نے میرے اس حقیر مضمون ہی کو سہی لیکن بہر حال جس کی طرف اس کا انتساب تھا، وہ تو عالی تھا۔ آپ لوگوں نے غور سے نہیں دیکھا۔ خدا جانے اس پر بھی آپ کو کھجانے نے کچھ موقع دیا یا نہیں۔ تین دن تک ہم لوگوں کو سخت خوف ہوا کہ اب حملہ ہوا تب ہوا۔ لیکن لائف باتھ سوپ کی جو بٹی رہ گئی تھی، اس سے ایک دو دفعہ غسل کر لیا۔ اب خارشت کا پتہ نہیں چلتا۔ ورنہ دو دن تک تو یقین ہو چکا تھا کہ آخر مجھے بھی ہو گئی۔

آپ کو اس صابن سے کچھ نفع ہوا یا نہیں۔ اس صابن کی ایک اعلیٰ قسم بھی ہے۔ "ٹائلٹ لائف باتھ سوپ" اگر اس سے نفع نہ محسوس ہوا ہو تو اسی کو منگوا کر دیکھئے۔

آج کے اخباروں میں معلوماتِ عامہ کی جانب سے آپ کی اور نواب مہدی یار جنگ بہادر[1]

[1] نواب مہدی یار جنگ نواب عماد الملک مسٹر سید حسین بلگرامی کے صاحبزادے، آکسفورڈ کے ایم اے۔ ملازمت یوپی کے محکمۂ تعلیمات میں شروع کی۔ پھر حیدرآباد آ گئے۔ ترقی کرتے ہوئے وزیر تعلیم اور وائس چانسلر جامعہ عثمانیہ کے عہدے تک پہنچے۔ چند مہینوں تک اپنے آخر زمانہ میں وزیر اعظم بھی رہے۔ حضور نظام نے مہدی یار جنگ کے خطاب سے سرفراز کیا اور حکومت انگریزی کی طرف سے سر کا خطاب بھی ملا تھا۔ وظیفہ پر الگ ہونے کے تھوڑے ہی دنوں بعد ۱۹۴۶ء یا ۱۹۴۷ء میں انتقال کر گئے۔ (ظ)

کی پوری تقریر دائرۃ المعارف والی شائع ہوئی ہے۔

نیاز مند   مناظر احسن گیلانی

ہاں! اشد ضروری سلسلہ کی ایک بات رہی جاتی ہے۔ ہوش صاحب نے فرمایا تھا کہ آپ نے عند التذکرہ یہ بھی فرمایا تھا کہ فوق بلگرامی نے اپنی کسی کتاب میں آپ کے کسی مضمون کو بجنسہٖ نقل کر کے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ اس کا پتہ کس طرح چلے گا؟ منقول فیہ اور منقول عنہ دونوں کتابوں کا پتہ بصیغۂ اشد ضروری خود ہوش صاحب کو لکھ کر بھیج دیجئے اور ان کو آپ ایک خط شکریہ کا بھی لکھئے۔ سچی بات یہ ہے کہ یہ جو کچھ ہوا بظاہر حق تعالیٰ نے ہوش صاحب ہی کو اس کا ذریعہ بنایا۔

---

۱۹ ستمبر ۱۹۲۷ء۔ ۱۲ رجب ۱۳۵۶ھ چہارشنبہ

سیدی الامام   السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

گذشتہ فاجعۂ الیمہ کے موقع پر باوجود انتہائی جد و جہد کے دلیسنہ حاضر نہ ہو سکا۔ اس نے ایسا اثر مسلط کیا ہے کہ پھر ہمت نہ ہوئی کہ تحریر کی شکل میں فریضۂ تعزیت ادا کر دوں۔ صبر و استقامت کی دعا ہی پر قناعت کرتا رہا کہ ادھر مولانا عبد الباری صاحب کے نام جو گرامی نامہ شرفِ صدور لایا اس سے آپ اور آپ کی اہلیہ کے ساتھ جو حادثہ پیش آیا اور اس کے ساتھ اس عالمِ کمزوری میں اعظم گڈھ، پٹنہ، دلیسنہ، مظفر پور کی تگ و دو کا حال معلوم ہوا، عجیب بات ہے حق تعالیٰ اپنے مخلصین کے لئے تکفیر و تطہیر کا اعلیٰ نظم اسی دنیا

میں فرماتے ہیں: کہ جب دار باقی میں وہ پہنچیں تو پاک و صاف پہنچیں۔ پچھلا حادثہ اگرچہ آپ
کے لئے جانگداز اندوہ ہوگا لیکن آپ کے گھر کے لئے بہر حال ماں کا واقعہ ہے۔ آپ کا اپنی لڑکی
سے جدا ہونا اور ان کا اپنی ماں سے جدا ہونا، کیفیت کے لحاظ سے دونوں کا پلّہ برابر ہے۔
لیکن جوانمرگی کی تلافی کس واقعہ سے ہو سکتی ہے۔ میں نے مرحومہ کے انتقال کی خبر گیلانی میں
یکایک سنی۔ آپ کے ساتھ دو دفعہ پٹنہ حاضر ہوا۔ بیماری کی کوئی خبر نہ تھی کہ یکایک یہ خبر
ملی، بعد کو معلوم ہوا کہ شاید وہ کچھ دنوں سے بیمار تھیں۔ بہر حال اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے
گھر کے لوگوں کو صبر جمیل اور اجر جزیل سے سرفراز فرمائے۔

مولانا عبد الباری صاحب ہی کے خط سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خاکسار کی "ژولیدہ
نوائی" نے سامعۂ ہمایونی تک پہنچنے کی بھی سعادت حاصل کی، کئی دفعہ میرا خود ارادہ ہوا
تھا کہ خدمتِ والا میں کسی خط کے ساتھ اس کو بھیجوں، لیکن گذشتہ ندامت ہمیشہ دامن کش
ہو جاتی تھی۔ اس خط میں شبلی[1] کا ایک پھول بھی تھا جو دیوانے نے منصور[2] کے سر پہ مارا گیا ہے۔

---

[1] ابوبکر دُلف بن جحدر شبلی، شبلہ ماوراء النہر میں سمرقند کے قریب ایک شہر اسروشنہ کے مضافات
میں ایک گاؤں تھا۔ آپ کا خاندان اصل میں اسی گاؤں شبلہ کا رہنے والا تھا۔ آپ کے اجداد میں سے
کوئی بغداد تشریف لائے۔ آپ ۲۴۷ھ میں پیدا ہوئے، تعلیم سے فراغت کے بعد نہاوند کے
والی بنائے گئے۔ پھر اچانک رخ بدلا، اور خیر النساج کی وساطت سے حضرت جنید بغدادی تک
پہنچے اور وہیں کے ہو رہے۔ مرشد نے بڑی ریاضتیں کرائیں۔ اور آخر میں حکم دیا کہ تم نے نہاوند
کی رعایا پر حکومت کی ہے، بہتوں کے حقوق تمہارے سر باقی ہوں گے جب تک (باقی اگلے صفحہ پر)

(بقیہ صفحہ ۱۸۸) وہ دھبے دامن سے نہ چھوٹیں تم دربارِ معرفت میں باریاب نہیں ہو سکتے۔ لہذا جاؤ
اور وہاں کی رعایا سے سندِ معافی حاصل کر دو۔ آپ نہاوند گئے اور سارے شہر میں ایک ایک کے
دروازے پر جا کر مرد و عورت، بوڑھے بچوں سے عفو کی درخواست کی۔ اور کوئی نہیں رہا جس سے
اپنا کہا سنا معاف نہ کرایا ہو۔ سوائے ایک شخص کے جو موجود نہ تھا اس کا ایک درہم ان کے ذمہ باقی
تھا۔ پوری عمر خیرات کرتے رہے اور مرتے دم تک سکون نہیں ہوا۔ تو فرمایا کہ "اس ایک درہم کے
بدلے ہزاروں درہم خیرات کر چکا ہوں مگر دل پر سے اس کا بار نہیں ہٹتا۔"

آپ خود صاحب حلقہ بزرگ تھے۔ اور تعلیم میں آپ کے یہاں شدت تھی۔ آپ کے
مستفیضین میں محمد بن محمد بن عبد الوہاب، ابو عمران، ابوبکر رازی، حسین ابن منصور حلاج، شیخ
ابوزرعہ رازی، حسین بن احمد صفار مشہور ہیں۔ ۲۸ ذی الحجہ ۳۳۴ھ میں وفات پائی اور
بغداد کے مقبرہ خیزران میں دفن ہوئے۔ رحمۃ اللہ علیہ ۱۲

[2] حسین ابن منصور حلاج جو اپنے نعرہ انا الحق کے باعث کافی شہرت رکھتے ہیں۔ ۲۴۴ھ میں
پیدا ہوئے، عمر کا ابتدائی زمانہ شہر واسط میں گذرا۔ اس کے بعد حضرت حلاج کو دو بزرگوں کی صحبت
عرصے تک حاصل رہی۔ ایک حضرت سہل بن عبد اللہ التستری دوسرے بصرہ میں عمرو مکی، پھر
جنید بغدادی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حلقہ تلمذ میں شریک ہو گئے۔ سیاحت کا بڑا شوق تھا۔ عمر کا بڑا حصہ
اسی میں گذرا۔ اسی زمانہ میں ان کی زبان پر نعرہ انا الحق جاری ہوا۔ اور بعض ایسے عقائد کا بھی انہوں نے
اظہار کیا جو بظاہر شریعت محمدیہ کے خلاف تھے۔ انھیں وجوہ سے شیخ ابن داؤد الاصفہانی الظاہری
کے فتویٰ کی بنیاد پر ۲۹۷ھ میں پہلی مرتبہ گرفتار ہوئے اور ٹھیک ایک سال کے (باقی اگلے صفحہ پر)

یہ ایک عاجلانہ مضمون تھا جس نے کتاب کی شکل اختیار کر لی۔ کچھ تو طباعت کی ناقابلِ عفو غلطیاں پھر بھی رہ گئی ہیں۔ نیز قصداً بھی اس رسالہ کو اس لئے تیار کیا گیا تھا کہ جس طرح عیسائی ... اسٹیشنوں پر انجیل و زبور کے ترجمے فروخت کرتے ہیں۔ ریل کے مسافروں کے لئے ایک "اسلامی مشغلہ" اس کے مقابلہ میں تیار کیا جائے یا سی لئے عمداً اس کی زبان کچھ انجیلی سی ہو گئی ہے۔ واقعات میں بجائے بین ترتیب کے ایسی ترتیب رکھی گئی ہے کہ ربطِ فقرات میں کچھ وقت صرف ہو اب میں خود جب پڑھتا ہوں تو اس متن کے لئے شرح کی ضرورت محسوس ہوتی ہے بھلا اس صورت میں آپ نے اس کو غور سے استیعاباً کیا پڑھا ہو گا لیکن میری تمنا تھی کہ ایک آدھ نظر اس حیثیت سے اس پر ضرور ڈالی جائے کہ واقعات میں علت و معلول کی جو ترتیب قائم کی گئی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۹) بعد جیل خانے سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ دوسری مرتبہ ۳۰۱ھ میں گرفتار ہوئے اور مسلسل آٹھ سال تک محبوس رہے لیکن ان کا نعرہ انا الحق بند نہ ہوا۔ ۳۰۹ھ میں ان کے متعلق آخری فیصلہ ہوا۔ اور وہ یہ کہ انھیں کوڑے مارے گئے۔ ہاتھ اور پیر کاٹ دیئے گئے اور ان کا سر تن سے جدا کر دیا گیا۔

علماء و صوفیا میں ایک جماعت حضرت حلاج کے متعلق اچھی رائے نہیں رکھتی۔ لیکن دوسری جماعت جس میں حضرت سید جلال الدین رومی اور حضرت فریدالدین عطار رحمہا اللہ شریک ہیں حضرت حلاج کو کاملین میں شمار کرتی ہے۔ اور ان کے اقوال کی ایسی تاویل کرتی ہے جس سے کفر لازم نہیں آتا۔ حضرت حلاج نے تصوف پر اپنے نظریات کے ماتحت متعدد کتابیں لکھی ہیں جن کی تعداد ابن ندیم نے اپنی فہرست میں ۴۶ گنائی ہیں۔

۱۔ مولانا علیہ الرحمہ کی مشہور تالیف "النبی الخاتم" ۱۲

ہے کہاں تک درست ہے۔ دفعِ دخلِ مقدر کے سلسلے بھی آپ کی نظر کے محتاج تھے۔ غزوات[1] و سرایا، ازواجِ مطہرات، مدنی زندگی کی سیاست، تحویلِ قبلہ وغیرہ کے اسرار، میں چاہتا تھا کہ کوئی جاننے والا ان کو پڑھتا اور ہوتا کوئی خدا کا بندہ جو مجھے نیک مشورہ دیتا۔ اور کیا عرض کروں جی رہا ہوں، جب تک ان حالات میں جینا ہے۔ "ہندوستانی[2]" کے لفظ نے مبارک ہو کہ حسنِ قبول کا تمغہ حاصل کیا۔ جزاک اللہ۔ حیدرآباد کا قصد کب تک ہے۔ مناسب تو یہی ہے کہ جلد ششم[4] کے ساتھ تشریف فرمائی ہو۔ اور سنئے! آپ کے قدیم دوست مفتی عبدالقدیر البدایونی نے آپ کی کتاب الجنایات[3] کو مستند ٹھہرایا ہے۔ تفصیل پھر کبھی۔

مناظر احسن گیلانی

۱۔ جس جہاد میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہ نفسِ نفیس شرکت فرمائی ہو اسے "غزوہ" اور جو صرف آپ کے زمانہ میں ہوا ہو اسے "سریہ" کہتے ہیں۔

۲۔ زبان کے لئے اردو اور ہندی کے الفاظ کو چھوڑ کر "ہندوستانی" کا لفظ حضرت سید صاحب رح نے وضع کیا جسے گاندھی جی نے قبول کر لیا تھا۔

۳۔ ۱۹۳۲ء میں حکومت حیدرآباد نے دارالمصنفین کو فقہ حنفی کی رو سے ایک ضابطہ جنایات کی ترتیب و تدوین کی خدمت سپرد کی تھی۔ چنانچہ دولت عثمانیہ کے مجلۃ الاحکام کی طرح یہ قانون جنایات بھی دفعہ وار مرتب کیا گیا اور اس کا مسودہ سید صاحب رح نے حکومت حیدرآباد کو پیش کیا۔ (معارف سلیمان نمبر ص ۲۲)

۴۔ سیرۃ النبی جلد ششم۔

سیدی و رشید المسلمین! متعنا اللہ لطول بقائکم   السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

میرا کارڈ، اس سے پہلے کارڈ کا مطلب مل چکا ہوگا!

ایک خاص بات آپ سے عرض کرنی ہے۔ موجودہ حالت جو اسلام کی ہو رہی ہے، مجھ سے زیادہ آپ کو اس کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے، مشکلات کے حل کی مختلف راہیں لوگ پیش کر رہے ہیں۔ آپ نے پاکستان کی ایک پہلی تحریک ڈاکٹر عبد اللطیف[1] کی دیکھی ہوگی۔ ان ہی سے معلوم ہوا

---

[1] کڑپہ، ضلع کرنول، علاقہ آندھرا کے رہنے والے ہیں اور انگریزی کے بہترین انشا پرداز شمار کئے جاتے ہیں۔ شروع میں کلکتہ کے کسی انگریزی اخبار سے منسلک تھے۔ ان کی غیر معمولی قابلیت سے متاثر ہو کر سر اکبر حیدری نے انھیں جامعہ عثمانیہ حیدر آباد میں استاد انگریزی کی حیثیت سے بحال کر لیا۔ جامعہ کی ملازمت ہی کے زمانہ میں انگلستان جاکر زبان و ادب میں پی، ایچ، ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ۳۵ء میں جامعہ کی ملازمت سے استعفا دے دیا۔ جامعہ عثمانیہ کی ملازمت کے سلسلہ میں مولانا گیلانیؒ اور ڈاکٹر صاحب برسوں رفیق کار رہے۔ چند سال پیشتر (Indo middle east Society) کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا ہے جس کا مقصد ہندوستان اور شرق اوسط کے ممالک کے باشندوں کو ایک دوسرے سے زیادہ سے زیادہ روشناس کرانا اور قریب لانا ہے۔ ۳۶ء سے ۴۶ء تک ڈاکٹر صاحب نے انگریزی زبان میں چند اچھے مضامین ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی و ثقافتی مسائل پر لکھے۔ جن کی وجہ سے سارے ہندوستان میں ان کی شہرت ہو گئی۔ انھیں مضامین میں سے ایک مضمون مسلمانان ہند کے لئے کلچرل زون (Cultural Zone) کی اسکیم پر تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی اسی اسکیم کو بعض لوگ اسکیم پاکستان سمجھتے ہیں۔ غالباً ڈاکٹر صاحب موصوف مولانا آزادؒ کی تفسیر ترجمان القرآن کا ترجمہ انگریزی میں کر رہے ہیں۔

کہ یوپی کے لوگ اس سے راضی ہیں، خصوصاً اسماعیل خاں[1] کو اپنے بڑے حامیوں میں بتاتے ہیں، بہر حال جہاں تک میں دیکھتا ہوں، جن جن لوگوں کے اوطان پر ضرب نہیں پڑتی، اسے پسند کرتے ہیں۔ ڈاکٹر لطیف کا گھر بھی علاقہ مدراس کے ضلع کڑپہ میں ہے، مدراس سے اس کی دھجی کو پھاڑ کر انھوں نے حیدر آباد میں شریک کیا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ سب مالی خولیا قسم کے ہی۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس سلسلہ میں کوئی اور مالی خولیا کیوں نہ پیش کر دیا جائے۔ پاکستان کی تحریک اور اس سے بھی زیادہ کڑپہ تحریک میں مسلمانوں کو صرف ایک لازمی قوم کی حیثیت سے تسلیم کر کے ان کی بقا کی مدافعتی کوشش جو ممکن ہو سکتی ہے پیش کی گئی ہے۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ جن علاقوں میں اسلام داخل ہو چکا صدیوں وہاں حق کی پرستش ہو چکی، اسلام وہاں چمک چکا، مسجدوں سے وہ ملک بھر چکا۔ اب پھر اس کو خود اپنے اختیار سے کفر خالص کا علاقہ بنا دیا جائے۔ حالانکہ اسلام لازمی مذہب نہیں متعدی مذہب ہے۔ مسلمانوں کا کام نکص علی العقب نہیں، بلکہ اقدام ہے۔ آج نہیں تو کل جن ملکوں میں اسلام کی روشنی مکمل ہو سکتی ہے

---

[1] نواب اسماعیل خان صاحب۔ جہانگیر آباد ضلع بلند شہر میں پیدا ہوئے۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے پوتے تھے۔ علی گڈھ میں تعلیم حاصل کی اور پھر بیرسٹر ہوئے۔ شرافت، وضعداری اور ادبی ذوق ورثہ میں ملا تھا۔ تحریک خلافت کے زمانہ میں سیاسی پلیٹ فارم پر آئے۔ مسلم لیگ کے صف اول کے رہنما بنے۔ مشہور بات ہے اور مولانا آزاد نے بھی لکھا ہے کہ اگر نواب اسماعیل خاں اور چودھری خلیق الزماں کو یوپی کی وزارت میں لے لیا جاتا تو مسلم لیگ کو اتنا فروغ نہ ہوتا۔

مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے خازن اور وائس چانسلر رہے۔ عرصہ دراز سے میرٹھ میں مقیم تھے اور وہیں آسودۂ خواب ہوئے۔ ۱۲

ان امکانات کو کم کرنا کہاں کی دانشمندی ہو سکتی ہے۔ بہرحال ان امور کو مجھ سے زیادہ آپ سمجھ سکتے ہیں۔ میرے سامنے اس وقت دو خیالات ہیں۔

(۱) ایک تو یہ کہ اگر واقعی مسلمانوں کو ایک سمت کی جانب سمٹ کر رہنا ناگزیر ہے تو پھر یہ صورت کیوں نہ اختیار کی جائے کہ ہر صوبہ کے چند اضلاع کو مسلمانوں کے تناسب آبادی کے لحاظ سے ان کے لئے مخصوص کر دیا جائے۔ فرض کیجئے کہ ہمارا بہار ہے، کہتے ہیں کہ وہاں کی کل آبادی چار کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ مسلمانوں کی تعداد اس صوبہ میں چالیس پچاس لاکھ کے قریب قریب بتائی جاتی ہے۔ اگر اس تعداد کو چند اضلاع میں تبادلۂ قومی کے ذریعہ سمیٹ لیا جائے جو بہار میں اسلامی ثقافت و تہذیب کے مرکز ہیں، تو مسلمانوں کا نازک مقام قوی بھی ہو جاتا ہے اور ہر صوبہ میں اسلام کی روشنی باقی بھی رہ سکتی ہے۔ آئندہ اس کے اقدام اور توسیع کے امکانات بھی باقی رہتے ہیں۔ اور اس طرح تمام اقلیت کے صوبوں کو ہر صوبہ میں چند مخصوص اضلاع میں سمیٹ لیا جائے۔ پھر جس طرح بوسنیا، ہرزی گوینا وغیرہ میں مسلمانوں کا ایک محاذاتی نظام حکومت ہے یہی طرز عمل یہاں بھی اختیار کیا جائے۔ اسی کے ساتھ اسلامی فیڈریشن کو بھی مشرکانہ فیڈریشن سے جدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ تاکہ مرکزی حیثیت سے ہماری اکثریت کے علاقے بٹنے سے محفوظ رہ جائیں یا در اقلیت والے صوبوں میں ہم ایک جگہ سمٹ کر آباد ہو جائیں۔ میری غرض یہ ہے کہ جب ہر ایک اپنے اپنے اغراض کے تحت تجویز پیش کر رہے ہیں۔ ہم بہار کے مسلمان بھی اس تجویز کو کیوں نہ پیش کریں۔ باقی ہونے والا جو کچھ ہے وہ ہو کر رہے گا۔ آپ کے پاس اولاً تو خود ایک آرگن ہے۔ ثانیاً آپ آزاد ہیں۔ ثالثاً آپ کی آواز ملک میں آواز کی حیثیت

رکھتی ہے۔ مسلمان اور بہاری ہونے کے لحاظ سے اگر اس کام کو اپنے ذمہ لیجئے تو اسلام کی بھی خدمت ہوگی اور جس زمین نے آپ کو پالا ہے اس کے باشندوں کے ساتھ بھی احسان ہوگا۔

(۲) دوسری بات وہی ہے جس کا زبانی تذکرہ کیا تھا۔ یعنی اُردو ہندی کے جھگڑے سے الگ ہو کر مسلمان جو تعلیم پاتا ہو، اس کے لئے اتنی عربی لازم کرا دیجئے کہ قرآن مجید کا ترجمہ براہِ راست کرنے پر قادر ہو جائے۔ عنوان اس کا "قرآن کی تعلیم" ہی رکھا جائے۔ ہماری بھی مذہبی تعلیم یہی ہے۔ اور اسی میں ہماری زبان، تمدن، تہذیب سب کی حفاظت ہے۔ میٹرک تک یا وردھا اسکیم کی اختتامی تعلیم تک اتنی عربی پڑھا دینی کچھ مشکل نہیں ہے۔ خصوصاً جب صرف قرآنی عربی تک ہماری جد و جہد محدود رہے۔ اگر فارسی مٹ بھی جائے، لیکن اس کی جگہ ہر مسلمان کے لئے عربی رسم الخط کا پڑھنا اور قرآن عربی کا جاننا ضروری ہے تو میرا سب کچھ محفوظ ہو جاتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ چلتے چلاتے اسلام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین و امت کی آپ اتنی خدمت ضرور کیجئے۔ اب ہم لوگوں کا آخری وقت ہے۔ میں تو یونہی خالی دامان چلا۔ حیدرآباد کے روپے پر سب کچھ نثار کر دیا۔ اور وہ روپیہ بھی نہ رہا۔ زندگی کے قیمتی اوقات ان ہی مزخرفات میں بسر ہوئے لیکن بحمد اللہ حق تعالیٰ نے آپ سے کام لیا اور بہت کچھ لیا۔ یہ دو کام اور کر جائیے تو بڑا کام ہو جاتا۔ فقط

مناظر احسن

کلیہ جامعہ عثمانیہ، دکن

۲۸ جنوری ۱۹۳۹ء - ۶ ذی الحجہ ۱۳۵۷ھ، شنبہ

سیدی و سید المسلمین! دمتم بالبشارۃ والعافیۃ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مکتوب گرامی کے جواب میں رسید کا کارڈ مل گیا ہوگا۔ میں تفصیلی جواب دینا ہی چاہ رہا تھا کہ ایک اور ضرورت بھی پیش آگئی اور واقعہ یہ ہے کہ ہوش صاحب ان دنوں کچھ بیمار ہیں۔ ایک دن ان کی عیادت کے لئے گیا ہوا تھا معلوم ہوا کہ آرام فرما رہے ہیں۔ واپس چلا آیا۔ بعد کو ان کا ایک ضروری مکتوب ملا کہ "مجھ سے تم اور مولینا عبدالباری صاحب فوراً ملیں" رات گیا تھا بیچارے اب تک فریش ہیں۔ الوانِ نعم کا کھانے والا صرف خشک توس کے دو ٹکڑے کھاوا ایک سفید سا پانی جس کی تشبیہ انہوں نے خود "بول حمار" سے دی۔ ان کے سامنے رکھا ہوا تھا۔ بُرا بھلا کہتے جاتے تھے اور لقمہ حلق میں اتار رہے تھے۔ بہرحال ملنے کے بعد فرمایا کہ ضرورت یہ پیش آگئی ہے کہ مولینا نے اعلیٰ حضرت کے مضمون کے متعلق میری فرمائش سے جو کچھ لکھ کر بھیجا ہے، بہت اچھا تھا۔ لیکن ناواقفیت کی وجہ سے آخر میں انہوں نے کج کلاہ ایران کا بھی ذکر اس شخص کے سامنے کر دیا جو اپنے سوا کسی سر پر کلاہ دیکھنا نہیں چاہتا۔ انہوں نے وہ خط مجھے واپس کر دیا ہے کہ آپ تک پہونچادوں اور اسی خط کو دوبارہ بحذف حصۂ آخری ان کے نام بعجلت ممکنہ روانہ فرمائیے اسی کے ساتھ انہوں نے ایک دوسرا مضمون بھی اظہار رائے کی غرض سے دیا ہے، اس کا تراشہ بھی اسی لفافہ میں بند ہے اس کے متعلق ایک الگ رائے قلم بند فرما کر ہوش ہی صاحب کے نام روانہ فرما دیجئے۔ آئندہ انہوں نے فرمایا ہے کہ مولینا کو لکھ دو کہ کسی زندہ و مردہ حکمران کا ذکر تشبیہاً و نظیراً بھی اپنے گرامی ناموں میں نہ فرمائیں۔ وہی بیچارہ جس کا ذکر آپ نے اس خط میں

فرمایا ہے۔ اس کا نام "سپاہی زادہ لدمی ٹھورنے والا، اجڈ جاہل" ہے۔ شاہوں کے دربار میں ان عجائبات کا تماشا ناگزیر ہے۔ حسب منشا ہوش صاحب خود ہی آپ کی خدمت میں خود ہی ان چیزوں کو بھیجنے والے تھے لیکن علالت کی وجہ سے نہ بھیج سکے۔ اور دیر ہو رہی ہے۔ ضرورت جلد جواب پہونچانے کی ہے کیونکہ آپ کی رائے کے متعلق بندگان عالی دریافت فرماتے رہتے ہیں

مولینا مسعود علی المحاج کی واپسی سالماً غانماً الحمدللہ ہوگئی۔ حق تعالیٰ کے انعامات جوان کے حال پر ہوئے شکر مسرت ہی ہوئی اور تھوڑا سا رشک بھی ہوا۔ برنی صاحب نے اس قسم کے حضرات کا نام "شکر یون" رکھا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ تبریک و تہنیت کے لئے اعظم گڈھ اترتے ہوئے وطن جاؤں لیکن گھر سے خطوط ایسے "دِق" آ رہے ہیں، کہ بچے اور خود مکارم ملا کی طبیعت خراب ہے۔ خدا کرے کہ یہ لوگ اچھے ہو چکے ہوں۔ ورنہ پھر بعجلت ممکنہ مجھے گیلانی جانا پڑے گا۔ مولینا المحاج کو سلام فرما دیجئے۔ حسب الحکم "جمعیۃ التمدن الاسلامی" کے کاغذات پر دستخط وغیرہ کر کے واپس کر دیا ہے۔

اور کیا عرض کروں، حیدرآباد اپنے آخری "اذرک" عہد سے گذر رہا ہے، نہ کوئی دماغ ہے اور نہ کوئی دل۔ جو اس وقت اسکے جہاز کو منجدھار سے پار لگالے۔ حیدری[1] صاحب ایک

---

[1] سر اکبر حیدری نومبر ١٨٦٩ء میں پیدا ہوئے۔ بمبئی میں بی۔ اے تک تعلیم پائی۔ ١٨٨٦ء سے ١٩٠٤ء تک حکومت ہند کے محکمہ مال میں مختلف منصبوں پر کام کرتے رہے ١٩٠٥ء میں انہیں حکومت حیدرآباد نے بلالیا۔ یہاں بھی ابتداءً محکمۂ مالیات ہی کے مختلف عہدوں پر (باقی اگلے صفحہ پر)

تنہا جاندار آدمی ہیں لیکن وہ بھی دل سے محروم ہیں۔ اور اس وقت دماغ سے زیادہ دل کی ضرورت ہے۔ اب مسلمانوں کی اس آخری پارۂ نان کا خدا ہی حافظ ہے۔ اخبارات وہ سب کچھ آپ کو سناتے ہی رہتے ہوں گے جو ہم دیکھتے رہتے ہیں۔ فاللّٰہ خیر حافظا وھو ارحم الراحمین۔

مولینا عبدالباری ندوی اگرچہ اب مجھ سے الگ ایک مسجد کی حجرہ میں رہتے ہیں لیکن بحمداللہ جوار کا شرف اب بھی حاصل ہے۔ کالج کی آمد و رفت ساتھ ہوتی ہے۔ سلام فرماتے ہیں۔

نیازمند مناظر احسن گیلانی حیدرآباد دکن

۱۴ مارچ ۱۹۳۹ء - ۲۱ محرم ۱۳۵۶ھ - چہار شنبہ

---

۲ اکتوبر ۱۹۳۹ء مطابق ۱۹ شعبان ۱۳۵۸ھ

سیدی و سید الہند! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

لیجئے جناب "اما عن افقس تقضی ما علیہ" حق تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ ایفائے عہد کی توفیق اس نے آسان کی۔ مضمون بھیج رہا ہوں۔ میں نے اپنا کام کر دیا۔ اب آپ کو پسند

(بقیہ صفحہ گذشتہ) رہے۔ ۱۹۱۵ء میں مجلس تعلیمی حیدرآباد کی اور ۱۹۱۷ء میں کل ہند محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کلکتہ کی صدارت کی۔ حیدرآباد میں عثمانیہ یونیورسٹی اور محکمۂ آثار قدیمہ کو منظم کیا اور ۱۹۲۱ء میں ریاست حیدرآباد کے محکمۂ مالیات اور ریلوے کے وزیر مقرر ہوئے اور پھر ۱۹۳۰ء میں وزیر اعظم۔

آئے یا نہ آئے۔ اس کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ اتنی محنت زندگی میں کسی مضمون کے لکھنے میں مجھے اٹھانی نہ پڑی۔

آپ کو کیا معلوم کہ حیدرآباد میں کن لایعنی مشاغل میں زندگی بسر ہوئی ہے۔ کہاں دارالمصنفین کی یکسوئی تھی، اور کہاں دکن کی لایعنیاں۔ خیر جو کچھ ہو سکا وہ یہی تھا۔ خدا کرے کہ آپ اس کو پسند فرمالیں تو میری محنت ٹھکانے لگی۔ اس سے زیادہ کچھ مطلوب نہیں۔ مبیضہ کسی کاتب سے چاہا کہ تیار کرا کے بھیجوں لیکن اس نے ۱۵ دن کی مدت چاہی۔ آپ کے انتظار کی تکلیف کا خیال کر کے اسی کٹے پھٹے حال میں بھیج دیتا ہوں۔ دارالمصنفین[۱] کے کاتب ماشاءاللہ ان سے زیادہ "جنیات" پڑھتے ہوں گے۔

---

[۱] مولینا شبلی نعمانی مرحوم ۱۹۱۰ء ہی سے ایک ایسے ادارے کے قیام کی فکر میں تھے۔ جہاں ایک عمدہ قسم کا کتب خانہ ہو اور باصلاحیت طلبا و علماء کو رکھ کر تصنیف و تالیف کی تربیت دی جا سکے۔ اور ادارے سے براہ راست ایسے مضامین اور کتابوں کی اشاعت ہو جو موجودہ دور میں مذہب اسلام کے لئے مفید اور مسلمانوں کے لئے ضروری ہیں۔ مولینا شبلی کی خواہش تھی کہ یہ ادارہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں قائم کیا جائے لیکن انھیں اس کا موقع نہ مل سکا۔ قدرت نے اس کے لئے اعظم گڑھ کی سرزمین کو منتخب رکھا تھا چنانچہ ۱۹۱۴ء میں دارالمصنفین اعظم گڑھ میں قائم کیا گیا۔ اس وقت سے آج تک اس کے ناظم مولینا مسعود علی ندوی ہیں۔ اب تک نوے کے قریب اہم اور قیمتی کتابیں دارالمصنفین سے شائع ہو چکی ہیں۔

پٹنہ کا یہ الستارز پریشکر پھر غلط ہو گیا۔ میاں نجم الہدیٰ[1] نے پہلے تار رہنے کا دیا پھر ۳ اکتوبر کو طبی کا التوا نامہ آپ کے حوالے کیا لیکن اسی دن شام کو پوسٹ پونڈ[2] کا تار بھی مل گیا۔ "الیاس احدی الراحتین" کے لطف سے لذت اندوز ہوا۔ مضمون کو پڑھنے کے بعد ضرور مطلع فرمائیے، کہ مجھے سب سے زیادہ اسی کا انتظار رہے گا۔ طویل تو ہو گیا ہے لیکن اس میں میرے قصد کو دخل ہے۔ ورنہ "النبی الخاتم"[3] صلی اللہ علیہ وسلم کا مصنف

---

[1] مولوی نجم الہدیٰ صاحب علامہ گیلانی کے چچیرے چچا مولوی عمیر الحسن صاحب کے صاحبزادے ہیں۔ گیلانی میں پیدا ہوئے۔ پٹنہ میں تعلیم پائی۔ میٹرک سے بی اے تک کالج سے انعامی وظیفے لیتے رہے۔ فراغت کے بعد ریاست حیدرآباد میں لائبریرین اور جامعہ عثمانیہ میں تاریخ کے لکچرر مقرر ہوئے اسی زمانہ میں وکالت کا امتحان پاس کر لیا۔ اور چند برسوں کے بعد حیدرآباد چھوڑ کر پٹنہ آ گئے اور وکالت شروع کر دی۔ اسی زمانہ میں مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے تنخواہ دار سکریٹری ہوئے۔ اور چند ماہ بعد پٹنہ کالج میں اردو کے استاد ہو کر لے گئے اور ٹکسٹ بک کمیٹی کے ممبر نامزد ہوئے۔ کانگریسی وزارت کے زمانہ میں ہندوستانی زبان کی کمیٹی کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ شعر و سخن کا بھی ذوق رکھتے ہیں۔ نجم تخلص فرماتے ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلے گئے اور وہاں کچھ تجارتی کاموں میں مشغول ہیں۔ [2] Post poned. [3] حضرت گیلانی کی بہت ہی مختصر مگر بے حد قیمتی تصنیف سیرت کے موضوع پر اچھوتے اور نادر طرز تحریر کی حامل۔ دسیوں ضخیم کتابوں کا خلاصہ اور مصنف کے ایجاز کا نمونہ۔ ۱۷۱ صفحات کی مختصر سی کتاب میں سیرت نبوی کا عطر کشید کر لیا گیا ہے۔ زبان اور طرز بیان سے معلوم ہوتا ہے جیسے قدیم صحیفے پڑھے جا رہے ہوں۔ ۱۲

اختصار پر بھی قادر ہے۔ بحمد اللہ! لیکن پیچ کی راہ سے محروم۔ کتاب میں بعض غلطیاں تھیں، جن میں غلط نامہ نے بعض کی تصحیح کر دی۔ ایک جگہ "خذف"[1] کے ساتھ "غلیل" کی حرمت کا جو دعوے آپ نے کیا ہے سمجھ میں نہیں آیا! النصح[2] کا ترجمہ اخلاص سے فرمایا گیا ہے۔ لیکن میرے اساتذہ ہمیشہ "بہی خواہی" و "خیر اندیشی" اس کا ترجمہ مجھے بتاتے رہے ہیں کہ لغوی معنی سے زیادہ مطابق ہے "النصح للہ ولرسولہ وللمومنین" کا مطلب زیادہ دلچسپ تھا۔ میں نے ان باتوں سے

---

[1] خذف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خط میں یہ لفظ صحیح پڑھا نہ جا سکا اور اسی لئے حضرت گیلانی علیہ الرحمہ نے اس پر استعجاب کا اظہار فرمایا۔ یہ لفظ "خذف" نہیں بلکہ "خزق" ہے۔ ایک حدیث عدی بن حاتم سے مروی ہے۔ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تیر کا پھل شکار کو مجروح کرے تو اس شکار کو کھا لو اور جو شکار پھل سے نہیں بلکہ اس کے عرض سے مرے نہ کھاؤ۔ وہ ایسا ہی ہے کہ جیسے لاٹھی یا پتھر کی ضرب سے کوئی مرا ہو۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔
عن عدی بن حاتم قال قلت یا رسول اللہ انا نرسل الکلاب المعلمۃ قال کل ما امسکن علیک قلت وان قتلن قال وان قتلن قلت انا نرمی بالمعراض قال کل ما خزق وما اصاب بعرضہ فقتل فانہ وقیذ فلا تاکل متفق علیہ۔ (مشکوٰۃ کتاب الصید والذبائح)

[2] النصح کے لغوی معنی اخلاص اور اکثر اسی لئے خلوص اور نصحت کی تعبیر بہی خواہی اور خیر اندیشی کے ساتھ درست ہے ان دونوں میں کوئی تعارض نہیں۔ لسان العرب میں ہے۔ النصح نقیض الغش مشتق منہ ولہ، وھو باللام افصح قال اللہ تعالی وانصح لکم۔ ویقال نصحت لہ نصیحتی نصوحا اے اخلصت وصدقت والاسم النصیحۃ۔ قال ابن الاثیر النصیحۃ کلمۃ یعبر بہا عن جملۃ ھی ارادۃ الخیر للمنصوح لہ (خیر خواہی) واصل النصح الخلوص وھکذا فی مجمع البحار۔

تعرض نہیں کیا۔ حسن و قبح کی بحث میں فٹ نوٹ میں معتزلہ کے نقطۂ نظر کی طرف ہلکا سا اشارہ ہے اور یہ سچ عرض کرتا ہوں کہ یہی دو باتیں ایسی ہیں جن پر دل میں کھٹکا پیدا ہوا ورنہ ان کے سوا میں نے جو کچھ لکھا ہے سخن سازی نہیں بلکہ حقیقت طرازی ہے۔ جو دل میں تھا قلم پر آیا ہے اور کوئی نئی بات نہیں۔ مولوی عبدالباری دل شکستہ تو پہلے ہی تھے دست شکستہ ہو کر اور ....

.... فقط

مضمون کو قصداً چند حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ بالکل ناپسند ہو، تو صرف پہلا حصہ، کچھ پسند ہو تو صرف بعضہ اور کل پسند ہو تو کل، ناپسندیدہ حصہ کو واپس فرما دیجئے گا۔ آخر محنت صرف ہوئی ہے۔

مناظر احسن گیلانی
حیدرآباد دکن

---

۱۰ رمضان المبارک ۱۳۵۸ھ - ۲۷ اکتوبر ۱۹۳۹ء

سیدی و سید المسلمین! حیاکم اللہ و ابقاکم   السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

مضمون کے روانہ کرنے کے بعد انتظار جواب کے یہ دن مجھ پر سخت گذرے۔ دل دھڑک رہا تھا کہ خدا جانے آپ پسند بھی فرماتے ہیں یا نہیں۔ زیادہ تر اپنی اسی دیدہ تنگی سے اندیشہ تھا جس کی مہذب تعبیر آپ حضرات وجد و رقص سے فرمایا کرتے ہیں، مشاغل مکروہہ کی کثرت میں اتنا بھی جو بن پڑا وہ محض خدا کا فضل تھا۔ جواب میں جوں جوں تاخیر ہوتی جاتی تھی، گمان، ظن، بلکہ سوءِ ظن کی

شکل اختیار کرتا چلا جاتا تھا کہ پرسوں گرامی نامہ نے بحمداللہ اضطراب کو سکون سے بدل دیا۔ اب اس کی پروا نہیں ہے کہ دنیا پسند کرے گی یا نہیں۔ آپ حضرات کی توثیق میرے لئے کافی ہے۔ مجھے اس کا بھی ڈر تھا کہ شاید آپ کے ما فی الضمیر کے سمجھنے میں تو مجھ سے کوتاہی نہیں ہوتی ہے۔ جہاں تک گرامی نامہ سے میں سمجھا ہوں شاید ایسا نہیں ہوا ہے۔ ایک اور بات کا بھی کھٹکا تھا یعنی جھونک میں کوئی ایسی صورت تو نکل نہیں آئی کہ بجائے واقعی تعریف کے اطرار اور غلو کا میں مرتکب ہو گیا ہوں۔ سچ عرض کرتا ہوں کہ قلم کو میں نے سنبھال سنبھال کر چلایا ہے۔ جو کچھ لکھا ہے وہ میرے دل کے واقعی جذبات ہیں۔ ریائی گفتگو نہیں ہے۔ بہرحال اب جو کچھ بن پڑا وہ پیش کر دیا۔ آپ کے حقوق مجھ پر بہت زیادہ ہیں۔ بقول آپ ہی کے کہ "الندوہ"[۱] کی راہ سے اپنی طالب علمی کے زمانہ میں بہت کچھ شعوری و غیر شعوری طور پر استفادہ کرتا رہا ہوں اور میں اپنے لئے اس میں فخر محسوس کرتا ہوں کہ آپ مجھے اپنے معتقدین

۱؎ ماہنامہ الندوہ اگست ۱۹۰۴ء میں جاری ہوا جس کے ایڈیٹر مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی اور مولانا شبلی رحمہما اللہ تھے۔ رسالہ کا مقصد علوم اسلامیہ کا احیاء، تطبیق معقول و منقول اور علوم قدیمہ و جدیدہ کا موازنہ رکھا گیا۔ ضخامت ہر جزو ۳۲ صفحے تھی۔ مختلف زمانوں میں اس رسالہ کی ادارت مولانا عبداللہ العمادی، مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین نے کی۔ ۱۹۱۶ء کے آخر میں یہ رسالہ بند ہو گیا۔ دوبارہ ۱۹۴۰ء میں مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی و مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ندوی کی زیر ادارت جاری ہوا لیکن ڈھائی سال سے زیادہ جاری نہ رہ سکا اور جون و جولائی ۱۹۴۲ء کے مشترک شمارہ کے بعد بند ہو گیا۔ ۱۲

میں شمار فرمائیں۔ شاید ان حقوق کا کوئی حصہ اس ذریعہ سے ادا ہو گیا اور واقعہ تو یہی ہے کہ
مادح خورشید مداح خود است"۔

مور ضعیف کرا چہا موقع ملا کہ سلیمان کے تخت کے ساتھ لٹک کر اسے بھی ایک گونہ بلندی میسر آئی حسب الحکم ایک اجمالی فہرست کتاب کی مرتب کر کے بھیج رہا ہوں۔
میرے پاس مسودہ نہیں ہے جو بھی بیضہ تھا اور وہی مسودہ، جو کسی طرح ملے گا؟ اب اس وقت میں اس کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ بہر حال کسی طرح اس کو کم از کم بھیجئے۔ ضرورت اس کی واقعی شدید تھی میرا خیال ادھر نہیں گیا تھا۔

آج کل تو روزوں کا خمار چڑھا رہتا ہے۔ بیچارے مولوی عبد الباری صاحب علاوہ دست شکنی کے بخار گزینی کے عارضہ میں چند دن کے لئے مبتلا ہو گئے تھے۔ تین روزوں کے متعلق "فعدة من ایام اخر" پر عمل کرنا پڑا۔ اب اچھے ہیں۔ آج صائم تھے لیکن ہاتھ ان کا ملائم نہ ہو سکا۔ بلکہ افادہ سے ڈرتے ہیں کہ کہیں رجعت نا ممکن نہ ہو جائے اور بحالت ہوش و حواس بالجبر بہ راضی نہیں ہیں طے کر لیا ہے کہ "شاہ یک دستی" ہی ہو کر رہوں گا عجیب بات ہے کہ جس دن لکھنؤ میں گر کر انھوں نے ہاتھ توڑا ایک صاحب ان کے حیدر آباد کے کن میں رفیق تھے اسی دن یا اس کے دوسرے دن وہ بھی گرے اور ہاتھ ہی ان کا بھی اکھڑ گیا۔
ماجد میاں بیچارے بھی ابھی میں الجھے ہوئے ہیں ان دنوں یاران باصفا سے مدت ہوئی کہ ملاقات نہ ہو سکی جنگ نے بحمد اللہ حیدر آباد کی سیاسی شورش میں بہت کچھ سکون پیدا کر دیا ہے۔

مناظر احسن گیلانی

۲۲ مارچ سنہ ۱۹۴۱ء مطابق ۲۲ صفر سنہ ۱۳۶۰ھ

سیدی المحترم المخدوم! دام مجدکم العالی،   السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ
معارف[1] میں "یادِ سجاد" رحمۃ اللہ علیہ کے عنوان سے آپ نے جو کچھ لکھا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو کیفیت مولانا مرحوم کی وفات پر میرے دل پر طاری تھی، اسی کی آپ نے ترجمانی فرما دی۔ حقیقت یہ ہے کہ جو آنسو آنکھوں سے اس مضمون کے پڑھنے سے بے اختیار نکلے، آپ کے کسی مضمون پر شاید کبھی نہ نکلے تھے۔ جس وقت مولانا مرحوم کی وفات کی خبر اچانک مجھے معلوم ہوئی، بے اختیار چند مصرعے موزوں ہو گئے تھے۔ جو غالباً "نقیب"[2] میں شائع بھی ہو گئے۔ نظم میں جن جذبات کا اظہار بند بند لفظوں میں میں نے کیا تھا، آپ نے نثر میں ان ہی کو کھول کر رکھا اور خوب ادا ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ بہار کی تنہا دولت لٹ گئی یالیت قومی یعلمون بما غفرلی ربی وجعلنی من المکرمین[3] کی آیت شاید ان کے لئے

---

[1] معارف سنہ ۱۹۱۶ء میں علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا اور آج تک ایک انداز پر نکل رہا ہے اس مدت میں کبھی بھی ناغہ نہیں ہوا۔ اردو میں اتنا پرانا رسالہ وقت کی پابندی کے ساتھ نکلنے والا شاید دوسرا نہ ہو۔ رسالہ کا معیار علمی بہت بلند ہے اور اسلامی علوم و فنون پر عمدہ اور قیمتی مواد پیش کرتا ہے۔ جب سے سید صاحب علیہ الرحمہ اس کی ادارت سے الگ ہوئے مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کی ادارت میں نکل رہا ہے۔

[2] اخبار "نقیب" امارت شرعیہ صوبہ بہار و اڑیسہ کا ترجمان ہے جو بڑی کامیابی سے آج تک نکل رہا ہے معروف کو جرأت کے ساتھ پیش کرنا اور منکر پر بے باک تبصرہ اخبار "نقیب" کی نمایاں خصوصیت ہے۔

[3] ترجمہ:- کاش میری قوم جان لیتی کہ میرے پروردگار نے مجھے بخش دیا اور مجھے معززین میں شامل کیا۔

بھی نازل ہو چکی تھی۔ مولینا کی وفات کے بعد مسٹر عبدالعزیزؒ سے تحسر آن کا ذکر آیا تو معلوم ہوا کہ موت کے بعد بھی دل سے ان کے گرانی نہیں گئی تھی۔

انشاء اللہ سے غدا الملقی الاحبہ۔ محمداً وصلے اللہ علیہ وسلم، وحزبہ[2]

فقط مناظر احسن گیلانی

---

۲۰ رمئی ۱۹۵۱ء مطابق ۲۲ ربیع الآخر ۱۳۶۰ھ

بانکی پور

مخدوم و محترم سید صاحب قبلہ! جنکم اللہ وحرزکم اللہ صبراً جمیلا

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آج ہی آپ کا گرامی نامہ گیلانی سے گھومتا ہوا مجھے پٹنہ میں ملا ہے۔ جہاں بحیثیت ایک مہاجر کے اپنے خاندان کے تمام افراد کے ساتھ مقیم ہوں۔ اس کا افسوس ہوا کہ آپ بھی ادھر پریشانیوں میں مبتلا رہے۔ خصوصاً معصومؓ[3] کے ہجران کا غم آپ کے لئے سخت ہے لیکن جو زندہ

---

[1] موصوف صوبہ بہار کے مشہور بیرسٹر انگریزی حکومت کے زمانہ میں صوبہ کے وزیر تعلیم بھی رہے ہیں ۱۹۳۶ء میں نئی اصلاحات کے ماتحت انتخاب لڑنے کے لئے حضرت مولانا محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ کی مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی کے مقابلہ میں یونائیٹڈ پارٹی بنائی لیکن الیکشن میں یونائیٹڈ پارٹی کامیاب نہ ہو سکی۔ اس وقت سے زندگی کے آخری لمحات تک مولیناؒ سے برہم ہی رہے۔ آخر میں حیدرآباد میں وزیر بھی رہے۔ [2] کل دوستوں سے طول گا یعنی جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی جماعت۔ [3] حضرت مکتوب الیہ رحمۃ اللہ علیہ کی صاحبزادی۔

ہو چکا وہ مرتا نہیں ہی اس واقعہ کے بعد صرف "انا بفراقک لمحزونون" کا صدمہ ہی باقی رہ جاتا ہے اور انا للہ وانا الیہ راجعون، کا اطمینان اس کے لئے کافی ہے۔ ہم لوگوں کا حال کیا پوچھتے ہیں۔ ۱۴ راپریل کو گیلانی پہونچا ایک ہفتہ اطمینان سے گذرا کہ اچانک دوسرے ہفتہ میں واقعہ کا آغاز گیلانی سے بشکل ڈاکہ شروع ہوا۔ سید محمد ندویؒ[1] استھانوی کی سسرال گیلانی ہی میں جناب کے یہاں ہے آپ ان سے ناواقف نہ ہوں گے رات کے دو بجے جب ہم لوگ سوئے تھے جیکارہ کی آواز لگاتے ہوئے بستی کے شمالی حصہ کی طرف جہاں ان کا مکان ایک ویران ٹولہ میں ہے۔ ڈاکو گھس پڑے۔ ہم لوگ انتہائی جنوب کے حصہ میں سوئے ہوئے تھے۔ اطراف میں کو ئی دل چار دس ساہوں کا مکان تھا۔ ڈاکوؤں کو دیکھتے ہی بجائے مقابلہ اور شور و غوغا کے سب اپنے اپنے گھروں کو بند کر کے رام رام جپنے لگے۔ ڈاکو باطمینان تمام اپنے کام میں مصروف رہے۔ سید محمد ندوی کے نانا خسر جن کا نام بھگو میاں[2] ہے ان بیچارے کو خوب لاٹھیوں۔ گرز افسوس پیٹا

---

[1] مولانا سید محمد صاحب استھانواں ضلع پٹنہ کے رہنے والے ہیں ایک بڑے عالم کے گھرانے میں پیدا ہوئے۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے فاضل ہیں۔ ایک عرصہ تک جامعہ حمانی خانقاہ مونگیر کے استاد رہے اور دارالمجامعہ کے مدیر تک۔ اب مدرسہ محمدیہ استھانواں ضلع پٹنہ کے استاد اور ناظم ہیں۔ صالح اور فقیر صفت شخص ہیں اور کچھ لکھتے رہتے ہیں۔

[2] بھگو میاں۔ اصل نام محمد نصیر الحق صاحب تھا اور گیلانی کے رہنے والے تھے مولانا سید محمد ندوی کے نانا خسر بھگو میاں کے صاحبزادہ مولانا حکیم محمد شفیع صاحب حضرت گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے مکتب و ہم مدرس رہے جو ماشاء اللہ اب بھی سلامت با کرامت ہیں۔

آنا پٹیا کر مار کر گویا گرا دیا پھر اندر حویلی میں ایک عورت (عمر ۲۵ سال) بیوہ، ان کی لڑکی
اور ایک ان کا پوتا (۲۰ سال) جس نے بی اے میں امتحان دیا تھا ان دونوں کو زدوکوب
شروع کیا سب کا مال دریافت کرتے تھے۔ بیچاری عورت کو بال پکڑ کر گھسیٹتے تھے۔ اور
کمر دالان میں لے جا کر مال و نقد کا پتہ پوچھتے اور یہ سب قصہ اس لئے کر رہے تھے کہ آج سے بیس سال
پہلے جھگو میاں نے پانچ ہزار روپے میں ایک جائداد بیچی تھی اور اسی روپیہ سے وہ گاؤں
کے ساتھ کچھ لین دین کا کاروبار کرتے رہتے تھے۔ بیس سال میں یہ روپیہ خرچ ہو چکا تھا
لیکن عوام پر یہی باور رہا کہ اب تک موجود ہے۔ اسی کی یہ سزا تھی جسے وہ بھگت رہے تھے
آدھ گھنٹہ کے بعد بالآخر ایک ملاح زادی جو اس طرف رہتی تھی اور میرے گھر کے ساتھ بیداد
حال میں گئی تھی اس سے نہ رہا گیا اور سیدھے ہمارے محلہ کی طرف کسی نہ کسی طرح پہونچ
گئی۔ برادرم مکارم سلمہ جو اپنے کمرے میں سوئے تھے ان کو اس نے جگایا۔ مکارم اٹھے میں زنانے
میں کوٹھے پر سویا تھا مجھے جگایا۔ اور اطراف کے ہندو مسلمان جو سوئے ہوئے تھے سب کو
جگا کر ڈاکوؤں پر حملہ آور ہوئے لیکن وہ کام کر چکے تھے۔ ہلہ کا شور سنکر جمعیت ہو گئے
زخمیوں کو اٹھایا۔ اور یہ معاملہ تو ختم ہو گیا لیکن اس رات کے دو بجے سے جو آنکھ کھلی تو
یقین کیجیے کہ تقریباً سترہ اٹھارہ دن تک پھر اس طرح بند نہ ہوئی تھی جس طرح کبھی نیند یا
خواب شیریں میں بند ہوتی تھی۔ ومن آیاته منامکم باللیل والنهار اور ومن شر
غاسق اذا وقب کی تفسیر اور قیمت اب سمجھ میں آئی۔ آفتاب غروب ہوتا تھا اور مختلف
سمتوں سے مسلسل خبریں آنے لگتیں کہ ڈاکو فلاں طرف مارچ جسے انھوں نے جھگو میاں کے

واقعہ میں بکثرت استعمال کیا تھا، دکھا رہے ہیں بستی کی مختصر نمونے لے کر گیلانی والے اس پر حملہ کرتے تھے
نمونا وہم یا دھوکا ثابت ہوتا تھا۔

لیکن اسی کے ساتھ دو تین دفعہ واقعی ڈاکوؤں کی جماعت کا سراغ ملا۔ ہم لوگوں کے
پاس تین نال بندوق تھی پاس پڑوس بند بھی ہوئی تھی۔ اطراف کے قریبی دیہاتوں
پر بھی مختلف دھاوے ہوتے رہتے تھے۔ چند دیہاتوں کے متعلق زیادہ شہرت تھی جن میں ایک
دیسنہ بھی تھا۔ بہر حال یہ فتنہ ابھی خوابیدہ نہ ہوا تھا، کہ اچانک ۲۷ر اپریل کو بہار کا حادثہ
جانگداز پیش آیا۔ مغربی بہار کے قریٰ پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ ہم مصیبت کے
مارے کانپ رہے تھے کہ ۳ر مئی کو بالآخر مشرقی بہار کے گاؤں چشتی پور میں کربلا کا میدان دن
دھاڑے سب کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ اب تک فساد کی آگ ہم لوگوں کی طرف سینوں
میں دبی ہوئی تھی۔ لیکن چشتی پور نے "ما بطن" کو "ما ظہر" سے بدل دیا۔ ہر گانوں کے
گنواروں کے تیور بدلے ہوئے تھے۔ حکومت کی طرف سے امداد کے پہونچنے میں دیر ہوئی
لیکن خدا کا شکر ہے کہ قبل اس کے کہ چشتی پور کے واقعہ کا اعادہ کسی اور گانوں میں ہو۔ فوج
پلٹن وغیرہ آگئی۔ کچھ بیرونی امداد اور کچھ موٹا شریف بستیوں میں چند بندوقوں کا ہونا اس
نے بالوں بال بچا لیا۔ اور حق تعالیٰ کا فضل عظیم ہوا۔ ورنہ آج دیسنہ اور گیلانی، استھانواں تو
تودۂ خاک کی شکل اختیار کر چکے ہوتے۔ دیسنہ اور استھانواں میں تو غنیمت ہے کہ کچھ لوگ
رہتے بھی گیلانی میں ایک مکارم اور اس فقیر کے سوا سالہا سال سے کوئی قابل ذکر انسان نہیں
رہتا تھا۔ حق تعالیٰ کا کرم ملاحظہ فرمائیے کہ حسن اتفاق سے صرف اسی سال چند گھرانوں کے

کچھ لوگ بعض خاص ضرورتوں سے اس گاؤں میں آئے ہوئے تھے جن کی وجہ سے کچھ آدمی اور کچھ بندوقیں بیکار ہوگئیں۔ اسی عرصہ میں گیلانی کے ایک گھر میں ہیضہ شدید قسم کا پھوٹ پڑا۔ سات موتیں دھڑا دھڑ ہو گئیں۔ خطرہ ہوا کہ، فرقہ وارانہ فساد کو تو برداشت کر رہے تھے لیکن اب یہ تیسری بلا ناقابل برداشت ہوگئی اور سچ یہ ہے کہ دراصل دل پہلے ہی طے کر چکا تھا کہ اس وقت "الم تکن ارض اللہ واسعۃ فتہاجروا فیہا"عہ کے سوال کے جواب کی تعمیل پر آمادہ ہونا چاہئے خصوصاً گیلانی میں میرا پوزیشن بہت نازک تھا، انھوں نے اسی کو راجہ قرار دیا گیا۔ سو صورت کی نخ الگ لگی ہوئی تھی آخر "ان الملاء یاتمرون بک لیقتلوک فاخرج انی لک من الناصحین"عہ کے حکم کی تعمیل میں "فخرج منہا خائفا یترقب قال رب نجنی من القوم الظالمین"سہ کہاں جاؤں؟ کیا حیدر آباد؟ بیس اکیس آدمیوں کا قافلہ اور اسی کے ساتھ مکارم سلمہ کے گھر میں بارہ دن ہوئے کہ ولادت ہوئی تھی۔ ایسے لوگوں کے ساتھ سینکڑوں کے مصارف کے ساتھ دکن میں دشواری معلوم ہوتی۔ اور پٹنہ (مدین) کا خیال کر گئے فلما

عہ کیا اللہ کی زمین کشادہ نہیں تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاؤ۔

عہ یہ آیتیں موسیٰ علیہ السلام کے واقعات سے لی گئی ہیں: ترجمہ درج ذیل ہے۔ لوگ تمہارے بارے میں مشورہ کر رہے ہیں کہ تمہیں قتل کر دیں۔ پس تم نکل جاؤ۔ بے شک میں تمہارے ہمدردوں میں سے ہوں۔"

سہ پس موسیٰ علیہ السلام وہاں سے نکل گئے خوف اور وحشت کی حالت میں کہنے لگے کہ اے میرے پروردگار مجھ کو ان ظالموں سے نجات دیجئے۔

توجہ تلقاء مدین قال عسیٰ ربی ان یہدینی سواء السبیل سہ کہتا ہوا پٹنہ آگیا ہوں مولوی محمد حسین[ا] مرحوم کے مکان کے پاس ہی ایک مکان کرایہ پر لے لیا ہے، اسی میں مقیم ہوں جہاں تک خبریں آ رہی ہیں، اب ہم لوگوں کی طرف بظاہر امن قائم ہو گیا ہے۔ ملٹری فورس گشت کرتی رہتی ہے۔ استھانواں مستقر ہے۔ دیسنہ کی حفاظت کا خیال زیادہ کیا گیا ہے سنا ہے کہ بستی والوں نے بھی محافظوں کا ایک دستہ مقرر کر لیا ہے اور حکومت نے بھی کچھ سپاہی دیئے ہیں۔

یہ کیا ہے؟ یہ کیوں ہے "شیء من الخوف" کا عام ابتلائی ظہور ہے یا کسی قوم کی قسمت کا آخری فیصلہ ہے۔ ابھی تک میرا رجحان پہلے خیال ہی کی طرف ہے۔ جنگ میں حکومت کی کمزوریوں کا پروپیگنڈہ عوام میں کیا جا رہا ہے۔ کسان سبھا، مہا سبھا، بلکہ خود کانگریس کے

ا؎ مولوی محمد حسین صاحب وکیل، باڑھ ضلع پٹنہ کے قریب ایک گاؤں "کھنڑا" ہی میں پیدا ہوئے۔ مولوی عبد اللطیف صاحب وکیل کی عینی سرپرستی کی اور انٹرنس تک تعلیم دلائی پھر محمد کریم صاحب مختار کی صاحبزادی سے عقد ہوا۔ اور بی اے اور وکالت کے امتحانات پاس کئے۔ ابتداءً مولانا گیلانی کے الفاظ میں "معلم الصبیان" کی چند سالوں کے بعد بہار شریف میں وکالت شروع کی اور اس قدر کامیاب ہے کہ بہار شریف کا "عدالتی حلقہ" ناکافی ثابت ہوا پٹنہ چلے آئے اور یہاں پریکٹس کرنے لگے۔ چلا اور خوب چمکے۔ برطانوی حکومت سے خان بہادر کا خطاب ملا۔ "گورنمنٹ پلیڈر" مقرر ہوئے سر فخر الدین مرحوم کے بعد حکومت بہار کے وزیر تعلیم ہوئے اور اسی منصب پر انتقال ہوا۔

سہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام مدین کی طرف چلے تو کہنے لگے کہ امید ہے کہ میرا رب مجھ کو سیدھا راستہ چلا دے گا۔

مہا سبھائی عوام کو دلیر بنا کر مسلمانوں پر مسلط رہے ہیں اور جب تک جنگ کا آخری فیصلہ ہو کر ملک کے امن و امان کو پھر قانون کے آہنی پنجوں کے نیچے نہ دبا یا جائے گا اس قسم کے واقعات کا اعادہ شاید ہوتا رہے۔ اس عبوری دور میں آخر اقلیت کے صوبوں میں مسلمانوں کی حفاظت کا کیا سامان کیا جائے، چالیس پچاس لاکھ انسانوں کا اچانک ایک صوبہ سے منتقل ہو کر دوسرے صوبوں میں پہونچنا ناممکن ہے۔ حکومت ہر ہر گاؤں کی حفاظت کے لئے مزید مصارف کا بار وہ بھی موجودہ حالت میں اپنے اوپر عائد کرنے کے لئے کسی طرح تیار نہیں ہو سکتی۔ میری رائے تو یہی ہے کہ خود اپنی رضامندی سے مسلمان حفاظت کا کوئی ٹیکس اپنے اوپر عائد کرائیں اور اسی ٹیکس سے بڑے بڑے گاؤں مثلاً دیسنہ، استھانواں جیسی آبادی رکھنے والوں میں کم از کم رائفل کے ساتھ اگر دو پنجابی یا سرحدی پٹھان رکھ دیئے جائیں اور چھوٹے گاؤں جہاں اکا دکا مسلمان ہیں مثلاً سیتاں، ادھر اُدھر وہ بڑے محفوظ قریوں میں چلے آئیں۔ اور کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی۔ اپنی رائے سے مطلع فرمائیے۔

بھوپال سے میرے نام اب تک کوئی مراسلہ نہیں آیا ہے۔ انشاء اللہ آئے گا تو ضرور حاضر ہوں گا۔

معاشیات والے مقالہ کو ساتھ لایا تھا کہ درست کر کے بھیجوں گا۔ لیکن ہوش ہی کب باقی رہا۔ اب کچھ مطمئن ہوا ہوں۔ نظر ثانی کر کے انشاء اللہ تعالیٰ بھیج دوں گا۔

آخری مصیبت یہ ہے کہ چند دن ہوئے ضلع پٹنہ میں شدید اولہ باری، تیز طوفانی آندھی کے ساتھ ہوئی، بعض آموں کے منجر جل چکے تھے۔ بچے کھچے پھل بھی صاف ہو گئے۔

رہے نام اللہ کا!

مناظر احسن گیلانی

۱۴؍ اگست ۱۹۴۱ء مطابق ۲۰؍ رجب ۱۳۶۰ھ

سیدی الکریم! مدمجدہٗ العالی السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

سخت تشویش کی حالت میں اس وقت رات کے تین بجے یہ عریضہ لکھ رہا ہوں۔ قصہ یہ ہے کہ عبدالقدیر صاحب بدایونی جو نام نہاد کے لئے ہائی کورٹ کے مفتی ہیں، اور مدرسہ نظامیہ[1] کی مجلس انتظامی کے میر مجلس ہیں محض اپنے ذاتی اغراض کے تحت ایک نیا فتنہ اٹھائے ہیں یعنی اندر اندر حکام کو ہموار کر کے یہ کوشش کر رہے ہیں کہ جامعہ عثمانیہ[2] کے شعبہ دینیات کو

---

[1] مدرسہ نظامیہ حیدرآباد کا بہت پرانا مدرسہ جہاں درس نظامیہ کے مطابق تعلیم ہوتی تھی۔ اب بھی یہ مدرسہ کسی صورت زندہ ہے اور کام کر رہا ہے۔ [2] جامعہ عثمانیہ غالباً ۱۹۲۰ء میں قائم ہوئی۔ حیدرآباد میں پہلے مدرسہ نظامیہ کے علاوہ ایک دارالعلوم بھی تھا جہاں قدیم علوم کے ساتھ کچھ علوم جدیدہ کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ مولانا حمید الدین فراہی اسی دارالعلوم کے پرنسپل ہو کر حیدرآباد گئے۔ وہاں انھوں نے یہ تجویز رکھی کہ موجودہ زمانہ کے معیار کے مطابق ایک ایسا ادارہ قائم کیا جائے جس میں بنیادی طور پر تو علوم عربیہ ہی کی تعلیم ہو لیکن ساتھ ساتھ زمانہ کی ضرورتوں کا لحاظ کرتے ہوئے علوم جدیدہ کی بھی تعلیم کا سلسلہ باقاعدہ رکھا جائے۔ اس زمانہ میں حیدرآباد کے ہوم سکریٹری جو بعد کو وزیر مالیات اور پھر وزیر اعظم ہوئے سر اکبر حیدری تھے۔ انھوں نے اس کو منظور کر لیا لیکن حیدری صاحب اور (باقی اگلے صفحہ پر)

جامعہ سے نکال کر مدرسہ نظامیہ میں شریک کر دیا جائے۔ متعدد بار اس تحریک کو اس شخص نے اٹھایا لیکن تحریک برباد کر دی گئی۔ ادھر پھر اس کو زندہ کرنا چاہا ہے۔ ضرورت آپ کی توجہ خاص کی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کے نقصانات کا آپ کو اندازہ ہو سکتا ہے۔ جو وقار اسلامی علوم کو جامعاتی نصاب میں شریک ہونے کی وجہ سے آج حاصل ہے وہ بالکل برباد ہو جائے گا۔ بیچارے مولویوں کے لئے جو بھی چند امتیازی جگہیں حیدرآباد کی ریاست میں اس ذریعہ سے نکل آئی ہیں، ہاتھ سے جاتی رہیں گی میرا ذاتی طور پر تو چنداں نقصان نہیں ہے تنخواہ تو بہرحال ملتی رہے گی، انشاء اللہ! لیکن یہ بڑی بری بات ہو گی۔ ایک دفعہ جہاں یہ علوم یونیورسٹی کے نصاب سے نکلے جیسا کہ انگریزی خوانوں کا گروہ عرصہ سے چاہ رہا ہے پھر ان کا داخل ہونا ناممکن ہے۔ مولینا حمید الدین[لہ] رحمۃ اللہ علیہ کی ایک یادگار ہے۔ دارالعلوم کو توڑ کر انہوں نے

(بقیہ صفحہ گذشتہ) اور ان کے ہم نواؤں نے بعد میں اس کو بالکل الٹ دیا یعنی اصل تو علوم جدیدہ کو قرار دیا اور علوم دینیہ عربیہ کو اس کا تابع بنا دیا جو مولینا فراہیؒ کے مقصد کے بالکل ہی خلاف تھا۔ پھر عثمانیہ یونیورسٹی میں مستقل طور پر شعبۂ دینیات کھولا گیا جس کا مقصد مولینا فراہیؒ کے ہم نواؤں کے آنسو پونچھنا تھا۔ ۱۲

لہ مولینا حمید الدین الانصاری الفراہی موضع پھریہا ضلع اعظم گڈھ میں ۱۲۸۰ھ / ۱۸۶۲ء میں پیدا ہوئے آپ علامہ شبلی نعمانی رحہ کے ماموں زاد بھائی تھے۔ قرآن حفظ کیا اور مختلف علوم و فنون کی تعلیم علامہ شبلی نعمانی، حضرت مولینا عبدالحی فرنگی محلی اور حضرت مولینا فیض الحسن سہارنپوری رحمہم اللہ سے حاصل کی پھر علی گڈھ اور الٰہ آباد یونیورسٹیوں سے انگریزی کی ڈگریاں حاصل کیں (باقی اگلے صفحہ پر)

ہی جامعہ بنایا تھا اور شعبۂ دینیات ہی قدیم دارالعلوم کا جامعہ میں نمائندہ ہے۔ عرض یہ ہے کہ بعجلت ممکنہ جس طرح ہو سکے سب سے پہلے ایک خط نواب مہدی یار جنگ بہادر کو بذریعہ رجسٹری ارسال فرمائیے کہ وہ اس تحریک کو آگے بڑھنے نہ دیں۔ اسلامی علوم کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) عبرانی زبان بھی سیکھی۔ سنہ ۱۹۰۲ء میں لارڈ کرزن کے ساتھ ترجمان کی حیثیت سے خلیج فارس وغیرہ کا سفر بھی کیا۔ پہلے علی گڈھ اور پھر الٰہ آباد یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر رہے اس کے بعد مدرسہ نظامیہ کے مدیر کے منصب پر منتخب ہو کر حیدرآباد تشریف لے آئے اسی زمانہ میں آپ نے علوم مروجہ کی ایک ایسی یونیورسٹی کھولنے کا تخیل پیش کیا جس کی تعلیمی زبان اردو ہو اور تمام علوم و فنون کے نصاب کی کتابیں اردو زبان ہی میں مرتب کر کے پڑھائی جائیں یہی تخیل جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کی شکل میں سامنے آیا۔

آپ کی زندگی کا موضوع قرآن پر غور و فکر تھا۔ آپ کا خیال تھا کہ قرآن ایک مرتب اور منظم بیان ہے۔ ایک سورہ دوسری سورہ سے اور ایک آیت دوسری آیت سے مربوط ہے۔ اور اس ترتیب و ربط میں حکمت و بلاغت ہے جو آیت مقدم ہے اُسے مقدم ہی ہونا چاہئے اور جو موخر ہے اسے موخر ہونا چاہئے آپ نے اپنے قرآنی نظریات کی تعلیم و اشاعت کے لئے سرائے میر "ضلع اعظم گڈھ" میں ایک مدرسہ "مدرسۃ الاصلاح" نامی قائم کیا۔ تقریباً ۴۰ کتابیں آپ کی تصنیفی یادگار ہیں۔ دس بارہ کتابیں چھپ کر منظر عام پر آ چکی ہیں اور بقیہ ابھی تک غالباً غیر مطبوعہ ہیں۔ اکثر تصنیفات کا موضوع قرآن اور اس کے متعلقات ہیں۔ نومبر ۱۹۳۰ء مطابق جمادی الاخریٰ ۱۳۴۹ھ کو قرآن پڑھتے ہوئے متھرا میں رحلت فرمائی۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

وقار کو سخت صدمہ پہنچے گا اگر ایسا ہوا۔ نواب[1] عماد الملک نے ہمیشہ اس ریاست میں اسلامی علوم کی سرپرستی کی۔ لکھئے کہ آپ ہی کی ذات سے ساری امیدیں وابستہ ہیں۔

اور اگر آپ کے تعلقات نواب[2] صاحب چھتاری سے ہوں، تو ایک خط ان کو بھی لکھ دیجئے کہ یہ صورت غالباً آپ کی صدارت کے زمانہ میں پیش ہے۔ شدت کے ساتھ وہ اس کی

---

[1] نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی سی، آئی، ای قصبہ صاحب گنج ضلع گیا میں ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوئے ۱۸۶۶ء میں کلکتہ یونیورسٹی سے بی، اے کیا۔ اور عربی و فارسی زبان میں بھی مہارت پیدا کی۔ سید علی بلگرامی کے عربی ماہوار رسالہ "الحقائق" میں نواب صاحب موصوف بھی مضامین لکھتے تھے۔ عرصہ تک حیدرآباد دکن میں ممتاز عہدوں پر سرفراز رہے۔ دائرۃ المعارف حیدرآباد کا قیام آپ ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ سکریٹری آف اسٹیٹ ہند کی کونسل کے ممبر بھی ہوئے۔ مخزن الفوائد نام سے ایک ماہانہ رسالہ بھی جاری کیا تھا، آپ کے مضامین اور خطبات کا مجموعہ رسائل عماد الملک کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ جون ۱۹۲۶ء میں وفات پائی۔

[2] سعید الملک نواب ڈاکٹر سر حافظ محمد احمد سعید خان آف چھتاری جی، بی، اے، کے، سی، ایس، آئی کے، سی، آئی ای، ایل، ایل، ڈی ۱۲ جنوری ۱۸۹۹ء کو باغپت ضلع میرٹھ میں پیدا ہوئے آپ کا تعلق ایک قدیم رئیس اور دیندار گھرانہ سے ہے۔ ابتداءً قرآن مجید حفظ کیا۔ پھر کچھ عربی پڑھی اور پھر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی اس کے بعد اپنی ریاست کے انتظامات کو سنبھالا۔ ۱۹۱۴ء میں برٹش گورنمنٹ کی طرف سے جنگی خدمات انجام دیں اور اس کے صلہ میں حکومت نے خطابات سے نوازا۔ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مخالفت فرمائیں۔ ہو سکے تو ایک خط عبد العزیز[1] صاحب کو بھی لکھ دیجئے۔ یوں تو میں حتی الوسع کام کر ہی رہا ہوں لیکن ضرورت آپ کی امداد کی ہے۔ ایسا نہ ہو غیر اہم قرار دے کر آپ تغافل سے کام لیں۔ خدا جانے آپ ہیں کہاں؟ میں اس خط کو ولینہ کے پتہ سے لکھ رہا ہوں۔ بہر حال آپ جہاں ہوں گے انشاء اللہ مل جائے گا۔ فقط

مناظر احسن گیلانی

وجوہ

۱۔ جامعاتی نصاب میں اسلامی علوم کی شرکت اس کے وقار کا باعث ہے۔ نظامیہ جو نیم سرکاری ادارہ ہے، اس میں چلے جانے کے بعد یہ وقار جاتا رہے گا۔

۲۔ دونوں اداروں کے مقاصد جدا جدا ہیں۔ مسلمانوں کی مذہبی ضرورت کی تکمیل کرنے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) نواب صاحب صوبہ یوپی کی سیاسیات میں وقتاً فوقتاً بہت ہی محتاط طریقہ پر حصہ لیتے رہے۔ کونسل کے ممبر ہوئے۔ پھر صوبہ یوپی کے وزیر رہے۔ ۱۹۲۵ء میں ہوم ممبر ہوئے۔ پھر گورنری کے منصب تک پہونچے مجھے یاد ہے کہ نواب صاحب جب گورنر ہو کر لکھنؤ آئے تو انہوں نے پہلا کام دار العلوم ندوۃ العلماء کی مسجد کا سنگ بنیاد رکھا۔ اسی زمانہ میں رمضان شریف کا زمانہ آیا اور نواب صاحب نے ایک ویران مسجد کو آباد کیا اور وہاں خود تراویح پڑھائی۔ حیدرآباد کے وزیر اعظم بھی رہے۔ ماشاء اللہ بقید حیات ہیں ۱۲

[1] عبد العزیز صاحب بیرسٹر وزیر ریاست حیدرآباد مراد ہیں ۱۲

والے علما پیدا کرنا، یہ نظامیہ کا مقصد ہے۔ سارے ممالکِ محروسہ میں ایک خالص دینی مدرسہ بھی ہے گویا ایک قومی ضرورت کی اس سے تکمیل ہوئی ہے اور ایسے علما جو جدید عصری تعبیروں میں اسلامی علوم کو ملک کے موجودہ سر بلند طبقوں میں پیش کر سکیں۔ یہ شعبہ دینیات کا مقصد ہے جس میں بی اے تک طلبہ کو انگریزی پڑھائی جاتی ہے جدید عصری علوم تاریخ، جغرافیہ، ریاضی میٹرک تک پھر ایم اے میں ایک ہی مضمون پڑھا کر آئندہ ڈاکٹریٹ کی تیاری کے لیے طلبہ تیار کیے جاتے ہیں۔ ہندوؤں میں بھگوان داس[لہ]، رادھا کرشنن[ٹہ] وغیرہ بیسیوں علما ایسے پیدا ہو چکے جنہوں نے ہندوؤں کی خرافات کو علم کا رنگ دے کر یورپ میں مقبول بنایا لیکن مسلمانوں میں ایک بھی

لہ ڈاکٹر بھگوان داس ایم اے، پی ایچ ڈی ہندو فلسفہ کے یوپی میں ماہر سمجھے جاتے تھے۔ آزادی کے حامی رہے۔ متعدد کتابیں انگریزی میں تصنیف کیں۔ تحریک خلافت میں شریک ہوئے اور گاندھی جی کی تحریک پر الہ آباد ودیا پیٹھ (قومی یونیورسٹی) قائم کی، اور اسی کو چلاتے رہے۔ آزادی سے پہلے مسلمان دوست سمجھے جاتے تھے۔ آزادی کے بعد تعصب و نفرت کا اثر ان پر بھی ظاہر ہوتا تھا۔ مولانا عبدالماجد دریاآبادی کا بیان ہے کہ ان کا الحاد ڈاکٹر بھگوان داس کی ایک تصنیف کے مطالعہ سے دور ہوا۔ ان کے لڑکوں میں سری پرکاش مشہور ہوئے۔ متعدد بار جیل گئے۔ پاکستان میں ہندوستانی ہائی کمشنر رہے اور متعدد صوبوں کے گورنر ہوئے۔ ۱۲

ٹہ سر ایس رادھا کرشنن ایم اے، ڈی لٹ، آف بی اے۔ ۵ ستمبر ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے۔ مدراس کرسچین کالج میں تعلیم پائی۔ پریسیڈنسی کالج مدراس میں ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۷ء (باقی اگلے صفحہ پر)

انسانہ ہوا۔ یہ کام ہم مولویوں کا نہیں انگریزی خوانوں کا تھا۔ لیکن چند

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) تک فلسفہ کے پروفیسر رہے۔ ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۲ء تک میسور یونیورسٹی میں اور ۱۹۲۱ء تا ۱۹۳۶ء کلکتہ یونیورسٹی میں فلسفہ کے پروفیسر رہے۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء تک آکسفورڈ یونیورسٹی میں مشرقی مذاہب کے لکچرر رہے۔ ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۷ء تک بنارس ہندو یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے۔ اور پھر ۱۹۳۰ء میں مانچسٹر کالج آکسفورڈ میں لکچرر رہے۔ ۱۹۲۶ء میں مانچسٹر کالج آکسفورڈ میں اور شکاگو امریکہ میں بیک وقت مذہبیات کے لکچرر رہے۔ ۱۹۳۷ء تا ۱۹۵۰ء ہندوستان کی فلاسفیکل کانگریس کے صدر رہے۔ ۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۹ء لیگ آف نیشنز کی ذہنی تعلقات کی بین الاقوامی کمیٹی کے رکن رہے۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے اعزازی رفیق، اور ہندوستانی یونیورسٹیوں کے کمیشن کے صدر رہے۔ ۱۹۵۰ء میں روس میں ہندوستانی سفیر رہے۔ ۱۹۵۲ء سے ۱۹۶۲ء تک جمہوریہ ہند کے نائب صدر رہے۔ پھر ڈاکٹر راجندر پرشاد صدر جمہوریہ ہند کے بعد ۱۹۶۲ء میں ہندوستان کے صدر منتخب ہوئے اور ابھی تک اسی عہدہ پر فائز ہیں۔ فلسفۂ مذاہب اور بالخصوص ہندوستانی فلسفہ میں بین الاقوامی شہرت رکھتے ہیں۔ تصنیفات میں بھگوت گیتا مع مقدمہ، فلسفۂ ہند، زندگی کا ہندو تصور، زندگی کا مثالی تصور، مشرق و مغرب مذہب کے آئینہ میں، فلسفۂ جدید میں مذہب کا اثر، فلسفۂ ٹیگور، مذہب اور سماج، مشرق کے مذاہب اور فلسفۂ مغرب، گوتم بدھ اور ہندو دھرم ہیں۔ تمام کتابیں انگریزی میں ہیں۔

امیر علی[1] اور صلاح الدین کے سوا کون پیدا ہوا؟ نہ ہندوستان میں نہ بیرون ہند
شعبۂ دینیات سے توقع ہے کہ چالیس پچاس میں دس پانچ ایسے عالم نکل آئیں گے
جیسے ایک ڈاکٹر حمید اللہ ہیں اور کچھ چند لڑکے اس سلسلہ میں کام کر رہے ہیں۔

۳۔ اس لئے شعبۂ دینیات میں بھی اسلامی علوم پڑھائے جاتے ہیں اور نظامیہ میں بھی۔
اگر دونوں کا انجذاب ہو سکتا ہے تو عربی ادب کے شعبہ اور فارسی ادب کے شعبہ کو
کیوں نہ مدرسہ نظامیہ میں داخل کر دیا جائے۔ حالانکہ یہ کوئی نہیں کرے گا۔ اور نہ ایسا
ہونا چاہئے مگر اسلامی علوم کا جامعہ میں رہنا یہ لوگوں کو ناگوار ہے۔ وہ نہیں سمجھتے،
انگریزوں نے اپنی یونیورسٹیوں سے چونکہ ان علوم کو شہر بدر کیا، داخل ہونے کے
بعد اب جامعہ عثمانیہ سے شہر بدری کا سامان ہو رہا ہے۔ حالانکہ ڈھاکہ، علی گڈھ
نے اپنے نصاب میں ان کو شریک کر لیا ہے۔

---

[1] جسٹس سید امیر علی، جدید علوم کے ساتھ علومِ عربیہ سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ یورپ میں اسلام کی بڑی خدمت کی، وہ یورپ میں تمام اسلامی کاموں اور تحریکوں کے رکن رکین سمجھے جاتے تھے ان کی دو کتابیں "اسپرٹ آف اسلام" (Spirit of Islam) اور ہسٹری آف سارا سینس ( ) نے بڑی شہرت حاصل کی۔ مختلف زبانوں کے علاوہ عربی میں بھی اس کا ترجمہ ہوا۔ فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہدایہ کا ترجمہ انگریزی میں موصوف نے کیا۔ اگست ۱۹۲۸ء میں واصل بحق ہوئے۔

۲۹ر اکتوبر سنہ ۱۹۴۱ء۔ ۷ر شوال سنہ ۱۳۶۰ھ

حیدرآباد دکن

سیدی المحترم! مدظلکم   السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

واللہ اعلم آج کل آپ کہاں ہیں۔ رمضان کا غالباً عشرہ رواں تھا جب آپ کا ایک
سفارشی گرامی نامہ ملا تھا چونکہ واقعات کا علم نہیں تھا۔ چاہا کہ تحقیق کے بعد آپ کو جواب
دوں۔ ان دنوں بُعدِ مسافت اور پٹرول[1] کے راشن کی وجہ سے آمد و رفت میں بڑی دشواری
ہو گئی ہے۔ اس لئے مسئلہ کی تحقیق میں تاخیر ہوئی ہے۔ جہاں تک میں نے متعدد ذرائع سے
دریافت کیا، زنانہ کالج میں بالفعل کسی تقرر طلب جائیداد کا پتہ نہ چلا، اور نہ کوئی مجلس تقررات
اس کے لئے مقرر ہوئی ہے، جس کا فقیر رکن ہو۔ مولانا خلیل[2] عرب صاحب کی صاحبزادی صاحبہ

---

[1] اس زمانہ میں مولانا گیلانی نے ایک کار بھی رکھ لی تھی۔ ۱۲

[2] مشہور محدث شیخ حسین یمنی ہندوستان آئے اور نواب صدیق حسن خاں مرحوم کی قدر دانی سے بھوپال ہی میں رہ گئے، محدث یمنی موصوف سے ہزاروں علماء و محدثین نے استفادہ کیا۔ ان کے صاحبزادے شیخ محمد عرب صاحب دار العلوم ندوۃ العلماء میں ادب کے استاد تھے۔ انھیں کے لڑکے شیخ محمد خلیل صاحب عرب ہیں، جنھوں نے ندوہ میں تعلیم پائی۔ فراغت کے بعد مدرسہ عالیہ کلکتہ میں مدرس مقرر ہوئے پھر لکھنؤ یونیورسٹی میں عربی کے استاد مقرر ہوئے۔ چند سالوں کے بعد مستعفی ہو کر بھوپال چلے گئے۔ سنہ ۱۹۱۱ء مطابق ۱۳۲۹ھ میں مجلس علماء بھوپال کے رکن منتخب ہوئے، جو بھوپال کا ایک معزز سرکاری منصب ہے۔ ۱۲

سے تعارف گزشتہ سال میں نواب محمد یار جنگ بہادر کے توسط سے حاصل ہو چکا ہے۔ دیر تک مجھ سے گفتگو ہو چکی ہے۔ ان کے اسناد بھی میں نے دیکھے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہندوستانی عورتوں میں ان جیسی قابلیت عربی و اسلامی علوم میں کسی دوسری عورت میں مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔ ان کا خیال مجھے اسی زمانہ سے ہے۔ پھر آپ کے حکم کے بعد تو اور تقویت ہو گئی بھوپال سے ڈاکٹر عبدالرحمٰن ڈمراؤنوی[1] نے بھی سفارش کی تھی، خود مولینا خلیل عرب کا گرامی نامہ بھی آیا تھا۔ انشاء اللہ تعالیٰ میرے بس میں جو کچھ ہوگا کوئی دقیقہ ان کی اعانت کا اٹھا نہ رکھا جائیگا

---

[1] ڈاکٹر عبدالرحمٰن مولینا گیلانی کے اعزہ میں تھے۔ اور ڈمراؤں جو گیلانی سے تین میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں ہے وہیں کے رہنے والے تھے۔ ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم انگلستان میں حاصل کی۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم کی سرکردگی میں جو طبی مشن ہندوستان سے ترکی گیا تھا۔ موصوف نے لندن سے آکر اس میں شرکت کی اور نمایاں کام انجام دیئے۔ اور ڈاکٹر انصاری کے خاص رفقاء میں شمار کئے جانے لگے۔ ترکی سے واپس آکر کچھ دنوں دہلی میں پرائیوٹ پریکٹس کی اور کامیاب رہے۔ ڈاکٹر انصاری کے انتقال کے بعد دہلی سے دل اچاٹ ہو گیا۔ دلی چھوڑی اور ریاست بھوپال کے چیف میڈیکل افسر ہو گئے بھوپال سے پنشن پاکر پھر دہلی آئے یہیں قیام کا ارادہ تھا۔ کہ ۱۹۴۷ء کا قتل عام ہوا۔ زندگی باقی تھی کسی طرح پاکستان پہونچے۔ وہاں پریکٹس شروع کی اور خوب کامیاب رہے۔ مسٹر محمد علی جناح مرحوم اور مسٹر غلام محمد مرحوم گورنر جنرل پاکستان کے طبیب خاص رہے۔ ان دونوں کے انتقال کے بعد کراچی آکر مقیم ہو گئے، اور وہیں انتقال ہوا۔

رمضان ہی میں بعض مقامی اخباروں میں آپ کی آمد آمد کی خبر شائع ہوئی۔ ہم لوگوں کو تعجب ہوا متعدد احباب خصوصاً احمد[1] صاحب دریافت کرنے آئے لیکن بجز لاعلمی کے اور کیا جواب دے سکتا تھا۔ واللہ اعلم کیا واقعہ ہے۔ مولینا عبدالباری بیچارے ان دنوں سخت بیمار ہیں۔ رخصت لے کر گھر جانا چاہتے تھے۔ لیکن عین روانگی کے دن دورہ پڑا گر گئے۔ اب اچھے ہیں اگرچہ کالج نہیں جا رہے ہیں
ہاں صاحب مشہور تو یہ ہو گیا کہ بالآخر آپ نے بھی ایک دیوبندی[2] کے ہاتھ میں ہاتھ دے ہی دیا۔ کیا یہ صحیح ہے خدا کرے صحیح ہو۔

آپ کی عین وقت پر امداد سے شعبۂ دینیات بحمداللہ اس انقلابی طوفان سے بچ گیا۔ گو اس میں حیدری صاحب کی روانگی کو بھی دخل ہے ہندوؤں سے مرعوبیت اس بیچارے کو اس حرکت پر آمادہ کر رہی تھی نواب مہدی یار جنگ بہادر سے میری گفتگو ہو چکی ہے جدید جنبش کے لئے اس خرخشہ کو ختم کر دینے کا انہوں نے تہیہ کیا ہے۔ شیروانی صاحب نے بھی اس مسئلہ میں بڑی دلچسپی لی۔ جدید صدر اعظم بہادر نواب چھتاری سے آپ کے تعلقات تو سنتے

---

[1] امجد حیدرآبادی حیدرآباد کے مشہور صوفی شاعر "رباعی" کے بادشاہ رہے ہیں حکمت کا لطیف امتزاج ہے۔ زندگی کا عجیب تضاد یہ بھی ہے کہ زمانہ تک ایک دفتر سے منسلک رہنا اور وہ وقت بھی محاسبی کا۔ اب وظیفہ پر ہیں بے حد کمزور اور آنکھوں سے مجبور ہو گئے ہیں۔ مولانا گیلانی علیہ الرحمہ کے بڑے گہرے دوست متعدد مجموعۂ کلام طبع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔

[2] حضرت مولینا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت کی طرف اشارا ہے"

ہیں بہت وسیع ہیں۔ مجھ سے تو ملاقات بھی نہ تھی، اسی لئے ملا بھی نہ تھا۔ رمضانی دعوت میں ایک دفعہ مدعو ہوا، آٹھ دس مہمان تھے۔ اس دن گفتگو کا موقع ملا تھا لیکن برنی صاحب نے سب کے حقوق یک قلم غصب کر لئے۔ پھر کوئی صورت اجتماع کی ایسی نہ ملی کہ کھل کر بات ہو آپ کا ذکر سیاسی کتاب کے سلسلہ میں آیا تھا۔ وہ کئی بار آپ کو شاہ سلیمان صاحب کے لفظ سے یاد کر رہے تھے۔ غالباً ملاءِ اعلیٰ میں جس کی شاہی کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ ملاءِ ادنیٰ پر اسی کی تجلی پڑی ہے لیکن جیسا کہ عرض کیا برنی نے ساری گفتگو کرکری کر دی۔ آج کل مولوی عبد القدیر بدایونی کا ان کے یہاں بہت زور ہے۔ ہر ڈنر اور دعوت میں سنا گیا ہے کہ مدعو ہوتے ہیں۔

ایک اور ضروری مسئلہ میں آپ کی اعانت کا محتاج ہوں، قصہ یہ ہے کہ اسی طالب علم نے جس نے طحاوی[1] کا مقالہ لکھا تھا ایم اے میں کامیاب ہو جانے کے بعد چونکہ یہاں کے امیر و مشائخ کے گھرانے کا لڑکا ہے اس لئے نوکری سے بے پروا ہو کر پی، ایچ ڈی کی تیاری میں لگ گیا ہے "جنوبی ہند میں اہل حدیث" اس کے تحقیقاتی مقالہ کا عنوان ہے۔ نگرانی میری ہے کئی دن سے چاہ رہا تھا کہ اس موضوع کے متوقع مواد کی نشاندہی میں آپ سے اعانت حاصل

---

[1] ابو جعفر احمد بن محمد پورا نام ہے۔ "طحا" مصر کا ایک دیہات ہے ۲۳۷ھ میں وہیں پیدا ہوئے۔ امام شافعی کے مشہور شاگرد امام ابو ابراہیم المزنی کے بھانجے ہیں۔ آپ بہت بڑے فقیہ و محدث تھے، مصر کے علاقہ میں احناف کی شہرت انھیں کی وجہ سے ہوئی۔ ابتداءً امام طحاوی شافعی المسلک تھے ان کے حنفی ہونے کا قصہ بہت مشہور ہے۔ آپ کی مشہور تصانیف یہ ہیں۔ شرح جامع کبیر، شرح جامع صغیر، کتاب الشروط کبیر، کتاب الشروط اوسط، کتاب الشروط صغیر (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کروں۔ یعنی چاہتا ہوں کہ:-

(۱) آپ کے جو مضامین مختلف اوقات میں "ہندوستان میں علم حدیث" کے متعلق شائع ہوئے ہیں۔ ان کا پتہ دیجئے۔ اپنے کسی شاگرد سے معارف کے ان پرچوں کو نکلوا کر میرے نام وی پی کرا دیجئے۔

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ خود ذرا فرصت سے چند سطروں میں ان کتابوں کی نشان دہی فرمائیے جن سے اس لڑکے کو مدد مل سکتی ہے۔ محبّر[1] کی "تاریخ،

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کتاب المحلات والوصایا والفرائض، تاریخ کبیر اور مشکل الآثار وغیرہ۔

ان کتابوں کے علاوہ امام طحاوی کی مشہور کتاب "شرح معانی الآثار" ہے جس میں آپ نے ان تمام مختلف فیہ اور متعارض احادیث کی تطبیق دی ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں اس کتاب کا انداز بالکل انوکھا ہے۔ اور طریق استدلال بھی اور دوسرے محدثین سے جداگانہ ہے۔ امام طحاوی کی عظمت کے لئے صرف یہی ایک کتاب کافی ہے، یہ کتاب طہارت سے متعلق مختلف احادیث کی تطبیق سے شروع ہوتی ہے۔ اور دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ اور دار العلوم دیو بند کے دورۂ حدیث کے نصاب میں داخل ہے۔ امام طحاوی کی وفات ابتداء ذلقعدہ میں ۳۲۱ھ میں ہوئی۔ رحمۃ اللہ علیہ

[1] علامہ ابو جعفر محمد بن حبیب بن امیۃ ابن عمر الہاشمی البغدادی کی قیمتی تاریخی تصنیف، مصنف تاریخ کے امام اور علم الانساب کے ماہر تھے۔ ۲۳ ذی الحجہ ۲۴۵ھ میں وفات پائی۔ اس کتاب کا صرف ایک نسخہ برٹش میوزیم میں تھا جس کا عکس حکومت حیدر آباد نے حاصل کیا۔ اور اسے ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے ایڈٹ کیا۔ اور دائرۃ المعارف حیدر آباد کی طرف سے ۵۰۲ صفحات پر ۱۳۶۱ھ ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئی۔ کتاب مختصر مگر جامع ہے۔ ۱۲

ابن[1] بطوطہ، اخبار[2] الاخیار، یادِ[3] ایام، دعوت[4] اسلام سے بالفعل اجزار کا انتخاب کر رہا ہے۔

لے دنیا کا مشہور سیاح جس نے مختلف ممالک کی ۲۹ سال میں تفصیلی سیاحت کی۔ مصر، شام، فلسطین، حجاز، عراق، بلادِ عجم، جنوبی بلادِ عرب، مشرقی افریقہ، ایشیائے کوچک، قسطنطنیہ، بلادِ خوارزم، ماوراء النہر، بخارا، افغانستان، ہندوستان، چین، سماترا، اندلس اور حبش کی سیاحت کی۔ اور اپنا سفرنامہ "تحفۃ النظار فی غرائب الامصار و عجائب الاسفار" کے نام سے لکھا۔

ابن بطوطہ کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ حالات کا بہت گہری نگاہوں سے مطالعہ کرتے تھے۔ وہ مذہبی، سماجی اور معاشرتی حالات پر گہری نظر ڈالتے ہیں اور پھر بڑی بات یہ ہے کہ وہ بیان میں صداقت میں قابل اعتماد ہیں۔ ان کے سفرنامہ کا ترجمہ انگریزی، فرانسیسی، جرمنی اور اُردو میں ہو چکا ہے۔ ابن بطوطہ کی پیدائش سنہ ۱۳۰۴ء میں اور وفات سنہ ۱۳۷۸ء میں ہوئی۔ ۱۲

کے اخبار الاخیار فی اسرار الابرار، راس المحدثین حضرت مولانا شاہ عبدالحق صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور تصنیف ہے۔ رمضان سنہ ۱۳۰۹ھ میں مطبع مجتبائی دہلی سے چھپ کر شائع ہوئی ۲۱۸ صفحات کی اس کتاب میں حضرت مصنفؒ نے حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے دور سے دسویں صدی تک کے مشائخ و اولیاء کا تذکرہ قلم بند کیا ہے۔ آخر میں کچھ مجذوب، صالحات اور اپنے اسلاف کے حالات لکھے ہیں۔ کتاب حضرت غوث الاعظم سیدنا الشیخ عبدالقادر جیلانی علیہ الرحمہ کے تذکرہ سے شروع ہوئی ہے اور حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرہ پر ختم ہوئی ہے۔ یہ کتاب اولیاء و مشائخ ہند کے حالات پر ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ۱۲

سے ۴۸ صفحات پر مشتمل یہ رسالہ دراصل ایک علمی اور تاریخی مقالہ ہے جو (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

جنوبی ہند میں اگر سی. پی اور گجرات کو بھی داخل کر لیا جائے تو اس میں کچھ حرج تو نہ ہوگا۔ عام طور پر پرانی کتابوں میں سورت، بمبئی، احمد آباد کو جنوبی ہند میں ہی خیال کرتے تھے۔ اسی طرح مانڈو، برہان پور کی اسلامی ریاستیں بھی جنوبی ہند ہی کی ریاستیں غالباً سمجھی جاتی ہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) حضرت مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب رائے بریلوی سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاسِ سورت میں پڑھا تھا۔ اور جسے مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڈھ نے سنہ ۱۳۳۷ھ مطابق سنہ ۱۹۱۹ء میں طبع کیا۔ اس مختصر لیکن قیمتی مقالہ میں اسلامی گجرات کی تاریخ، گجرات کے مسلم حکمران، گجرات کے مشائخ، علمائے گجرات کے کارنامے، ان تمام عنوانات پر تاریخ کی روشنی میں گفتگو کی گئی ہے۔ مقالہ دلچسپ اور تاریخی معلومات سے لبریز ہے۔ ۱۲

کہ یہ کتاب ٹی. ڈبلو. آرنلڈ اسکوائر بی. اے سابق پروفیسر محمڈن کالج علی گڈھ کی مشہور تصنیف "دی پریچنگ آف اسلام" (The Preaching of Islam) کا اُردو ترجمہ ہے۔ عنایت اللہ صاحب بیگ نے اسے اُردو قالب عنایت کیا۔ مطبع فیض عام علی گڈھ سے سنہ ۱۹۰۶ء میں پہلی مرتبہ یہ ترجمہ ۴۹۶ صفحات پر طبع ہو کر شائع ہوا۔ کتاب ایک دیباچہ، ۱۳ ابواب اور چار ضمیموں پر مشتمل ہے۔ تصنیف کا مقصد یہ بتلانا ہے کہ اسلام کی اشاعت میں شمشیر و سنان کا کوئی حصہ نہیں۔ بلکہ اپنی اچھائیوں کی بنا پر لوگوں کو گرویدہ و شیدا بنایا۔ اور اسلامی حکومتوں نے دوسرے مذاہب کو پوری مذہبی آزادی دی۔ کتاب معلومات سے پُر اور قابلِ مطالعہ ہے۔

"رحمتِ عالم[1] کے نسخوں کا انجام؟ میرا عجیب حال ہے۔ یوں تو حیدرآباد کی پبلک جس قدر مجھ سے دلچسپی رکھتی تھی وہ بہت کچھ زبان بندی کی وجہ سے ختم ہو چکی ہے۔ لیکن سکندرآباد میں ہر ہفتہ خطبہ مع الترجمہ ہوتا ہے، عید کی نماز بھی میں ہی پڑھاتا ہوں۔ اس سال بھی تقریباً ۸، ۹ ہزار کا مجمع تھا لیکن واہ رے میں! بیس نسخے رحمتِ عالم کا بھیجنا کوہ کندن بن گیا۔ سکندرآباد میں نوجوانانِ سکندرآباد کی ایک مشہور جماعت ہے۔ جو آپ سے بھی خط و کتابت و عقیدت رکھتی ہے۔ اسی کے سکریٹری کے حوالہ آج سے آٹھ دس مہینہ پہلے کیا۔ ہر ہفتہ تقاضا کرتا ہوں۔ مختلف جوابات پا رہا ہوں۔ غالب قرینہ ہے کہ جس طرح دوسری انجمن والوں کا پیشہ ہے اسی عام پیشہ کے تحت ان سعادت مند نوجوانوں نے مجھ بڈھے احمق کو احمق بنایا۔ اب دس پندرہ دن اور انتظار کر کے ان کی نوجوانی پر آنسو بہاتے ہوئے ندوہ کی اس رقم کو خود ہی بھیجدوں گا۔ کمال یہ ہوگا کہ میرے پاس اس کا ایک نسخہ بھی باقی نہ رہا۔ خیر قوم کے ان عاشقوں سے یہ کوئی نیا تجربہ نہیں ہوا ہے۔ مستکبرین ہوں یا مستضعفین اب تک برائے "اکل" کے سوا ان انجمنی و قومیاتی شکلوں کا اور کوئی نتیجہ نظر آیا۔ اف لهم ولما يعبدون۔

جب آپ اپنے حدیث کے مضامین کیلئے پچھے معارف کے تلاش کرائیے، تو اسی کے ساتھ اگر

---

[1] حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور تصنیف جو خاص طور پر بچوں اور عورتوں کے لئے لکھی گئی، سہل اور مفید و مقبول ہے۔ ۱۲

ممکن ہو تو معارف میں خاکسار نے مولانا برکات احمد[1] رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق جو مضمون لکھا تھا اور آپ کی سیرت والے مضمون کے پرچوں کو چنوا لیجئے۔ ان ہی پرچوں کے ساتھ ان پرچوں کو بھی وی پی کرا دیجئے۔ ہاں مرتضیٰ زبیدی[2] پر بھی شاید معارف ہی میں کچھ لکھا تھا۔ اور دادا[3] مرحوم

---

[1] ۱۲۸۰ھ میں پیدا ہوئے۔ میر نگر ضلع پٹنہ وطن ہے۔ ابتدائی تعلیم بہار کے مشہور عالم مولینا لطف علی دھنپھوری ضلع پٹنہ سے ہوئی۔ پھر ریاست ٹونک میں اپنے والد مولینا حکیم دائم علی طبیب خاص دربار ٹونک سے پڑھا۔ آپ فاضل گیلانی کے دادا مولینا محمد احسن گیلانی کے شاگرد تھے اس کے بعد پندرہ سال تک مولینا عبد الحق خیرآبادی کی خدمت میں رہ کر ایساغوجی اور میزان منطق سے لے کر شفاء ابن سینا اور شرح اشارات طوسی وغیرہ تک تعلیم حاصل کی۔ حدیث مولینا محمد ایوب پھلتی قاضی ریاست بھوپال سے پڑھی۔ پھر ریاست ٹونک میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا۔ ہند و بیرون ہند سے طلبہ کا ہجوم ہوا۔ کافی زمانہ ایسا بھی گذرا ہے کہ صبح پانچ بجے سے مغرب کی نماز تک اسباق ہی میں مشغول رہتے طلبہ کے ساتھ غیر معمولی شفقت آپ کا خصوصی امتیاز ہے۔ ہند و بیرون ہند کے علمی حلقے نے آپ کے علم و فضل کا اعتراف کیا ہے۔ مولینا معین الدین اجمیری۔ مولینا خلیل الرحمن ٹونکی۔ مولینا عبد السبحان بہاری۔ مولینا اشرف ملتانی مولینا مقبول احمد دربھنگوی۔ مولینا محمود سندھی۔ مولینا عبد الرحیم دربھنگوی اور صاحب مکاتیب مولینا سید مناظر احسن گیلانی آپ کے ممتاز تلامذہ میں ہیں۔ مولینا سید برکات احمد صاحب مرحوم خیرآبادی سلسلہ درس و تدریس کے اپنے زمانہ میں تنہا اور آخری نمونہ تھے ــــ تصنیف و تالیف سے بھی ذوق تھا۔ "الحجۃ البازغہ" "صدقہ جاریہ فی رد آریہ" وغیرہ آپ کی (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) مطبوعہ تالیف ہیں — ربیع الاول ۱۳۴۷ھ شب کے تین بجے ۶۷ برس کی عمر میں علم کا یہ آفتاب غروب ہوگیا۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

۲؎ سید مرتضیٰ زبیدی لغت کے امام اور قاموس کے شارح۔ اصل وطن ہندوستان ہی تھا ممالک عراق و شام، حجاز و مصر وغیرہ کی سیاحت کے بعد ملک یمن کے مقام زبید میں سکونت اختیار کرلی۔ لغت عربی کی مشہور کتاب قاموس کی شرح تاج العروس کے نام سے دس جلدوں میں لکھی اور اپنے اسی کارنامے کی وجہ سے مشہور ہوئے۔

تصوف کے موضوع پر موصوف کی ایک عربی کتاب کا ترجمہ حیدرآباد کے مشہور صاحب کشف و کرامات بزرگ حضرت حبیب العیدروس رحمہ اللہ کی فرمائش پر مولانا گیلانی علیہ الرحمہ نے کیا تھا جو غالباً مولینا مرحوم کے احباب اور تلمیذ رشید ڈاکٹر یوسف الدین صاحب حیدرآبادی کی کوششوں سے طبع ہورہی ہے۔ ۱۲۔

۳؎ علامہ گیلانی کے دادا مولینا سید محمد احسن گیلانی اپنی شادی بلکہ ایک اولاد ہونے تک تعلیم کی طرف متوجہ نہ تھے۔ یکایک تحصیل علم کا شوق ہوا، وطن چھوڑا، بہار شریف اور پٹنہ میں کچھ رکتے ہوئے لکھنؤ اور رام پور جاکر علم حاصل کیا۔ آدمی ذہین اور طباع تھے۔ منطق، فلسفہ اور ریاضی میں کمال پیدا کیا۔ چودہ سال کے بعد وطن واپس ہوئے۔ گیلانی میں مدرسہ کھولا۔ دُور دراز علاقوں سے طلبہ آتے اور درس لیتے۔ اور گیلانی جو محض ایک چھوٹا سا گاؤں تھا علم کا گہوارہ بن گیا۔ ضلع ہزارہ سے مولوی عبداللہ نے آکر گیلانی ہی میں فراغت حاصل کی اور یہیں بود و باش بھی اختیار کرلی۔ مولینا محمد احسن صاحب کے تین صاحبزادے تھے۔ بڑے کا انتقال (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کی ایک کتاب کے متعلق بھی معارف میں خاکسار کا ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ ان سب کو منگوا کر ایک جلد میں جمع کردوں۔ میرے سارے مضامین بکھرے ہوئے، کسی کا ایک ورق بھی موجود نہیں اور موجود رہنے کے لئے وہ ہیں بھی نہیں۔ "فیذہب جفاءً"

مناظر احسن گیلانی

۲۹ر اکتوبر ۱۹۴۱ء

۲۵ر اپریل ۱۹۴۲ء مطابق ۷ر ربیع الآخر ۱۳۶۱ھ

سیدی الامام دمتم فی ظل اللہ الملک العلام   السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

قسمت کے تہیدستوں کے لئے رہبران کامل کی راہ نمائیاں پہلی دفعہ الاسود ثابت نہیں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) مولینا کی زندگی ہی میں ہوگیا۔ دوسرے مولینا حافظ ابو نصر صاحب تیسرے حافظ ابوالخیر صاحب۔ مولوی ابو نصر صاحب نے پٹنہ اور رام پور جاکر مروجہ علوم سے فراغت حاصل کی۔ علامہ گیلانی کو انہوں نے ہی پڑھایا۔ تقریر و تحریر کی مشق کرائی۔ فراغت کے لئے ٹونک اور دیوبند بھیجا۔ اور پھر خانقاہ رحمانی مونگیر میں لاکر حضرت قطب العالم مولینا سید محمد علی مونگیری رح بانی دارالعلوم ندوۃ العلماء کی خدمت میں رکھا، جہاں آپ ڈیڑھ سال تقریباً مقیم رہے۔ فن منطق میں مولینا محمد احسن صاحب کے بعض رسائل اور متعدد کتابوں پر ان کے لکھے ہوئے حواشی خاکسار نے گیلانی میں دیکھے ہیں۔ وجود رابطی، مثناة بالتکریر والارسال، پر ان کے رسالے شائع ہوچکے ہیں۔ شرح سلم بحر العلوم پر معرکۃ الآراء حاشیہ لکھا ہے۔ اقلیدس کے مقالۂ اول کو پہلی بار آپ نے تصحیح و تحشیہ کے بعد لکھنؤ سے شائع کرایا۔

ہوئی ہیں۔ آپ نے چاہا تھا کہ بھوپال مجھے بلا لیجئے۔ میں نے بھی حاضری کا ارادہ کر لیا تھا۔ مارچ سے گفتگو ہو رہی تھی لیکن مارچ والی تاریخ حکومت نے ٹال دی۔ اپریل کا مہینہ مقرر ہوا۔ حیدرآباد میں منتظر رہا کہ اب مراسلہ ملے گا۔ بیک کرشمہ دو کار ہوگا۔ لیکن نہ کام ہی نکل سکا۔ نہ کرشمہ ہی کا ظہور ہوا۔ جب نربدا کو عبور کر کے میں گنگا کے کنارے پٹنہ میں پڑا تھا۔ تب حکومت بھوپال کا تار پٹنے کا ملا۔

۲۷ر تاریخ اپریل کی میرے لڑکے محی الدین سلمہٗ کی برات کی رخصتی کی تاریخ تھی۔ اب تک شادی کے متعلق ایک تنکا بھی خریدا نہ گیا تھا۔ پٹنہ سیدھے حیدرآباد سے اسی لئے آ گیا تھا۔ مکارم سلمہٗ گیلانی سے آ گئے تھے۔ میں خریداری میں مشغول ہو چکا تھا۔ مشغولیت نہ ہوتی تو جیسے میرا سارا کام مکارم سلمہٗ کے اختیار تمیزی کے سپرد ہے، یہ کام بھی وہی کر لیتے۔ لیکن اب بہت سی چیزوں سے میری ذاتی دلچسپی بھی پیدا ہو چکی تھی۔ کسی کی رائے نہ ہوئی کہ اسی حالت میں پھر جنوبی ہند پلٹ جاؤں۔ وہی تار دے دیا جو آپ کے سامنے پہونچا ہوگا۔ بھوپال میں نے اب تک نہیں دیکھا تھا۔ اور نہ وہاں کے لوگوں سے میرا کوئی تعلق تھا۔ اس دفعہ ایک اچھی صورت آپ کے ذریعہ سے نکل آئی تھی۔ مشیتِ الٰہی غالب آئی۔ بہرحال آپکی کرمفرمائیوں کا شکریہ تو برگردنِ ما واجب! مجھے نفع نہ پہونچا، اس کا الزام خود مجھ پر عائد ہوتا ہے کہ اس کے پوچھنے کی ضرورت تو ہیں کہ غالب خستہ کے بغیر کام ظاہر ہے کیسے رک سکتا تھا۔

معلوم نہیں اب کی موسمِ گرما میں حسبِ دستور دسنہ تشریف آوری ہوگی یا نہ ہوگی، اور ہوگی تو کب؟

محی الدین سلمہٗ کی شادی کی تاریخ بجائے ۲۷ر اپریل کے بعض دوسری تقریبوں کی وجہ سے اب ۸ر مئی مقرر ہوئی ہے۔ میں اپنی قسمت میں کاش اس بلندی کو محسوس کرتا کہ آپ کی شرکت کا امکان اس تقریب میں کسی طریقہ سے پیدا ہو جاتا۔ لیکن بلندی ہو یا پستی، قسمت کے دونوں پہلو خود صاحب قسمت کے لئے مجہول ہیں۔

بحمداللہ علم کی دولت کے ساتھ معرفت و عمل کی دولت بھی آخر میں آپ کے لئے مقدر تھی۔ آستانۂ تھانہ[1] بھون کی حاضری کا حال مولانا عبدالباری صاحب سے معلوم ہوتا رہتا تھا۔ ھنیئاً لکم ثم ھنیئاً لکم۔ الصادقین کی معیت آپ کو مبارک ہو۔ انعمت علیہم کے صراط کی ہدایت اصل ہدایت ہے، غضب اور ضلالت سے نجات کی واحد راہ بھی ہے "حسن اولئک رفیقا" کی سند کے ساتھ "الرفیق الاعلیٰ" کی مجلس، اس کی شرکت ہر قسم کی مجلسوں سے گذرنے کے بعد انشاءاللہ رسوخ تام کی بشارت و ضمانت کی حامل ہے۔

عجیب بات ہے کہ نہ یہاں محاسدہ ہے نہ مباغضہ، نہ منافسہ اور نہ مقابلہ، بلکہ

---

[1] ضلع مظفر نگر (یوپی) کا ایک مردم خیز تاریخی قصبہ۔ جو جہاد شاملی کی تحریک کا مرکز تھا ۱۸۵۷ء سے پہلے قصبہ کی آبادی تقریباً پچاس ہزار تھی۔ انگریزوں نے جوش انتقام میں گویا برباد کر دیا تھا۔ اور اب تو زیادہ سے زیادہ چار پانچ ہزار کی آبادی ہے۔ تھانہ بھون کا پرانا نام تھانہ بھیم ہے۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں یہی نام لکھا ہے۔ کثرت استعمال سے تھانہ بھون کہلانے لگا۔

ہر ایک دوسرے کے لئے داعی، گو مدت ہوئی اس راہ سے دور ہو چکا ہوں، لیکن اب تک وہ حلاوتیں دل ناکام کو یاد ہیں، جو کسی زمانہ میں میسر آئی تھیں۔ آپ لوگوں کی انقلابی زندگی خیر کی طرف اور میرا انقلاب شر کی طرف۔ باعث عبرت ہے۔

مولینا عبد الباری تو اپنے اہل و عیال کے ساتھ غالباً تھانہ بھون روانہ ہو چکے ہوں گے۔ وہ خانقاہ امدادیہ[ع] میں براج رہے ہیں۔ اور میں گیلانی میں بھاری شادیوں کی ظلمتوں میں مبتلا ہوں۔ بہ ظاہر زندگی کے آخری دنوں میں ان مکروہ مشاغل کے ساتھ ابتلا میرے لئے سخت ابتلا ہے، کہ العبرة بالخواتیم، ہو سکتا ہے آپ جیسے الصالحین کی محبت و عقیدت میرے حسن عاقبت کی وجہ بن جائے۔ والسلام

آخر میں پھر اسی تمنا شرکت تقریب کا اظہار کر کے اس عریضہ کو ختم کرتا ہوں۔

[ل] درسیات سے فراغت کے بعد مولینا خانقاہ رحمانی مونگیر چلے گئے اور تقریباً ڈیڑھ سال حضرت قطب عالم مولانا سید محمد علی کی ظاہری و باطنی تربیت میں رہے۔ اور پھر یہیں سے حیدرآباد تشریف لے گئے۔

[ع] یہ کسی باقاعدہ اور مستقل عمارت کا نام نہیں۔ قصبہ تھانہ بھون کے شمال مغربی گوشے میں ایک مسجد ہے۔ جو پیر محمد والی مسجد کے نام سے مشہور تھی اسی سے ملی ہوئی ایک سہ دری ہے جس میں ایک حجرہ بھی ہے اسی کو حضرت حاجی امداد اللہ قدس اللہ سرہٗ نے اپنا مسکن بنایا تھا آپ ہی کی نسبت سے یہ حجرہ اور سہ دری خانقاہ امدادیہ کے نام سے موسوم ہو گئی حضرت حاجی صاحب علیہ الرحمہ کے بعد حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی خانقاہ سے شریعت و طریقت کے دریا بہائے۔ اور نصف صدی تک آپ کا فیض یہیں سے جاری رہا۔ ۱۲۔

خدا کرے دسنہ آنے کا پروگرام ۶ رمئی سے پہلے ہو۔ ورنہ اعظم گڈھ سے ظاہر ہے کہ اس کی توقع کیا ہو سکتی ہے۔

مناظر احسن گیلانی

۲۵ راپریل ۴۲ء

---

۳ رفروری ۱۹۴۳ء۔ جامعہ عثمانیہ

۷ رمحرم ۶۲ھ۔ پنجشنبہ

سیدی الامام بشری لکم وطوبیٰ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

؎ ایں قالب فرسودہ گر از کوئے تو دور است

القلب علےٰ بابك لیلاً و نہاراً

کچھ عجب حال ہے، جب آپ کی زیارت موجب اجر و ثواب بنی تو جسے ثواب و اجر کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہی اس سعادت سے محروم ہے۔ آپ کہاں سے کہاں پہونچے، اور پہونچائے گئے اور ہم جرس کارواں کی صرف آواز ہی سنتے رہے۔ مولینا عبد الباری صاحب سے والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا کی جو تفسیر آپ کے ساتھ ہو رہی ہے اس کی خبریں سنتا رہتا ہوں، کتنی مسرتیں ان خبروں میں اپنے لئے پاتا ہوں، آپ کو اس کا اندازہ کیا ہوگا۔ خبر ملی تھی کہ آستانہ حکیم الامت حضرت تھانوی سے سند خلافت بھی حاصل ہو چکی ہے معارف کے شذرات میں جو کچھ

جس قلم سے شائع ہوا ہے اب اس کی عبدیت اور بندگی میں کون شک کر سکتا ہے، بندے نے بندے کے بندے ہونے کی توثیق کی میرے نزدیک تو خلافت کا حاصل ترجمہ یہی ہے۔ سب کچھ ننگاہوں سے ہٹ جائیے۔ اور ؎

از خدا خواہم و وز غیر نخواہم بخدا
کہ نیم بندۂ غیر د، نہ خدائے دگر است

اسی ایک حقیقت واقعیہ کا تحقق تام بس سب کچھ صرف یہی ہے ایاک نعبد وایاک نستعین کے مقام پر سرفرازی نصیب ہوئی۔ انشاء اللہ فردوس میں اس کے نزول کی تیاری ہے۔ ایسی مہمان نوازی کہ "لا یبغون عنها حولا" اس لئے کہ لو کان البحر مدادا لکلمات ربی لنفد البحر (الآیۃ) طلب لامحدود کے لئے مطلوب کو بھی لامحدود ہی ہونا چاہئے۔ بلکہ مطلوب کی لامحدودیت ہی نے اس طالب کو پیدا کیا۔ جس کی "طلوعیت" کسی نقطہ پر ختم نہیں ہوتی۔ کسی راہ میں ہو خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنہوں نے اپنی فطرت کے اس جذبہ کو اسی راہ پر لگا دیا۔ جس کے لئے پیدا کرنے والے نے اسے پیدا کیا تھا۔ کہ آدمی نے اس طلوعیت کو خود نہیں پیدا کیا، ورنہ خلق کا فعل مجہول کیوں رکھا جاتا۔ دیکھئے قدم بوسی کی تمنا کب پوری ہوتی ہے۔ دسنہ حاضر ہوا تھا، کسی سے ملاقات نہ ہو سکی۔ لیکن مکان کے چاروں طرف پروفیسر سعید[1] رضا صاحب

[1] دسنہ کے رہنے والے ہیں۔ ابتدائی تعلیم مکان پر ہوئی۔ پھر علامہ شبلی کے دور میں ندوۃ العلماء سے فراغت حاصل کی اور اس کے بعد انگریزی کی طرف متوجہ ہوئے (باقی اگلے صفحہ پر)

اور ان کے بھائی حفیظ[1] صاحب کی معیت میں گھوم آیا۔ کمرے بند تھے طواف سے زیادہ موقع نہ مل سکا، ایک برات میں گیا تھا۔

اور حالات کیا عرض کروں ؎

ہمیں نالہ ماند مسکین حسن را | از آں روز ترسم کہ ایں ہم نہ ماند

واللہ اعلم نسل انسانی کی دیوار کس کروٹ گرنے والی ہے۔ خیر ہم تو بہت جی چکے۔ اتنا کہ حساب سے عہدہ برآ ہونا صرف فضل ہی پر محمول ہے۔ اب تو سامنے یہی حال رہتا ہے ؎

عنقریب است کہ از ما اثرے باقی نیست
شیشہ شکستہ و مے ریختہ و ساقی نیست

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) میٹرک اور آئی اے کے امتحانوں میں اول آئے، اور گریجوایٹ ہوکر ... ہائی اسکول ... میں ہیڈ مولوی کی حیثیت سے کام کرنے لگے ۱۹۴۲ء میں آپ کا تقرر سینٹ زیویرس کالج بمبئی کے شعبۂ اردو، فارسی اور عربی میں ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ (Head of the department) کی حیثیت سے ہو گیا۔ کالج میں آپ اپنی صلاحیت، حسن خدمت اور حسن خلق کی وجہ سے بہت مقبول رہے۔ اب دسنہ ہی میں زندگی کے آخری ایام گذار رہے ہیں۔

[1] مولوی عبدالحفیظ صاحب دسنہ کے رہنے والے، ندوہ کے فارغ اور علامہ شبلی کے شاگرد ہیں۔ فراغت کے بعد آپ انڈین ہائی اسکول کھڑگپور (بنگال) (باقی اگلے صفحہ پر)

اس وقت مولینا عبدالباری صاحب کے مشورے سے یہ عریضہ خدمت والا میں روانہ کر رہا ہوں۔

مولینا عبدالحی[1] مرحوم کی "کتاب[2] الہند" کا حال آپ سے زیادہ دوسرا کون

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) میں ہیڈ مولوی مقرر ہوئے۔ اور تیس سال تک علم و ادب کی خدمت کرتے رہے۔ اور وہاں قومی و ملی کاموں میں بھی بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اب منہ ہی میں مقیم ہیں۔

[1] مولانا سید عبدالحی صاحب دائرہ شاہ علیم اللہ رائے بریلی میں رمضان ۱۲۸۶ھ میں پیدا ہوئے۔ مولینا فضل اللہ لکھنوی، مفتی عبدالحق کابلی، مولینا محمد نعیم لکھنوی، مولینا سید احمد دہلوی، اور شیخ حسین عرب وغیرہم سے تعلیم حاصل کی۔ اعلیٰ حضرت مولانا شاہ فضل رحمن قدس سرہ گنج مرادآبادی سے بیعت ہوئے۔ حدیث مسلسل بالاولیت، اور مسلسل بالمحبت سنی اور اجازت حاصل کی۔ مولینا ضیاء النبی اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے بیعت کی اجازت حاصل تھی، مولانا قاری عبدالرحمن پانی پتی، مولینا سید نذیر حسین مونگیری ثم الدہلوی، اور حضرت مولینا رشید احمد گنگوہی سے بھی حدیث کی اجازت حاصل کی۔ آپ کا تعلق حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے خانوادے سے ہے۔ ندوۃ العلماء کے ناظم رہے متعدد قیمتی کتابوں اور رسائل کے مصنف ہیں اردو شعراء کا تذکرہ گل رعنا کے نام سے لکھا۔ نزہۃ الخواطر ان کا شاہکار ہے ۱۳۴۱ھ بمطابق فروری ۱۹۲۳ء وفات پائی۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

[2] جہاں تک معلوم ہو سکا "کتاب الہند" مولینا عبدالحی رح کی کوئی تصنیف نہیں ہے۔ غالباً "نزہۃ الخواطر" کو فاضل گیلانی نے "کتاب الہند" لکھ دیا ہے۔

جانتا ہے، خیال یہ آیا ہے کہ مجلس تصنیف و تالیف کی زیر نگرانی مولینا محمود الحسن[1] ٹونکی کی "معجم المصنفین" کی ترتیب و تدوین کا جو کام تھا وہ ختم ہو چکا ہے۔ اس میں

---

[1] ریاست ٹونک کے رہنے والے، راقم الحروف کے استاذ مولینا حیدر حسن خاں صاحب محدث کے حقیقی بھائی۔ مولانا محمود الحسن خاں صاحب نے فقہ مشہور صاحب درس مولینا امام الدین کشمیری سے پڑھی، شیخ الحدیث شیخ حسین بن محسن الیمانی مقیم بھوپال سے حدیث کا درس لیا اور سند حاصل کی۔ مولینا موصوف ریاست ٹونک میں نواب ابراہیم علی خاں کے چھوٹے بھائی صاحبزادہ عبدالرحیم خاں صاحب سے وابستہ رہے۔ صاحبزادہ موصوف وضعدار، علم دوست اور قدرشناس لوگوں میں سے تھے۔ ٹونک کا مشہور کتب خانہ صاحب زادہ صاحب کی توجہ اور مالی امداد ہی سے محفوظ رہا، بلکہ ان کی زندگی تک اس میں اضافہ بھی ہوتا رہا۔ مولینا محمود حسن خاں صاحب نے اس کتب خانہ سے پورا استفادہ کیا۔ ریاست کے ارباب حل و عقد کو بھی مولینا کے علم کا اعتراف تھا۔ اس زمانہ میں ریاست ٹونک کے محکمہ شرع شریف کو حکم تھا کہ پیچیدہ مقدمات میں مولینا سے ضرور مشورہ لیا جائے چنانچہ ہوتا بھی یہی تھا۔ پچپن سال کی عمر میں مولینا حیدرآباد تشریف لائے اور اپنی مشہور کتاب "معجم المصنفین" کا خاکہ ارباب حکومت کے سامنے رکھا۔ مولینا حبیب الرحمن خاں شروانی صدر الصدور امور مذہبی حیدرآباد دکن نے محکمۂ امور مذہبی کے صیغۂ اشاعت العلوم سے اس تالیف کے لئے امداد جاری کی اور کم و بیش بیس سال کے عرصہ میں مولینا نے کتاب مکمل کی۔ قیام حیدرآباد میں مولینا نے متعدد رسائل اردو میں بھی لکھے جو اہل علم میں مقبول ہوئے۔ مثلاً اصول توارث اور ختم نبوت وغیرہ (باقی اگلے صفحہ پر)

گنجائش کافی ہے۔ نواب مہدی یار جنگ بہادر کی خدمت میں ایک محضر پیش کیا جائے جس کا مسودہ آپ کے پاس بھیج رہا ہوں۔ مقصد یہ ہے کہ آپ چند توثیقی کلمات ثبت فرما کر اسے نواب صدر یار جنگ بہادر کے پاس علی گڈھ بھیجدیں۔ نواب صاحب کو میں بھی لکھ رہا ہوں، آپ بھی لکھئے۔ وہ بھی اس پر دستخط فرمائیں۔ یہ مناسب نہ ہو تو الگ ایک خط نواب مہدی یار جنگ کو اس سلسلہ میں لکھیں۔ اس کے بعد حیدرآباد کے چند ممتاز دستخطوں کے بعد ارادہ ہے کہ نواب صاحب کی خدمت میں ہم لوگ لے جاکر پیش کریں بڑی علمی خدمت انجام پا جائے گی۔ اگر حکومت آصفیہ کی طرف سے اس کی اشاعت کا نظم ہو جائے۔ فقط

نیازمند مناظر احسن گیلانی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) پھر ٹونک واپس چلے آئے، اور ۱۰ رشوال ۱۳۶۶ھ مطابق ستمبر ۱۹۴۷ء کو وفات پائی۔ رحمۃ اللہ علیہ ۱۲

سے مولینا محمود الحسن خاں صاحب ٹونکی کی مشہور تالیف ہے۔ یہ کتاب عربی زبان کے مصنفین کا دائرۃ المعارف (انسائیکلوپیڈیا) ہے جو تقریباً ۳۰ ہزار مصنفین کے حالات اور ان کے مصنفات کے جامع تذکرہ پر مشتمل ہے۔ فاضل مصنف نے کتاب کی ابتدائی دو جلدیں ریاست رام پور کے مشہور کتب خانہ میں بیٹھ کر مکمل کیں اور پوری کتاب ریاست حیدرآباد کے قیام کے زمانہ میں تکمیل کو پہونچی جس میں تقریباً بیس سال کی طویل مدت صرف ہوئی۔ اب تک ۳۱ کی چار جلدیں منظر عام پر آئی ہیں جنھیں حکومت حیدرآباد نے اپنے خرچ سے بیروت میں طبع کرایا۔ جو کتب خانقاہ رحمانیہ مونگیر میں موجود ہے۔ ۱۲

۵ فروری ۱۹۴۳ء - ۹ محرم ۱۳۶۲ھ -

سیدی و سید الہند! ادام اللہ مجدکم، السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

مولانا عبد الباری صاحب کے ادراد کا حال تو آپ کو معلوم ہی ہو چکا، مولوی عبید اللہ[1] صاحب والا مضمون ٹائپ ہو کر آگیا ہے۔ آپ کی خدمت میں اسے بھیج رہا ہوں، اسے ملاحظہ فرما لیجئے، میں اسے ابھی شائع کرنا نہیں چاہتا، بلکہ خیال یہ ہے کہ ایک کاپی اس کی دیوبند بھیج دوں، مولوی طیب[2]، مولانا حسین احمد[3] صاحب و مولوی شبیر احمد[4] صاحب اس کو دیکھ لیں، اور دراصل جس کے لیے میں نے یہ سب کچھ کیا ہے وہ

[1] حضرت مولانا عبید اللہ سندھی ۱۰ مارچ ۱۸۷۲ء کو سیالکوٹ کے ایک سکھ گھرانے میں پیدا ہوئے، سولہ سال کی عمر میں اسلام قبول کیا دار العلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کی، اپنے استاد حضرت شیخ الہند رح کی رہنمائی میں تحریک آزادی وطن میں حصہ لیا آپ ہی کے حکم سے ۱۹۱۵ء میں کابل پہنچے اور وہاں کے انقلاب میں پورا پورا حصہ لیا۔ اسی زمانہ میں انگریزی حکومت نے مولانا سندھی کو ہندوستان سے جلاوطن کیا۔ ۱۹۲۲ء میں ماسکو گئے، اور وہاں سوشلسٹ انقلاب کا بہت قریب سے مطالعہ کیا، پھر ترکی پہنچ کر چار سال تک کمالی انقلاب کا مشاہدہ کرتے رہے۔ وہاں سے حجاز مقدس تشریف لے گئے جہاں ۱۲ برس تک مقیم رہے ۱۹۳۸ء میں ہندوستان واپس آنے کی اجازت ملی۔ ۷ مارچ ۱۹۳۹ء کو ہندوستان واپس تشریف لائے اور زندگی کے آخری لمحے تک اپنی فکر و نظر کی روشنی میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ کے فلسفہ کی اشاعت فرماتے رہے لیکن آپ نے جن خیالات کا اظہار کیا اس سے ان کے قدیم رفقا بھی اتفاق

(باقی صفحہ ۳۲۲ پر)

نہ کر سکے، ۔ ۲۱ اگست سنہ ۱۹۴۴ء کو سفر آخرت فرمایا گیا۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

۱ے مولانا محمد طیب صاحب حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بانی دار العلوم دیوبند کے پوتے ہیں۔ ۱۳۱۵ھ / ۱۸۹۸ء میں پیدا ہوئے، دار العلوم کے ممتاز فاضل اور ۱۳۴۸ھ / ۱۹۳۰ء سے اب تک دار العلوم دیوبند کے کامیاب مہتمم ہیں۔ اور موجودہ دور میں مسلک دار العلوم کے نمائندہ اور ابنائے دار العلوم کے سربراہ ہیں۔ وعظ و خطابت میں اپنی مثال نہیں رکھتے، کئی درجن کتابوں کے مصنف ہیں۔ اور متانت و سنجیدگی میں اپنی مثال آپ ہیں،

۲ے شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سنہ ۱۲۹۶ھ میں بمقام بالا مئو ضلع اناؤ پیدا ہوئے، آپ عالم اسلام کے ممتاز روحانی پیشوا، اکابر دار العلوم دیوبند کے علوم ظاہر و باطن کے حامل، ہندوستان کی جنگ آزادی کے مخلص ترین رہنما، جو تقریباً تیس سال دار العلوم دیوبند کے شیخ الحدیث، اس کے سربراہ اور مسلک دار العلوم کے نمائندہ رہے۔ اور سالہا سال ہند و بیرونِ ہند کے لاکھوں متوسلین و معتقدین کے دلوں پر بادشاہت کی۔ آپ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ارشد خلفاء میں تھے،

۳ے مولانا شبیر احمد عثمانی ۱۳۰۵ھ / ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے۔ دار العلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کی فراغت کے بعد مدرسہ عالیہ فتحپوری دہلی میں صدر مدرس مقرر ہوئے ۱۳۴۶ھ / ۱۹۲۸ء کے اختلاف میں دار العلوم دیوبند سے علیحدہ ہوئے اور مدرسہ ڈابھیل ضلع سورت تشریف لے گئے ۱۳۵۴ھ / ۱۹۳۶ء میں دار العلوم دیوبند کے صدر مہتمم مقرر ہوئے لیکن چند سالوں کے بعد آپ کو پھر دار العلوم سے علیحدہ ہونا پڑا۔ (باقی ص ۳۲۳ پر)

مولوی سعید[۱] اکبر آبادی ہیں، جنھوں نے بلا وجہ اس شخص کی غلط نصرت کا بیڑہ اٹھایا ہے، میں نے ان کو منع بھی کیا تھا، لیکن انھوں نے شاید میرے تعصّب پر اسے محمول کیا، اب

سیاسیات میں جمعیۃ علمائے ہند کے شریک کار رہے۔ پھر مسلم لیگ کے زبردست حامی اور داعی بنے، تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلے گئے، وہاں پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے رکن اور شرعی دستور ساز کمیٹی کے صدر بنائے گئے!

مولانا اپنے علم و فہم کے لحاظ سے اپنے معاصرین میں اچھا مقام رکھتے تھے۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے علوم پر خاص نظر تھی۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن علیہ الرحمہ کے ترجمۂ قرآن پر آپ نے معرکۃ الآراء تفسیری حواشی لکھے جسے اہلِ علم میں شرف قبول حاصل ہوا۔ متعدد چھوٹی بڑی کتابیں لکھیں، آپ کی آخری تصنیف "فتح الملہم" حنفی نقطۂ نظر سے پہلی اور کامیاب شرح ہے۔ اپنے وقت میں تقریر و خطابت کے امام تھے، علمی مسائل کو پوری خطابت کے ساتھ انتہائی موثر طریقہ پر عوام کو سمجھا دینا آپ کا کمال تھا۔

صفر ۱۳۶۹ھ / ۱۹۴۹ء کو بغداد الجدید (بہاولپور) پاکستان میں داعی اجل کو لبیک کہا، جنازہ کراچی لیجاکر دفن کیا گیا۔ رحمۃ اللہ علیہ،

۱ے مولانا سعید احمد اکبر آبادی کا آبائی وطن ... ضلع مراد آباد ہے۔ پیدائش آگرہ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، پھر شاہی مسجد مراد آباد میں، اس کے بعد کئی سال دیوبند سے اور فراغت ۱۳۴۶ھ کی، اور نٹیل کالج لاہور سے مولوی فاضل کیا، پھر ڈابھیل ضلع سورت میں دو سال تک مدرس رہے، وہاں سے دلی آکر مدرسہ عالیہ فتحپوری میں السنۂ مشرقیہ کے استاذ

میں یہ آپ کے پاس بھیجتا ہوں۔ اور پوچھتا ہوں کہ اس قسم کے ارتدادی عقائد کے آدمی کو قتل کرنے کا امکان نہ ہو کہ حکومت نہیں ہے تو کم از کم اس کی تردید تو کرنی چاہیے، لیکن آپ ان ہی کی تائید میں اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ بلکہ بڑی ذمہ داریاں اپنے اوپر لے رہے ہیں، اگر اس مضمون کو دیکھ کر وہ پلٹ گئے، تو فبہا، ورنہ ظاہر ہے کہ پھر میدان میں اترنا ہی پڑے گا، بہرحال اگر سعید احمد صاحب کی سمجھ میں بات آگئی، تو، "برہان"[1] ہی میں کہوں گا، کہ اس مضمون کو اپنے نوٹ کے ساتھ شائع کریں، اور اگر

مقرر ہوئے۔ اسی زمانہ میں ایم۔ اے کیا۔ اور سینٹ اسٹیفنس کالج دہلی میں استاد رہے۔ ۱۹۴۹ء میں مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل ہوئے، دس سال تک اس منصب پر رہنے کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڈھ آگئے۔ اور یہاں ڈین فیکلٹی آف تھیالوجی کے عہدہ پر ممتاز ہیں، جولائی ۱۹۳۸ء سے آج تک مشہور علمی ماہنامہ برہان کے مدیر ہیں، موصوف متعدد کتابوں کے مصنف ہیں جو اہل علم سے سند قبول حاصل کر چکی ہیں۔ ۱۲

[1] ماہنامہ برہان ندوۃ المصنفین دہلی کا ماہانہ علمی اور ادبی رسالہ ہے۔ جو جولائی ۱۹۳۸ء سے پابندیٔ وقت کے ساتھ مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی ادارت میں نکل رہا ہے، اور اپنی خصوصیات کی بنا پر ہندوستان کے علمی رسالوں میں اپنا ایک خاص اور بلند مقام رکھتا ہے۔ ۱۲

وہ راضی نہ ہوئے، اپنی غلطی پر ان کا اصرار باقی رہا، تو پھر کسی دوسرے پرچے میں دے دوں گا، آپ اگر فرمائیں گے تو معارف ہی میں دے دوں گا، لیکن میں چاہتا ہوں کہ پریس میں آنے سے پہلے اصلاح کی ممکنہ کوشش کر لی جائے۔ پریس میں آنے کے بعد ممکن ہے کہ ضد پیدا ہو جائے، اور میں تو صرف اصلاح چاہتا ہوں۔ فقط۔

مناظر احسن گیلانی۔

---

۳ مارچ ۱۹۴۳ء - ۲۶ صفر ۱۳۶۲ھ - حیدر آباد دکن۔

سیدی الکریم! زادکم اللہ عرفانا وقربا۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

یقیناً ہم زمینوں کے حدود سے آپ بہت بلند ہو چکے ہیں، یوں ہی بلندی کیا کم تھی، اور اب تو ماشاء اللہ حکیم الامت مدظلہ العالی کی نیابت وخلافت کی دولت سے سرفراز ہیں۔ چالیس سال تک مولوی شبلی[1] صاحب کی نیابت اور عمر عزیز کے چہل سال کے بعد مولانا تھانوی کی۔ ؎

زندگی کے زندر ہے ہاتھ جنت نہ گئی،

[1] علامہ شبلی نعمانی مئی ۱۸۵۷ء کو موضع بندول ضلع اعظم گڈھ میں پیدا ہوئے۔ مولانا محمد فاروق چریاکوٹی، مولانا ارشاد حسین رام پوری، مولانا احمد علی محدث سہارنپوری اور مولانا فیض الحسن سہارنپوری رحمہم اللہ سے تعلیم حاصل کی۔ علامہ موصوف عالم اسلامی کے مشہور عالم، ادب وتاریخ کے امام اور قدیم وجدید کے سنگم تھے، فاضل گیلانی نے آپ کے بارے میں

عمر بن عبد العزیز[۱۵] رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ یاد آیا۔ خلافت کے زمانہ میں لباس

لکھا ہے کہ وہ بلا شبہ مولانا شبلی قدیم و جدید علمی طبقے کے درمیان ایک برزخی وجود کا مقام حاصل کئے ہوئے تھے" مولانا شبلیؒ نے اُردو کو علمی اور فنی زبان بنایا، بہت سی بیش بہا کتابوں کے مصنف اور سیکڑوں قیمتی مقالات و مضامین کے مرتب ہیں۔ اُردو، فارسی، اور عربی کے اچھے شاعر تھے،

ابتداءً ایم۔ او۔ کالج علی گڈھ میں استاد رہے۔ وہاں سر سید اور پروفیسر آرنلڈ وغیرہم سے استفادے کا موقع ملا، پھر ندوہ اور حیدرآباد وغیرہ میں قیام کیا، ندوہ کی ترقی میں مولانا کی مخلصانہ کوششوں کو بھی بہت دخل ہے۔ آخر میں اعظم گڈھ آکر دار المصنفین کی بنیاد ڈالی اور وہیں ۱۹۱۴ء میں وفات پائی، رحمۃ اللہ علیہ۔

[۱۵] حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ ۶۲ھ میں پیدا ہوئے، ان کی والدہ حضرت فاروق اعظمؓ کی پوتی تھیں، ابتدائی زمانہ مدینہ منورہ میں گذرا، فقہا و علمائے مدینہ سے علوم دینیہ حاصل کیا، علم و فضل اور تفقہ فی الدین میں آپ کا مقام بہت بلند تھا، حضرت انسؓ کا بیان ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہم نے بجز عمر بن عبد العزیز کے کسی اور شخص کے پیچھے ایسی نماز نہیں پڑھی جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز سے زیادہ مشابہ ہو، آپ کی شادی عبد الملک بن مروان کی بیٹی فاطمہ سے ہوئی، آپ اسی خلیفہ کے زمانہ میں ۸۶ھ سے ۹۳ھ تک مدینہ کے امیر رہے۔ اور وہاں فقہا کی ایک مجلس ترتیب دی تھی جن کے مشورہ سے اہم امور انجام دیا کرتے تھے، حجاج بن یوسف کی شکایت پر ۹۳ھ میں مدینہ کی امارت سے

(باقی ص ۳۲۷ پر)

معزول کئے گئے۔ جب ولید نے اپنے بھائی سلیمان کے بجائے اپنے بیٹے کو ولیعہد بنانا چاہا تو آپ نے شدت کے ساتھ مخالفت فرمائی۔ جس کی پاداش میں تین سال تک قید و بند کی تکلیفیں برداشت کیں، سلیمان بن عبد الملک نے انہیں اپنا وزیر اعظم بنایا اور اپنے بعد ان کی خلافت کی وصیت لکھی، صفر ۹۹ھ میں آپ خلیفہ ہوئے، اور لوگوں کے بیعت کرنے کے بعد جب آپ گھر پہنچے تو داڑھی آنسوؤں سے تر تھی، بیوی نے گھبرا کر وجہ پوچھی تو جواب دیا کہ آج میری گردن پر امت محمدی کا بوجھ ڈال دیا گیا ہے، اس لیے خوف ہے کہ قیامت میں پرسش ہو اور میں جواب نہ دے سکوں۔ آپ کے مبارک و مسعود دور میں لوگوں نے حضرات ابو بکر صدیق و عمر فاروق رضی اللہ عنہما کی خلافت کا منظر دوبارہ اپنی آنکھوں سے دیکھا، آپ دنیا کے سب سے بڑے شہنشاہ تھے، سلطنت کے حدود سندھ، پنجاب، بخارا، ترکستان، چین سے لے کر مراقش اندلس اور فرانس تک وسیع تھے۔ اتنی وسیع اور عظیم الشان سلطنت میں ہر جگہ یکساں امن و سکون، اور عدل و انصاف تھا، آپ کے زمانہ میں لوگوں نے بہت بڑی تعداد میں اپنی خوشی سے اسلام قبول کیا، نو مسلموں کی یہ کثرت دوسروں کے دور میں نظر نہیں آتی۔ اپنے زمانۂ خلافت میں سڑکیں بنوائیں، اور جا بجا مدرسے اور شفا خانے کھولے، خلافت سے پہلے آپ کا رہن سہن بہت اونچا تھا۔ لیکن خلافت کے بعد یہ شان تھی کہ ممبر پر خطبہ دے رہے ہیں اور کپڑے میں پیوند لگے ہوئے ہیں، آپ کا زمانۂ خلافت صرف ڈھائی سال ہے، آپ کا دور "خلافتِ راشدہ" میں شمار کیا گیا ہے۔ رجب ۱۰۱ھ میں رحلت فرمائی۔ ۱۲۔

کی قیمت چند درم سے آگے نہ بڑھی۔ پوچھنے والے نے ولید[1] اور عبدالملک[2] کی گدی پر بیٹھنے والے سے پوچھا، مشہور جواب ہے کہ تمنا کی مدینہ کی ولایت کی، پوری ہوئی۔ فاطمہ بنت عبدالملک سے شادی کی، پوری ہوئی، خلافت کی، پوری ہوئی۔ اب جنت کی تمنا کی باری ہے۔ صرف اس کا سامان ہے۔ آپ نے بھی وہی کیا۔ ولمثل

هذا فليعمل العاملون بارك الله فيكم وعليكم۔

---

[1] ابوالعباس ولید بن عبدالملک بن مروان ۵۰ھ میں پیدا ہوا۔ اور ۳۶ سال کی عمر میں تخت خلافت پر بیٹھا علم و فضل سے بے بہرہ اور پڑھنے لکھنے میں ناقص تھا۔ ولید کے عہدِ خلافت میں سندھ، ترکستان، سمرقند و بخارا، اندلس، ایشیائے کوچک کے اکثر شہر و قلعے اور بعض جزیرے حکومتِ اسلامی میں داخل ہوئے۔ ولید نے رفاہِ عام کے بہت سے کام کئے۔ سڑکیں بنوائیں شہر تعمیر کئے، مدارس، سرائیں، شفا خانے کھولے۔ اور رعایا کے امن و امان کے لیے بڑا اچھا نظم کیا۔ اس کے دور میں کہیں فتنہ و فساد یا داخلی انتشار کا پتہ نہیں تھا۔ ولید ہی کے دور میں قتیبہ بن مسلم باہلی، محمد بن قاسم ثقفی، موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد فاتح اندلس جیسے بڑے بڑے مدبر جرنیل نمایاں ہوئے۔ ۱۵ جمادی الثانی ۹۶ھ مطابق ۲۵ فروری ۷۱۵ء میں ۴۵ سال چند ماہ کی عمر میں نو سال ۸ مہینے خلافت کرنے کے بعد شام کے ایک شہر دیر مران میں وفات پائی۔ ۱۲۔

[2] عبدالملک بن مروان مشہور اور با اقبال اموی خلیفہ ۲۳ھ میں پیدا ہوا، اس نے تمام عالم اسلامی کو ایک مرکز سے وابستہ کرنے میں کامیابی حاصل کی، اسی کے زمانہ

لیکن عریضہ نیاز کے ساتھ اتنی بے اعتنائی کہ ملنے کے باوجود جواب سے محروم رکھا گیا، رسید کی خبر بھی غیر کے ہاتھ پہنچائی گئی۔ اور یہ دارالمصنفین کی رکنیت کا کیا قصہ ہے۔ بجٹ کے ملنے سے پہلے اس کا علم بھی کسی ذریعہ سے نہ ہوا۔ سمجھ میں نہ آیا کہ کس خصوصیت کو میرے اس انتخاب میں دخل ہے۔ نظر عنایت نگاہ کرم کے سوا اور کس چیز کا تصور کروں۔ حسب الحکم دستخط کر کے واپس بھیج رہا ہوں۔

میں اموی حکومت کی جڑیں مضبوط ہوئیں، اگرچہ اس کام میں اس نے سختی اور تشدد بھی برتا، عبدالملک کے مزاج میں درشتی اور سخت گیری کے ساتھ معقول پسندی بھی تھی۔ اس نے سب سے پہلے اسلامی سکے کی ابتدا کی اور دارالضرب (ٹکسال) قائم کیا۔

اس کی سب سے بڑی خطا یہ ہے کہ حجاج بن یوسف کو استحقاق سے زیادہ اختیارات دے کر ظلم و تعدی کا موقع بہم پہنچایا۔ عبدالملک ذاتی طور پر علم و فضل اور عظمت و شجاعت میں اونچا مقام رکھتا تھا۔ سولہ سال اس نے حکومت کی اور شوال ۸۵ھ میں وفات پائی، مرتے وقت اس نے اپنے بیٹوں کو بلایا اور وصیت کی کہ "میں تم کو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنے کی تاکید کرتا ہوں، کیونکہ تقویٰ ہی بہترین لباس ہے، اور بہترین جائے پناہ ہے، تمہارے بڑوں کو چاہیے کہ چھوٹوں پر شفقت، اور چھوٹوں کو لازم ہے کہ بڑوں سے ادب و تعظیم کے ساتھ پیش آئیں، مسلمانوں کی رائے اور مشورے کی قدر کرنا، اور مخالفت سے بچنا، کیونکہ یہ وہی جبڑے ہیں جن سے تم چلاتے ہو اور وہی دانت ہیں جن سے تم توڑتے ہو عقلمندوں پر احسانات کرو کیونکہ وہ اس کے مستحق ہیں۔"

"محضر نامہ" کو شیروانی صاحب کے پاس آپ نے روانہ نہیں فرمایا، ان کا خط آیا تھا کہ انتظار ہے، مگر آیا نہیں، نہ بھیجا ہو، تو اب بھیج دیجئے۔ جہاں تک عجلت ممکن ہو کرنا چاہیے کہ ؎

آفتہا است در تاخیر طالب رازیاں وارد

اور کیا عرض کروں، جی رہا ہوں، آپ کو اور مولانا عبدالباری کو دیکھتا ہوں۔ شعر یاد آتا ہے۔ ؎

یارانِ تیز گام نے محمل کو جالیا — ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

اور کیا عرض کروں، مولانا عبدالباری کا حال حدود رشک سے بھی آگے نکل گیا، اب میرے نزدیک تو وہ اچھے خاصے صاحبِ دل بزرگ ہیں۔ کثر اللہ امثالہم۔

دیکھئے دارالمصنفین مجھے اپنی رکنیت کے بعد بھی اپنے اندر آنے کی اجازت دیتا ہے یا نہیں، اب تک تو۔ ؏

توبرونِ دریچہ کردی ؟ کہ درونِ خانہ آئی

کے ساتھ ہی ڈانٹ بتاتا رہا ہے۔

میزانیہ دیکھکر بحمداللہ طبیعت خوش ہوگئی، لیکن یہ دارالمصنفین کا قومی واجتماعی خزانہ ہے۔ ہمارے احباب میں تو ایسے متعدد حضرات ہیں، جن کے شخصی دفائن اس سے اضعافاً مضاعفۃً بڑھے ہوئے ہیں، سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ یہ کیسے ہوتا ہے، ساری زندگی اسی تمنا میں کٹ گئی۔ لیکن اللہ میاں نے اس تجربہ کا

موقع نہ دیا۔

میں نے کبھی عرض کیا تھا کہ معاشیاتی مسائل کے متعلق کچھ چیزیں جمع ہوگئی ہیں۔ پہلے معارف میں بھیجنے کا خیال تھا، لیکن بعد کو دل سے اتر گیا، مسودہ کو ڈال دیا تھا، حال میں کالج کے مجلۂ علمیہ میں مضمون نہیں تھا، بھرتی کے لیے اسی کے ایک باب کو دے دیا تھا، میں نے آپ کے پاس بھجوایا تھا، ملا ہوگا، چند چیزیں ادھر خاص تیار ہوئیں لیکن ایسے وقت میں۔ ؏۔

چوں دور خسرو آمد مے در سبو نہ ماندہ۔

کاغذ و طباعت کی دشواریاں ایسی ہیں کہ ان کی اشاعت تقریباً ناممکن ہے۔

نگرامی[1] صاحب کا ایک کارڈ میرے قرآنی جنون کے متعلق آیا تھا، جواب تیار کر رہا ہوں انشاءاللہ بھیجوں گا۔

مولانا مسعود علی صاحب کی خدمت میں سلام فرمادیجئے اور مبارکباد۔

مناظر احسن گیلانی۔

---

[1] مولانا محمد اویس ندوی نگرامی ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوئے۔ ندوہ کے فاضل ہیں، کچھ دنوں تک دارالعلوم دیوبند جاکر درسِ حدیث میں شرکت کی۔ اب دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تدریس کی خدمات انجام دے رہے ہیں، علامہ ابن قیم کے تفسیری نکات جو مختلف کتابوں میں پھیلے ہوئے ہیں انہیں جمع اور مرتب کیا، جو تفسیر ابن قیم کے نام سے شائع ہو چکا ہے، اس کے علاوہ تعلیم القرآن، اور بلاغت قرآن پر ایک کتاب عقد الجمان کے نام سے لکھی ہے، جو ابھی طبع نہیں ہوئی۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا المدنی کے مجاز ہیں۔ ۱۲

۱۵ مارچ ۱۹۴۳ء حیدرآباد ، سیدی الامام ، دمتم بالعافیۃ والسلام۔
۸ ربیع الاول ۱۳۶۲ھ ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

الحمد للہ الذی اسبغ علیکم نعمۃ ظاھرۃ وباطنۃ ، لیجئے حق تعالیٰ نے ایک ہی سال میں ظاہری و باطنی نعمتوں سے سرفراز فرمایا، ہندوستان کے دونوں علمی مرکزوں کو اتفاق کرنا پڑا، کہ جن نیک بزرگوں نے جس نصب العین کو پیش نظر رکھ کر ندوۃ العلماء[1] کے دارالعلوم کی بنیاد رکھی تھی بالآخر وہ اسی نتیجہ تک اپنے خرچوں کو پہنچا کر رہا. آن واحد میں دیوبند[2] اور علیگڈھ دونوں نے اس کی تصدیق کی، آپ کو بھی مبارک ہو

[1] خصوصیت کے ساتھ تیرھویں صدی ہجری میں ہندوستان کے مسلمان اور ان کا دین جن حالات اور خطرات میں مبتلا تھا اسے چند مخلص علماء نے محسوس کیا۔ جو عقائد میں پختہ، علم و عمل میں راسخ اور دینی مقام و مرتبہ کے اعتبار سے بہت بلند، نکتہ رس اور دوربین تھے۔ اس مخلص جماعت کے قافلہ سالار جماعت علماء و مشائخ کے نامور اور ممتاز فرد حضرت مولانا سید محمد علی مونگیری قدس سرہٗ تھے۔ جو استاذ العلما مولانا لطف اللہ صاحب علی گڈھی کے مایۂ ناز شاگرد اور اویس زمانہ حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کے خلیفہ، مجاز تھے۔ ان حضرات نے دینی تعلیم، عربی مدارس اور مسلمانوں کے عام اخلاقی و ثقافتی مسائل پر غور کیا۔ اور ۱۳۱۱ھ میں مدرسہ فیض عام کانپور کے جلسۂ دستار بندی کے موقع پر ندوۃ العلماء کا قیام عمل میں آیا۔ اور مولانا سید محمد علی قدس سرہٗ اس کے ناظم مقرر کئے گئے۔ اس اجلاس میں ہندوستان کے تقریباً سبھی نامور علماء شریک تھے۔ اور کوئی مکتب خیال ایسا نہ تھا جس کی نمائندگی نہ ہوئی ہو۔

دیتا ہوں اور ان پاک جانوں کے نام سے فاتحہ خیر پڑھتا ہوں، جن پر بدگمانیاں کی گئیں، لیکن بالآخر وہی سامنے آیا جو دوراندیشوں کے اس مقدس گروہ نے سوچا تھا، دین کی بھی توثیق ہو گئی، اور علم کی بھی، خدا کرے ندوۃ اپنے نتائج کو آئندہ بھی اسی مثال کا تابع رکھے، وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

بچوں کی تقریب سے انشاء اللہ فراغت ہو چکی ہوگی، فبارک اللہ لکم ولہم بالرفاہ والبنین۔ واللہ جعل لکم من انفسکم ازواجا وجعل لکم من

ندوہ کے قیام کا مقصد مسلمانوں اور خصوصاً علماء کو ایک محاذ پر لانا۔ تنگ نظری اور فرقہ بندی کو دور کرنا، طریقۂ تعلیم، نصاب تعلیم کی اصلاح اور نظام تعلیم میں ایسا خوشگوار انقلاب جس سے علماء موجودہ بدلے ہوئے زمانہ میں ملک و ملت کے لیے کارآمد ہو سکیں۔ اور جدید و قدیم تعلیم میں ہم آہنگی پیدا کرنا۔ انہیں مقاصد کو لیکر یہ مخلص جماعت آگے بڑھی ۱۳۱۱ء میں ندوۃ العلماء کا پہلا اجلاس کانپور میں منعقد ہوا۔ ۱۳۱۶ھ میں دارالعلوم کا قیام عمل میں آیا۔ تاکہ دوسرے مدارس کے لیے نمونہ کا کام دے سکے۔ ۱۳۲۰ھ تک ندوۃ العلماء کے ناظم مولانا سید محمد علی مونگیری رہے۔ پھر مولانا مسیح الزماں خاں۔ مولانا خلیل الرحمٰن سہارنپوری۔ مولانا سید عبدالحئی رائے بریلوی وغیرہ کا انتخاب اسی منصب پر ہوتا رہا۔ اور اس وقت ڈاکٹر حکیم مولوی سید عبدالعلی صاحب ندوہ کے ناظم ہیں۔

[2] دارالعلوم ندوۃ العلماء کی تعلیمی نگرانی مولانا شبلی نعمانی کے سپرد ہوئی جن کی بدولت دارالعلوم میں علمی فضا اور تصنیفی ذوق پیدا ہوا۔ آپ کے بعد علامہ سید سلیمان ندوی نے اس

انا دا جکم بنین و حفدۃ و رزقکم من الطیبات۔

معلوم نہیں دسنہ میں کب تک قیام رہے گا۔ اپریل میں میرا کالج بھی بند انشاء اللہ ہوگا، اگر آپ حسب دستور گرمیوں میں گھر ہی رہے تو قدم بوسی کی سعادت انشاء اللہ حاصل ہوگی۔ آپ نے تو دیوبندیت کے امتیاز پر بھی قبضہ کرلیا اب ہم غریبوں کے پاس کیا رہ گیا ہے بجز اس کے۔

ع تو شاد گفتۂ لبفرماں دہی ومن بغلامی

خیال آتا ہے اور اس کو آنا چاہیئے، لیکن حافظ کان میں کہتے ہیں۔ ؎

توبہ تقصیر خود افتادی ازیں در محروم | از کہ می نالی و فریاد چرا می داری
اے دل خام شرمے ازیں قصّہ بدار | کار نا کردہ چہ امید عطامی داری

اور سچ تو یہ ہے جیسا کہ میرے چھوٹے بھائی مظہر سلمہ نے کہا کہ "سید صاحب تو ہمیشہ سے وہی تھے جس کی تصدیق مولانا تھانوی (متع اللہ المسلمین بطول بقائہم) نے فرمائی، وہ باہر سے زبردستی کچھ دن کے لیے وہ بنے رہے جو وہ نہیں تھے۔"

علی گڑھ کے امتیاز سے تھانہ بھون کے امتیاز کا دل پر زیادہ اثر اور وزن ہے۔ لیکن بعض روایتوں میں پڑھا ہے "فاروق" کا خطاب فاروقِ اعظم کو یہودیوں

ذمہ داری کو بحسن وخوبی انجام دیا۔ اور اب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی معتمد تعلیم ہیں۔ اور آپ ہی کی سرپرستی میں اس وقت دارالعلوم ندوۃ العلماء ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ ۱۲۔

⁂ ⁂ ⁂

سے ملا تھا۔ غالباً ابن سعد[1] میں ہے۔ اس سے تسلّی ہوئی، آخر علی گڈھ کا گروہ کیا یہودیوں سے بھی زیادہ ہم سے دور ہے۔ ہاں لیجیے، یہ بھول ہی گیا، خاکسار کی ہرزہ سرائیوں کی جو مجلہ علمیہ میں شائع ہوئی ہے آپ نے تعریف فرمائی ہے، معارف کے قابل ان کو سمجھتا تو کیا پہلے نہ بھیجتا۔ مگر جب زنگی کو کافور آپ قرار ہی دیتے ہیں تو اشاعت کے لیے پوچھنے کی حاجت ہے؟ اس کے دوسرے اجزاء چند متفرق رسالوں میں بانٹ دیئے گئے ہیں، شایع ہونے کے بعد خدمت گرامی میں حاضر ہوں گے۔

الداعی لفلاحکم وصلاحکم۔ خاکسار مناظر احسن گیلانی۔

---

[1] محمد بن سعد کاتب الواقدی کی تالیف کتاب الطبقات الکبیر ہے جو عام طور پر طبقات ابن سعد کے نام سے مشہور ہے۔ کتاب کو ابتداءً قسم اوّل اور قسم ثانی پر تقسیم کیا گیا ہے، اور پھر ہر قسم کے متعدد اجزاء ہیں۔ اس طرح کتاب بارہ تیرہ جلدوں پر مشتمل ہے، ہر جز مخصوص اشخاص یا جماعت کے حالات پر ہے، مثلاً ابتدائی چند اجزاء سیرۃ نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اور آپ کے مغازی، مرض، وفات، دفن اور مراثی وغیرہ پر ہیں، ایک جلد ان مہاجرین پر ہے جو بدر میں شریک تھے، ایک جلد ان صحابہ کے حالات پر ہے جو فتح مکہ سے پہلے اسلام لائے، بعض اجزاء تابعین کے حالات پر ہیں، بعض میں صرف عورتوں کا حال لکھا ہے، واقدی کی طرف منسوب ہوتے ہوئے بھی کتاب بڑی قیمتی، کارآمد اور صحابہ اور تابعین کے حالات معلوم کرنے کا اہم ذریعہ ہے۔ ۱۲۔

۱۳ مئی ۱۹۴۳ء مطابق ۷ جمادی الاول ۱۳۶۲ھ

الی السید الدکتور الہمام ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

مایوسی کے بعد گرامی نامہ سے سرفرازی ہوئی، جواب اسی وقت دیتا، لیکن بہار میں بھی مجھے میلاد خوانی سے فرصت نہیں ملتی، بہرکیف، استھانوں کے بعد بہار والوں نے پکڑا، صحت ایسی نہیں رہی ہے کہ تقریروں کا بار زیادہ برداشت کرسکوں، چند تقریروں کے بعد ہی گر جاتا ہوں۔ آج جواب آپ کے گرامی نامہ کا دے رہا ہوں۔

ندوہ کی حالت بڑی افسوسناک ہے۔ شیروانی صاحب کا بھی ایک خط آیا تھا، اب کبر سنی نے ان کو اس قابل نہیں رکھا ہے کہ علمی دلچسپیوں کو اسی پیمانہ پر باقی رکھیں، احتشام علی[۱] صاحب کی وفات کا ناگہانی حادثہ ندوہ کے لیے ایک ناقابل تلافی

---

[۱] منشی احتشام علی صاحب، منشی امتیاز علی صاحب رئیس سابق وزیر اعظم بھوپال کے صاحبزادے قصبہ کاکوری ضلع لکھنؤ میں ۱۸۶۹ء مطابق محرم ۱۲۸۶ھ میں پیدا ہوئے، پھر شہر لکھنؤ میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ بڑی جائداد کے مالک اور وضعدار رئیسوں میں تھے، مسلسل چالیس سال تک لکھنؤ ڈسٹرکٹ بورڈ کے چیرمین رہے، صوبائی مسلم لیگ کے صدر اور کل ہند مسلم لیگ کے نائب صدر بھی تھے، مسلم یونیورسٹی کورٹ علی گڈھ کے ممبر اور ایک عرصہ تک دار العلوم ندوۃ العلماء کے معتمد مال رہے، شرافت سنجیدگی، مہمان نوازی ورثہ میں ملی تھی، آپ پر دینداری کا اثر شباب ہی سے تھا، اعلیٰحضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن قدس سرہٗ العزیز سے بیعت کا شرف حاصل تھا اور اس آستانے سے ایسی خصوصیت تھی کہ ساری عمر حضرت علیہ الرحمہ کے عرس کے ذمہ دار رہے۔

نقصان ہے۔ ان کی جگہ کس کا انتخاب کیا جائے؟ میرے پاس بھی ایک گشتی چھٹی آئی ہے، ضرورت ایسے آدمی کی ہے، جو زمینداری وغیرہ کے معاملات کا بھی تجربہ رکھتا ہو، کیا احترام علی[۱] صاحب ان کی قائم مقامی نہیں کرسکتے؟ اور تو جتنے نام ہیں، ان میں یا تو پیر فرتوت ہیں، مثلاً نسیم[۲] صاحب، بعض صرف مُلّا ہیں، اور بعض ادبی کاروبار والے

خود بیٹھ کر کھانا پکواتے اور تقسیم کراتے۔ اپریل ۱۹۴۳ء میں وصال فرمایا۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

[۱] الحاج منشی احترام علی صاحب منشی احتشام علی صاحب مرحوم کے صاحبزادے ہیں۔ فروری ۱۸۹۶ء میں اپنے وطن قصبہ کاکوری ضلع لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ایم۔ اے۔ او کالج علی گڈھ میں آٹھ سال تعلیم حاصل کی۔ آپ کی قومی زندگی کا آغاز ۱۹۲۰ء سے ہوتا ہے، برابر دینی اور قومی تحریکوں میں آپ نے شرکت کی، مسلم لیگ میں بھی شریک ہوئے، لیکن پھر ہندو مسلم اتحاد کی خاطر آپ نے مسلم لیگ چھوڑ کر کانگریس میں شرکت کی، چھبیس ۲۶ سالوں سے ڈسٹرکٹ بورڈ کے ممبر ہوتے چلے آرہے ہیں، اعزازی اسپشل مجسٹریٹ ہیں، لکھنؤ ضلع انسٹرن کانسل کے ممبر ہیں۔ دار العلوم ندوۃ العلماء کے معتمد مال ہیں، اور متعدد دینی اور قومی اداروں میں کہیں ممبر اور کہیں عہدیدار کی حیثیت سے حصہ لے رہے ہیں۔ شرافت، وضعداری اور انسان دوستی میں اپنے والد مرحوم کے سچے جانشین ہیں۔ ۱۲

[۲] محمد نسیم صاحب وکیل ضلع بارہ بنکی کے رہنے والے چودھریوں کے خاندان کے ممتاز فرد اور لکھنؤ میں اپنے زمانہ کے سب سے بڑے وکیل تھے۔ مزاج میں سلامت روی اور دینداری ابتداء ہی سے تھی، مولانا وارث حسن صاحب کٹرہ مانک پور ضلع الہ آباد سے مرید تھے۔

حضرات ہیں، بہرحال غور کر رہا ہوں، رائے کا رجحان جس کی طرف ہوگا، لکھ کر بھیج دونگا کاش! اتنا وقت ہوتا کہ آپ حضرات کے رجحانوں سے واقفیت حاصل ہوتی، اب دیکھئے، ندوہ کیا ہوتا ہے۔ جہاں تک بہار وغیرہ میں آئے ہوئے طلبہ سے معلوم ہوا عمران[ف۱] خانصاحب کے اکثر حضرات شاکی نظر آئے۔ ان کے بیان سے محسوس ہوا کہ عمران خاں کو ایک جنگی صف کا اچھا ناظم یہ لوگ تصور کرتے ہیں لیکن درسگاہ کی نظامت کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

زیارت حرمین شریفین سے بھی مشرف ہوئے، ۱۹۱۰ء میں یو۔ پی کونسل کے ممبر چنے گئے، ندوۃ العلماء سے خاص تعلق رکھتے تھے، تحریک مدح صحابہ اور مسلم لیگ کے سرگرم کارکن رہے ۱۹۵۳ء میں انتقال فرمایا۔ ۱۲

ف۱ مولانا حافظ محمد عمران خانصاحب بھوپال کے رہنے والے اگست ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، اور جامعہ ازہر مصر کے فاضل ہیں۔ ان کے پڑھنے کے زمانہ میں راقم الحروف بھی ندوۃ العلماء ہی میں زیر تعلیم تھا، موصوف پہلے ندوہ کے نائب مہتمم اور پھر اہتمام کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ ضابطہ کے پابند اور نظم کی صلاحیت کے مالک، طبیعت اور جسم دونوں کے لحاظ سے خالص پٹھان، ایک عرصے تبلیغی کاموں میں بھی غیرمعمولی دلچسپی لیتے تھے مدھیہ پردیش میں تبلیغی جماعت کے کاموں کو منظم کیا۔ اور نئے طریقوں اور مضبوط اصولوں پر اس کی تشکیل کی۔ بھوپال میں ایک دیرینہ شاہی مسجد کو مدرسہ اور کتب خانہ سے ایسا آباد کیا کہ سبحان اللہ، راقم الحروف نے دیکھکر بے ساختہ کہا کہ اور کچھ ہو یا نہ ہو، مولانا عمران خانصاحب نے جنت میں اپنا گھر تو بنا ہی لیا۔ ۱۲

معلوم نہیں آپ کے دفتر میں دیوبند کا رسالہ دارالعلوم[ف۱] آتا ہے یا نہیں۔ اپنی معاشی کتاب کا مقدمہ میں نے اسی رسالہ کو دیدیا تھا، اگر آتا ہو تو منگوا کر ضرور دیکھئے۔ طباعت کی فاحش غلطیاں رہ گئی ہیں، افسوس ہوتا ہے کہ ایک مرکزی درسگاہ کے مجلہ میں قرآنی آیتیں بھی صحیح نہیں چھپ سکتی ہیں۔

آج کل ایک مکروہ مشغلہ میں پھنس گیا ہوں، ابوالاعلیٰ[ف۲] صاحب مودودی نے اسفار اربعہ کے بعض حصوں کا ترجمہ اپنے قیام حیدرآباد کے زمانہ میں لے لیا تھا، لیکن اس فن سے

ف۱ رسالہ دارالعلوم فاضل گیلانی ہی کے مشورہ سے ۱۳۶۰ھ میں جاری ہوا، یہ مرکز علوم اسلامیہ دارالعلوم دیوبند کا ترجمان ہے، سب سے پہلے اس کے مدیر مولانا عبدالوحید صاحب غازی پوری تھے، پھر قاضی خلیق احمد صاحب صدیقی، اور مولانا عبدالحفیظ صاحب بلیاوی کی ادارت میں نکلتا رہا۔ ان دنوں مولوی سید محمد ازہر شاہ صاحب کے نظم میں شایع ہو رہا ہے ۱۲۔

ف۲ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی (غالباً ۱۹۰۳ء میں پیدا ہوئے) مشہور فاضل اور اہل قلم، نئے انداز میں مسائل و معلومات کی تعبیر میں بلند مقام رکھتے ہیں، پہلے دارالترجمہ حیدرآباد دکن سے متعلق تھے، پھر اخبار "الجمعیۃ" دہلی کے مدیر ہوئے۔ اپنا ایک رسالہ ترجمان القرآن کے نام سے نکالا جو مقبول ہوا، اپنے بعض مخصوص خیالات کے ماتحت "جماعت اسلامی" کے نام سے ایک جماعت بنائی، اور اچھا لٹریچر تیار کیا، دل آویز تحریروں کے ذریعہ کچھ لوگ مولانا کے گرد جمع ہوگئے، اور حلقۂ اثر وسیع ہوا، تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلے گئے، وہاں بھی "جماعت اسلامی" کے امیر کی حیثیت سے کام کرتے رہے، فتنۂ قادیانیت کا مقابلہ کیا، اور قید و بند کی

بالکل کورے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ، اول سے آخر تک، ترجمہ غلط در غلط ہوگیا ہے، دار الترجمہ نے میرے حوالے کیا ہے کہ اس کی تصحیح کروں، تجربہ سے معلوم ہوا کہ تصحیح کیا ہو گی، الگ ترجمہ کی حاجت ہے تاہم درست کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ بہار کا آم آپ کا منتظر ہے، خوشبو ہی کے لیے سہی، شاید آپ کی زیارت میسر آجائے۔

فقط مناظر احسن گیلانی۔

مصیبتیں جھیلیں، مولٰنا کے خیالات اور "جماعت اسلامی" کے نظریات سے مسلمانوں کا سواد اعظم اور بالخصوص دینداروں کا حلقہ اور علمائے کرام کی جماعت متفق نہیں۔

"جماعت اسلامی" دین کو ایسے انداز میں پیش کرتی ہے، جس سے خلف کا تعلق سلف سے، اور لاحق کا رشتہ سابق سے باقی نہ رہے، اور آزادئ فکر کے نام سے اسلامی معاملات و مسائل میں ایسی راہ نکل آئے جس سے ہر شخص صرف قرآن و حدیث سامنے رکھ کر، اور سلف حتیٰ کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بھی بے نیاز ہو کر صرف اپنی سمجھ کے بھروسہ پر من مانی باتیں کر سکے۔ ۱۲-

۲؍ اگست ۱۹۴۳ء۔ حیدر آباد دکن،

۳۰ ؍ رجب ۱۳۶۲ھ سیدی المحترم! ادام اللہ مجدکم۔

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ،

خدا جانے آپ کہاں ہیں، دلی کی گلیوں میں آپ کو ڈھونڈا، اس لیے ڈھونڈنا تھا کہ مل کر روؤں گا، اسی یتیمی پر، جو باپ کے مرنے کے بعد پھر دہرا گئی، مفتی[۱] صاحب سے معلوم ہوا کہ آپ کو بھوپال میں روک لیا گیا، دار العلوم[۲] دیوبند کی مجلس شوریٰ

---

[۱] مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی ۱۳۱۹ھ / ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے۔ ظفر الحق تاریخی نام ہے اور دیوبند وطن حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے ہیں۔ ۹ سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا۔ ۱۳۴۱ھ میں دار العلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی اور امتحان میں اول آئے۔ ۱۹۲۰ء سے برابر قومی تحریکوں میں حصہ لیا۔ ۱۳۴۴ھ میں جبکہ دار العلوم دیوبند میں مشہور اصلاحی اسٹرائک ہوئی تھی، اُس وقت آپ دار العلوم میں درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ آپ نے بھی اسٹرائک میں شرکت کی نتیجہ میں دار العلوم سے الگ ہو کر ڈابھیل چلے آئے یہاں پانچ سال تک مفتی و مدرس رہے۔ پھر پانچ سال کلکتہ میں رہ کر تفسیر، افتاء اور تبلیغ کی خدمات انجام دیں۔ اسی دور میں ندوۃ المصنفین کے قیام کی تحریک ہوئی۔ چنانچہ ۱۹۳۸ء میں یہ ادارہ قائم ہوگیا۔ مفتی صاحب اس وقت سے آج تک اس ادارے کے ناظم اور روح رواں ہیں اور یہ آپ ہی کی حسن کارکردگی کا نتیجہ ہے کہ ۱۹۴۷ء کی قیامت خیز تباہی کے باوجود ندوۃ المصنفین ملت کی شاندار تعمیری خدمت کر رہا ہے۔

موجودہ زمانہ میں آپ کی خدمت کا حلقہ صرف ادارہ ہی میں محدود نہیں بلکہ دارالعلوم دیوبند کی شوریٰ، جمعیۃ علماء ہند کی مجلس عاملہ کے اہم رکن کی حیثیت سے بھی آپ قومی خدمات انجام دینے میں مشغول ہیں۔ ۱۲۔

٥٢ دارالعلوم دیوبند ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء کو ایسی فضا میں قائم کیا گیا جب کہ ہندوستان پر انگریزی حکومت کے پنجے پوری طرح مضبوط ہو چکے تھے، عیسائی مشنریوں کا سیلاب پورے ہندوستان میں پہنچ چکا تھا، انگریزی تعلیم پوری قوت سے ہندوستان میں پھیلائی جا رہی تھی، اور یورپ یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ ہندوستان کے جسم کے ساتھ ساتھ تعلیم کے ذریعہ اور مشنریوں کے واسطے سے اس کی روح پر بھی قبضہ کر لیا جائے، دارالعلوم دیوبند انتہائی کس مپرسی کی حالت میں قائم ہوا، پہلے سال صرف چار اساتذہ اور اٹھہتر طلبہ تھے، لیکن حق تعالیٰ کو اسے پوری دنیا میں علوم اسلامیہ کا مرکز بنانا تھا۔ اور اس کے ذریعہ دنیا کے گوشہ گوشہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام پہنچانا تھا، اس لیے چند ہی سالوں میں طلبہ کی تعداد دہائیوں سے آگے بڑھ کر سیکڑہ تک پہنچی، چنانچہ ۱۳۳۲ھ میں اساتذہ اکیس اور طلبہ ۵۶۲ تھے، اور تقسیم ہند سے کچھ پہلے یعنی ۱۳۶۶ھ میں اساتذہ چالیس اور طلبہ ۱۴۴۲ تھے، تقسیم ہند اور اس سے زیادہ ویزا اور پاسپورٹ کا اثر دیوبند پر پڑا چنانچہ ۱۳۷۳ھ میں طلبہ کی تعداد گھٹ کر ۱۳۹۱ ہو گئی، لیکن پھر تقسیم سے بچے ہوئے ہندوستان ہی نے اس کمی کو پورا کیا، اور اس وقت دارالعلوم دیوبند میں ۱۳۳۲ طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ اب تک دارالعلوم سے تقریباً چھ ہزار حضرات فارغ ہو چکے ہیں، اور ہر ملک میں پھیل چکے ہیں، اور ملک کی قومی، دینی،

میں شریک ہونے کے لیے دیوبند گیا تھا، گیا معلوم تھا کہ دیوبند کی مجلس ماتم میں شریک ہونا میرے لیے مقدر ہو چکا ہے[١]۔ راستہ میں معلوم ہوا تھا کہ آپ بھی بھوپال آئے ہوئے ہیں۔ غالباً دلّی میں، بہر حال آپ کو دہ غم مبارک ہو، جو انشاء اللہ سرمایۂ نشاط و سرور ہے، بڑے بلند اختر آپ نکلے، وقت سے پہلے جاگے، ٹھیک جس وقت مجلس شوریٰ کا اجلاس شروع ہوا۔ دارالعلوم میں جماعتِ دیوبندیہ کے اس ستون اعظم کے انہدام کی خبر مدرسہ پہنچی جو بحمد اللہ انہدام میں تعمیر ہے۔ لیکن دنیا والوں کے لحاظ سے انہدام ہی سمجھا گیا، حیدرآباد جب واپس ہوا تو مولانا عبدالباری صاحب کو بہت متاثر پایا، تقریباً نیم جنونی حالت میں، مبارک ہے یہ جنون، خدا ہی جانتا ہے آپ کس حال میں ہوں گے، خواجہ ہمارے تو مجذوب تھے ہی، سنا ہے کہ کئی دنوں تک اپنے آپ میں واپس نہ ہوئے، معلوم نہیں اب کیا حال ہے۔

اس وقت یہ عریضہ ایک خاص وجہ سے بھی لکھ رہا ہوں، دیوبند سے واپسی کے بعد معارف ملا، دیکھ کر میں نے سر پکڑ لیا کہ ادارۂ معارف نے میرے اس مضمون کو جو دارالعلوم میں شائع ہو چکا تھا، معارف میں شائع کر دیا، مخمل میں ٹاٹ کا بخیہ، اور اس پر طرہ یہ ہے کہ دارالعلوم والوں نے تو میرے مسودہ ہی کو شائع کر دیا تھا جس کی

سیاسی، تصنیفی، غرض ملکی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں دارالعلوم دیوبند کے فضلا کی خدمات نمایاں نہ ہوں۔ ۱۲۔

٥١ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا وصال۔ ۱۲۔

نظرِ ثانی بھی نہ ہو سکی تھی، اور پھر اپنی طرف سے اس مسودہ کے منہ کالا کرنے میں دار العلوم کے کاتب و مصحح نے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا تھا، کاش! اشاعت سے پہلے حقیر کو مطلع فرما دیا جاتا، کم از کم تنبیہ کر دیتا کہ ذرا سنبھل کر پروف اور کاپی کے دیکھنے والے صاحب دیکھیں گے، لیکن غفلت میں انہوں نے لاپروائی سے کام لیا۔ جانتا ہوں کہ مضمون نگار کو جتنی تکلیف، اور جتنا احساس اپنے مضمون کے اغلاط کا ہوتا ہے، پڑھنے والوں کو اس کی چنداں پرواہ نہیں ہوتی، لیکن اغلاط کی بھی حد ہوتی ہے، علاج غلط نامہ کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا، وہی بنا کر بھیج رہا ہوں، اگر مناسب خیال فرمایا جائے، تو آئندہ نمبر میں اس غلط نامہ کو شایع کر دیا جائے۔ جو الگ اسی کے ساتھ منسلک ہے۔

اور کیا عرض کروں، دیوبند سے مولانا شبیر احمد صاحب کا تعلق بالکلیہ جدا ہو گیا، آئندہ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔

ندوہ کا حال نہ معلوم اب کیا ہے، شیروانی صاحب سے ملنے علیگڈھ گیا تھا، میرے ساتھ وہ بھی لکھنؤ روانہ ہوئے تھے۔ فرماتے تھے کہ آپ بھی لکھنؤ آئیں گے، الجھا ہوا ندوہ سلجھایا جائے گا۔

دار العلوم کے شایع شدہ مقالہ کے بقیہ حصے اگر معارف میں آئندہ شایع ہوں تو کسی ناقد بصیر سے اس کی تصحیح کرا لیجئے، آزادی کے ساتھ تصحیح کر سکتے ہیں، میں تو اس مضمون کو معارف کے لائق خیال بھی نہیں کرتا تھا، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ حیدرآباد

میں، دلی میں، جہاں کسی سے ملاقات ہوئی، اکثروں کو دیکھا کہ وہ اس کے مداح تھے واللہ اعلم کیا بات ہے، سچ عرض کرتا ہوں کہ میرے نزدیک تو اس میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ لیکن جب لوگوں نے پسند کیا ہے، تو خیال ہے کہ اس کے بقیہ حصص جو بالکل نامکمل حالت میں پڑے ہوئے ہیں، انہیں درست اور مکمل کر کے خدمت والا میں بھیج دوں گا،

حضرت والا[1] رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق دار العلوم دیوبند میں عند التعزیت جو ارتجالی تقریر خاکسار نے کی تھی، صدق میں شاید وہ نظر سے گذرے، مولانا مسعود علی ندوی صاحب کی خدمت میں سلام فرما دیجے۔ تعزیت کے ساتھ انہیں اس مبارک و مسعود حزن و غم کی تہنیت دیتا ہوں، ہر ایک کا مقدر اتنا اونچا نہیں ہے، جسے یہ غم نصیب ہو، ایسے کتنے ہیں۔

مولانا شاہ معین الدین[2] صاحب کی خدمت میں عقیدت سلام عرض ہے۔

نیاز مند۔ مناظر احسن گیلانی۔

---

[1] حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ۔ ۱۲۔

[2] مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، رودولی شریف ضلع بارہ بنکی کے رہنے والے ہیں۔ حضرت مخدوم شاہ عبد الحق رودولوی کے خاندان سے ہیں، ۱۹۲۴ء میں ندوۃ العلماء سے فارغ ہوئے اور اسی سال دار المصنفین آ گئے، جب سے اب تک علمی کاموں میں مشغول ہیں، "تاریخ اسلام" کی چار جلدیں، "مہاجرین" کی دوسری جلد، "سیر الصحابہ" کی

۲۰ نومبر ۱۹۴۳ء۔ ۲۲ ذیقعدہ۔ شنبہ۔ حیدرآباد دکن۔

سیدی الامام دمتم بالہنا والعیش المدام۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

مدت ہوئی ایک عریضہ خدمت والا میں روانہ کرچکا ہوں، معلوم نہ تھا کہ نصیب دشمناں ادھر آپ کچھ بیمار ہوئے، چند دن ہوئے اپنی طویل رخصت سے واپس ہوکر مولانا عبدالباری صاحب حیدرآباد پہنچے ہیں، تب معلوم ہوا کہ ادھر آپ کی طبیعت پھر کچھ بگڑ گئی تھی، بلا تصنع عرض کرتا ہوں، کہ چل چلاؤ کے اس حال میں مسلمانانِ ہند کے اندر جن چند نفوس کے دم کو غنیمت خیال کرتا ہوں، ان میں اب تو شاید سب سے زیادہ اہمیت آپ ہی کے وجود گرامی کو حاصل ہوگئی ہے دست بدعا ہوں کہ آپ صحت عاجلہ سے متمتع ہوچکے ہوں گے۔

اس وقت اس عریضہ کے لکھنے کی وجہ ایک تو آپ کی عیادت ہے اور دوسری فوری وجہ معارف کا مضمون "حیاتِ شبلی"، کا نمونہ ہے۔ جزاکم اللہ پڑھنے کے بعد بے ساختہ ، ھذا فقد قضی ما علیہ کا جملہ زبان پر جاری ہوگیا، اپنے استاد کا حق آپ نے ادا کردیا، اور واقعی مولانا شبلی مرحوم کا جو حق تھا اسی کو آپنے

چھٹی اور ساتویں جلد، کتاب "اسلام اور عربی تمدن" اور "تابعین" وغیرہ کے مصنف ہیں، حضرت سید صاحب علیہ الرحمہ کے بعد دارالمصنفین کے عہدۂ ناظم علمی پر فائز ہوئے، ایک عرصہ سے رسالہ "معارف" آپ ہی کی ادارت میں نکل رہا ہے۔ ۱۲۔

ادا کیا ہے، اغراق وغلو، افراط وتفریط سے پاک اس قسم کی سوانح عمری خصوصاً اس عہد میں شاید ہی کسی کی مرتب ہوئی ہو۔ بلاشبہ مولانا شبلی قدیم وجدید علمی طبقہ کے درمیان ایک برزخی وجود کا مقام حاصل کئے ہوئے ہیں، لیکن افسوس کہ مضمون بہت جلد ختم ہوگیا، خدا جانے آپ لوگوں کا کیا قصہ ہے، متعدد بار جامعہ عثمانیہ کے کتب خانے سے یہ لکھوا چکا ہوں کہ دارالمصنفین کی ہر کتاب شائع ہونے کے ساتھ بھیج دی جایا کرے۔ لیکن نہ حیاتِ شبلی[1] ہی آئی ہے اور نہ تاریخ ترکی[2]، ضابطہ کی شکل میں اگر منگواتا ہوں، تو مراسلہ بازی کا ایک طویل سلسلہ چھڑ جائے گا، کیا یہ

[1] حیاتِ شبلی، علامہ شبلی نعمانی مرحوم کے حالات زندگی اور علمی وعملی کارناموں کا مجموعہ جو ساڑھے نو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب صرف حیاتِ شبلی ہی نہیں بلکہ ایک تہائی صدی کی ہندوستان کے مسلمانوں کی علمی، تصنیفی، دینی اور اصلاحی تاریخ کا گلدستہ ہے، کتاب کی افادیت اور اہمیت کے لیے اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ حضرت علامہ سید سلیمان ندوی علیہ الرحمہ اس کے جامع اور مرتب ہیں، اور فاضل گیلانی کے الفاظ میں اس قسم کی سوانح عمری خصوصاً اس عہد میں شاید ہی کسی کی مرتب ہوئی ہو، دارالمصنفین اعظم گڈھ نے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے۔

[2] دراصل کتاب کا نام "دولت عثمانیہ" ہے۔ مولانا نے اسی کو تاریخ ترکی کا نام دیدیا ہے، یہ کتاب دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے، پہلی جلد ۵۰۰ صفحات پر مشتمل ہے، جس میں عثمان اول ۶۸۷ھ / ۱۲۸۸ء سے لے کر مصطفی رابع ۱۲۲۳ھ / ۱۸۰۸ء تک کے حالات ہیں، دوسری جلد بھی

ممکن ہے کہ سردست حیات شبلی کے دو نسخے میرے نام بھجوا دیجئے۔ میں دونوں کی قیمت کتب خانہ سے وصول کر کے روانہ کر دوں گا۔ میں کتب خانہ کے نام ہی سے منگواتا مگر اس میں جھگڑے دفتری پیدا ہو جائیں گے، بڑی مہربانی ہوگی، اگر اس عریضہ کے ملنے کے ساتھ ہی ان دو نسخوں کے بھجوانے کا بصیغۂ اشد ضروری دفتر کو حکم دے دیجئے، تاریخ ترکی تو باضابطہ کی شکل میں منگوائی جائے گی، بے تابی حیات شبلی کے دیکھنے کی ہے، چند قطرات نے پیاس بھڑکا دی، خصوصاً فہرست نے تو کھلبلی سی باطن میں مچادی ہے۔ جب تک پوری کتاب پڑھ نہ لوں گا چین نہیں آئے گا، ہاں صاحب! مولانا شبلی کے متعلق میرا ایک انفرادی نقطۂ نظر تھا، لیکن۔ ع

در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید؟

یعنی باوجود سب کچھ ہو جانے کے ابتدا میں بھی وہ ملّا ہی تھے، بیچ میں بھی ملّا ہی رہے، اور مرتے بھی ملّاگیری کا کام انجام دیتے ہوئے۔ کسی حالت میں ملّائیت

پونے پانچ سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس میں محمود ثانی ۱۲۲۳ھ/۱۸۰۸ء سے جنگ عظیم اول ۱۳۳۶ھ/۱۹۱۹ء تک کے واقعات درج ہیں۔ اس کتاب میں سلطنت عثمانیہ کے عروج و زوال کی تاریخ اور جمہوریہ ترکیہ کے انتظامی اور تمدنی کارناموں کی پوری تفصیل ہے، جسے سات برس کی محنت میں مولوی محمد عزیز صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ ڈی نے مرتب فرمایا ہے، ترکوں کی یہ پہلی تاریخ ہے جو اس جامعیت کے ساتھ اردو زبان میں لکھی گئی۔ ۱۲

کے دائرے سے نہ نکل سکے، ثبوت میں اسی چیز کو پیش کرتا تھا جس کا ذکر سوانح میں کیا گیا ہے، کہ مقلدیت، و غیر مقلدیت، شیعہ و سنی، ردِ آریہ، ردِ عیسائیت، ساری زندگی ان کی ان ہی ملّایانہ مشغلوں میں گذری، اگرچہ دنیا انہیں مورخ، شاعر، لیڈر، تعلیمی ماہر، وغیرہ وغیرہ سمجھتی رہی، اور میں مُلّائیت کے ساتھ کمال وفاداری کی دلیل اسے خیال کرتا ہوں۔ انھوں نے ملّاؤں ہی سے سیکھا تھا، جو کچھ سیکھا تھا، ان ہی سے پڑھا تھا، جو کچھ پڑھا تھا، اتنی ساری زندگی ان ہی کے آستانوں پر چولا بدل بدل کر گھومتے رہے، کسی موقع پر آپ نے ان کی تحریر کے یہ الفاظ کہ "میں عقیدۃً بھی حنفی ہوں، اور عملاً بھی" ان کی زندگی کا آخری تاثر جیسے کسی نمائش پر محمول نہیں کیا جاسکتا، اور بھی ملّائیت پر اُن کے مُہر لگا دیتا ہے۔ بہرحال جس طریقہ سے آپ کے قلم نے ان کو پیش کیا ہے دل حکم کرتا ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ آخرت میں بھی وہ کا بینا رہیں گے، مجھ پر تو ان حالات کے پڑھنے سے جنہیں اب تک پڑھ چکا ہوں یہی اثر پڑا ہے، کہ کان رجلا یحب اللہ و رسولہ اور راہ قلندری کا بے دانہ راہ داری صرف یہی ہے۔ ؎

کفر کافر را و دیں دیندار را ذرۂ دردت دلِ عطّار را

اور اگر اس میں وہ کامیاب ہوئے تو کامیابی ہے، ورنہ آج سوانحعمری کے یہ اوراق ان کے کس کام کے! ؎

ہمیں کیا جو تربت پہ میلے رہیں گے کہ ہم تو یہاں بھی اکیلے رہیں گے۔

نیازمند۔ مناظر احسن گیلانی۔

پنجشنبہ، ۱۷؍اگست ۱۹۴۴ء۔ ۲۷ شعبان ۱۳۶۳ھ حیدرآباد دکن۔

مخدوم ومحترم سیدی المسلمین دمتم بالهناء والعافیہ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

من غیر ترقب آپ کا لفافہ پرسوں ملا، آپ کے دفتر میں "الدین القیم" اور "تعلیم و تربیت"[1] والی دونوں کتابیں پہنچ گئیں۔ دیکھیں آپ حضرات کی رائے کیا ہوتی ہے؟ ہمارے معتقد اعظم[2] تو ہم سے کچھ برگردہ آخر ہو ہی گئے۔ مدینہ والے کے خط کے جواب میں میں نے جو کچھ لکھا تھا وجہ ناگواری یہی وجہ ہوئی ہے، گو معاملات پر اس کا اثر نہیں پڑا ہے، لیکن وہ لطف جاتا رہا، بیس بائیس سال کے تعلقات میں

[1] ۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، سات سو صفحات کی یہ کتاب اپنے موضوع پر معلومات کا بیش بہا خزانہ ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ لکھتے وقت فاضل گیلانی کے خداداد حافظہ نے ساری معلومات ان کے سامنے کر دی ہیں، کتاب میں پوری تفصیل و تحقیق کے ساتھ بتلایا گیا ہے، کہ ہندوستان میں قطب الدین ایبک کے زمانہ سے موجودہ دور تک مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت کیا رہا۔ نصاب تعلیم کن علوم و فنون پر مشتمل ہوا کرتا تھا، طریق تعلیم کیا تھا، طلبہ کے قیام و طعام کے انتظامات کس طرح ہوتے تھے۔؟ تعلیم کے ساتھ اخلاقی تربیت اور تزکیہ نفس کا اہتمام کس درجہ تھا، غرض اس موضوع کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس پر فاضل گیلانی نے سیر حاصل بحث نہ کی ہو، اور پھر درمیان میں اہم مباحث بھی آگئے ہیں، جن پر مولانا نے محققانہ کلام کیا ہے، ساتھ ساتھ کتاب بڑی دلچسپ اور موثر ہے، ندوۃ المصنفین نے بڑے اہتمام کے ساتھ دو جلدوں میں شائع کی ہے۔۱۲۔ [2] غالباً مولانا عبدالماجد صاحب دریا آبادی مراد ہیں ۱۲

شکایت پیدا ہونے کا یہ پہلا موقع پیدا ہوا ہے۔ اور خوب اچھی طرح پیدا ہوا۔ اسی کا خطرہ ان کے مزاج کی وجہ سے تھا، "صدق"[1] میں "الدین القیم" پر جو رائے شائع ہوئی ہے وہی اس اندرونی انقلاب کی دلیل ہے۔

معاشی مضامین کے متعلق آپ نے پہلے بھی لکھا ہے اور اب بھی کہ یہ یہ کر دو، میں اپنا حال کیا عرض کروں، جسے قلم کا شباب لکھا ہے، وہ میری خبطگی کی ایک حالت ہے، ایک دفعہ جھونک میں لکھنے بیٹھا تو لکھتا چلا گیا۔ اب پھر اس پر نظر ثانی حک و اصلاح میرے لیے مشکل ہے، آپ کے یہاں فن تصنیف کے طلبہ کی ایک تعداد تو ہمیشہ رہی ہے۔ کیا انہی حضرات میں کسی کو آمادہ کر سکتے ہیں کہ خرافات کو حذف کر کے کار آمد اجزا کا انتخاب کر لیں، بہرحال آج کل تو چند دوسرے مشغلوں میں ہوں، تدوین فقہ پر ایک مضمون پڑھا تھا، دوبارہ اس کو مرتب کر کے لکھنے لگا،

[1] مولانا دریا آبادی نے جنوری ۱۹۲۵ء میں سچ نامی ہفتہ وار نکالا، اس وقت راقم الحروف کے استاذ مولانا عبدالرحمن ندوی نگرامی اور مولانا ظفرالملک علوی بھی شریک ادارت تھے ۱۹۲۹ء اور ۱۹۳۳ء میں اخبار کی اشاعت بند رہی، پھر ۱۹۳۴ء میں اخبار کو صدق کے نام سے مولانا دریا آبادی نے جاری کیا، یہی اخبار ۱۹۵۰ء سے صدق جدید کے نام سے شائع ہو رہا ہے، اخبار پورے ملک کے تعلیم یافتہ طبقہ میں مقبول ہے، اور اپنے مخصوص طرز نگارش اور تبصرہ و تنقید کے لحاظ سے بہت ہی کامیاب اور معروف ہے ۔۱۲۔

⁂ ⁂ ⁂

تو اس نے نخمی کتاب ہی کی شکل گویا اختیار کر لی ہے۔ ابتدائی سو صفحات ابھی کے جامعہ عثمانیہ کے تحقیقاتی مجلہ میں ایک سال ہوا چھپنے کے لیے دیا تھا، مضمون چھپ تو گیا ہے، لیکن دس پانچ صفحہ ایک صاحب کے مضمون کا باقی ہے، سرکاری کام ہے، کب نکلتا ہے، ایک کاپی اس کی اسی ہفتہ میں انشاء اللہ خدمت والا میں حاضر ہو گی، اور بھی چند کام جاری ہیں، شاید وقت پورا ہو رہا ہے، جو کچھ اس عرصہ میں نکلا تھا اگلوایا جا رہا ہے۔ امیدوار دعا و توجہ ہوں۔

مولنا عبدالباری صاحب کی حالت دن بدن بہت زیادہ قابل رشک بنتی چلی جا رہی ہے۔ میں تو ان میں ہر دن ارتقاء کی کیفیت پا رہا ہوں، وہ بڑی روح اور بڑے نفس کے آدمی ہیں۔

مولنا مسعود علی صاحب کی خدمت میں بہت بہت سلام عرض ہے، ان کے حکیمانہ ظرافت آمیز فقرے بہت یاد آتے ہیں۔ "اللھم ایدہ وانصر علی مسئلۃ ادکاغذ"[1]، جہاد لے دے کے یہی رہ گیا تھا، لیجیے اس پر ایک لائسنس لگ گیا "فبقلبہ"[2] پر اب عمل کیا جائے گا۔ ورنہ صورت ہی کیا باقی رہی، مولنا

---

[1] اے اللہ مسئلہ کاغذ پر ان کی مدد فرما۔ ۱۲۔

[2] مشہور حدیث کا ایک ٹکڑا "من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ، و ان لم یستطع فبلسانہ۔ وان لم یستطع فبقلبہ، وذلک اضعف الایمان" تم میں سے جو کوئی کسی برائی کو دیکھے تو طاقت سے برائی کو (نیکی) سے بدل دے۔ اگر یہ قدرت نہ ہو تو زبان سے ورنہ کم از کم دل سے اُسے بُرا سمجھے، اور یہ ایمان کا سب سے کمزور مرتبہ ہے۔ ۱۲۔

عبدالباری بڑے خوش ہیں اور خوش ہونے کی بات تو مولنا مسعود علی کے لیے بھی ہونی چاہیے، لیکن کاش صورت اور کوئی ہوتی۔

بہر حال "کاغذی ناؤ" کے ملاحوں کے امتحان کا بھی تو وقت آ گیا، اس طوفان میں "اپنی کشتی" ساحل تک بخیر و سلامتی کون پہنچاتا ہے۔

نیاز مند۔ مناظر احسن گیلانی۔

---

۲۶ ستمبر ۱۹۴۴ء، ۱۷ شوال ۱۳۶۴ھ، حیدر آباد دکن

سیدی الکریم النجیب الصدیقی ایدکم اللہ نبصرہ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

من غیر ترقب آپ کا گرامی نامہ ملا، پڑھ کر جو مسرت ہو سکتی تھی، اس کا اندازہ مجھ سے زیادہ آپ خود کر سکتے ہیں۔ خیال تو کیجیے کہ

راہ پر ان کو تو لگا لائے ہیں ہم باتوں میں — اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں

کی فکر میں جس کی عمر گذری ہو، وہ اپنے اس مشن کی کامیابی کو دیکھ کر ظاہر ہے کہ جتنا بھی مسرور ہو بجا ہے، لیکن حیرت یہ ہے کہ اسی رسالہ کو خاکسار نے خدمت والا میں جب آپ توپ کے سانچے والے مکان میں تشریف لائے تھے، قلمی حالت میں مطالعہ کے لیے پیش کیا تھا، اس وقت بھی جہاں تک میرا خیال ہے، آپ نے پڑھ لیا تھا، بلکہ بعض مقامات میں آپ کے اصلاح کردہ الفاظ اصل نسخہ میں موجود ہیں، پھر اس جدید تاثیر کی

وجہ سمجھ میں نہیں آئی، بہرحال شک ہے کہ بزرگوں کی نگاہ میں کوئی چیز جچ جائے، اور قابل قدر ٹھہرے، میرے لیے تو یہی چیز بس کرتی ہے، فجزاکم اللہ عنا خیر الجزاء۔

ماجد میاں کے متعلق مجھے خود حیرت ہے کہ انھوں نے نہ معلوم کس حال میں یہ لکھ دیا، کل انھوں نے اپنے لفافہ میں اخبار انقلاب کا ایک تراشا بھیجا ہے، جس میں اسی کتاب "الدین القیم"، کے متعلق مدیر نے غیر معمولی تحسین و تعریف کے الفاظ استعمال کئے ہیں، مجھے یاد نہیں، رہا کہ آپ کو میں نے کیا لکھا تھا، ان کے مسلک سے بنیادی اختلافات سے قدرے مرا انحراف نہ یہ وجہ یا اس کتاب کی ابتدا میں مولوی عبدالباری صاحب کی کتاب کو ماخذ بنانے کی حرکت ان کی برہمی کا باعث ہوئی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ میرا یہ وسوسہ وسوسہ ہی ہے یا اس کے اندر کوئی حقیقت پوشیدہ ہے۔ لیکن اتنی خفیف سی بات سے ماجد میاں کی جو عظمت میرے قلب میں ہے کیا وہ کم ہو سکتی ہے۔ بلاشبہ انھوں نے ایک خاص پہلو سے ہندی اسلام کی بڑی خدمت کی ہے، ایسی خدمت جس میں وہ تنہا ہیں، اور میں خیال کرتا ہوں کہ اپنے دل سے آپ بھی اس کو نکال دیجیے، آپ نے سچ لکھا ہے ساری عمر کے حاصل یہی چند لوگ ہیں، بس یہی چند لوگ ہیں، ان کو بھی چھوڑ دیا جائے، تو تنہا زندگی کیسے بسر ہو گی، اور وہ ہوں یا ہم ہوں، کچھ نہ کچھ کمزوریاں سب ہی میں ہوتی ہیں، تعلقات میں دوام کی صورت یہ ہے کہ ان کی کچھ نہ کچھ کمزوریوں کا حق ہر اس بندے کو دیا جائے، جو ضعیف اور کمزور بنا کر پیدا کیا گیا ہے۔ آج ۳۲-۳۴ سال سے میرے ان کے تعلقات قائم ہیں، چوتھائی صدی گذر گئی، اب دن باقی ہی کتنے ہیں حق تعالیٰ سے

داعی ہوں، کہ گھٹتے گھٹتے چند بزرگوں اور دوستوں سے نیازمندی کے جو تعلقات آخر عمر تک باقی رہ گئے ہیں، وہ آخری سانس تک باقی رہیں

بالفعل اس عریضہ کو ختم کرتا ہوں، اور دو ایک روز بعد وہ مضمون آپ کی خدمت میں انشاء اللہ پہنچے گا، اتنا پھر بھی کہہ دیتا ہوں کہ، دار المصنفین کے کلیات و جزئیات کو کیا واقعی براہ راست اپنے ہاتھ میں اس طور پر رکھنا چاہتے ہیں کہ قطعاً کسی دوسرے کے ارادے سے یا مشورہ اور عمل سے مدد نہ لی جائے، کیا خدا نے جس بوجھ سے آپ کو آخری زندگی تک ہلکا پھلکا رکھنا چاہا، اس نعمت سے گریز کرنا چاہتے ہیں، بس آج صرف اسی قدر، تفصیل آئندہ۔

"تعلیم و تربیت" والی کتاب پر کیا معارف میں کچھ لکھیے یا لکھوائیے گا۔ مسلم لیگ کے حلقہ میں تو کتاب نہایت مقبول ہوئی، "الدین القیم" پر بھی طوالت مانع ہے، ورنہ اپنی تجویز دار المصنفین ہی کے سلسلہ کی، مدت سے دماغ میں آرہی ہے، اسے پیش کرتا، یعنی جی چاہتا ہے کہ دار المصنفین میں ایک شعبہ دار الترجمہ قائم کیا جائے اور جو کتابیں اب تک شائع ہو چکی ہیں ان کے تراجم کا بندوبست انگریزی اور ہندی زبان میں کیا جائے، بلکہ اور بھی جو مناسب کتابیں اردو میں ایسی لکھی جائیں، جن کا ترجمہ ان زبانوں میں مفید ہو، اس قسم کا کام اس شعبہ سے لیا جائے ————————

———————— میں تو خیال کرتا ہوں کہ، ترجمین مل سکتے ہیں، اور آپ لوگوں کی محنتوں کا حقیقی فائدہ جس سے دوسرے بھی مستفید

ہوں، ان ہی صورتوں میں ممکن ہے۔ فقط۔

مناظر احسن گیلانی۔

۱۰ر نومبر ۱۹۴۴ء، ۲۳ر ذیقعدہ ۱۳۶۳ھ پنجشنبہ۔

سیدی الکریم العلامہ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آج آپ کی خدمت میں اپنی کتاب "تدوین فقہ" کا ایک ابتدائی حصہ جو بصورت مقالہ ہمارے یہاں کے ریسرچ جرنل میں چھپا ہے، بھیج رہا ہوں، جانتا ہوں کہ غریبوں کی کتابوں کے پڑھنے کی زحمت آپ بھلا کہاں برداشت کریں گے۔ لیکن سرسری نظر جیسے خاکسار کے دوسرے خرافات پر ڈال دی جاتی ہے، خدا کے لیے اس نظر سے بھی اسے محروم نہ فرمایئے، آپ کی رائے اور خیال کا انتظار رہے گا۔ ماجد میاں کو تو مدت ہوئی پہلے ہی بھیجا تھا، لیکن غالباً پسند نہ آیا، کوئی خاص چیز جواب میں نہ آئی، البتہ مولنا عبدالباری صاحب نے بڑی ہمت افزائی کی، اسی قسم کی جیسے جناب والا نے "الدین القیم" کے متعلق فرمائی ہے، معارف میں جو نوٹ اس کتاب پر شایع ہوا ہے، بڑی دیر میں ملا، معارف کے سارق آج کل پیدا ہوگئے ہیں، نہ مولنا عبدالباری ہی کو پرچہ ملا، اور نہ مجھے، صدق میں مجذوب[۱] صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر آپ کے مقالہ کا

[۱] خواجہ عزیز الحسن غوری۔ اورئی ضلع جالون کے رہنے والے ایک زمانہ میں ڈپٹی کلکٹر رہے پھر اس سے مستعفی ہو کر محکمۂ تعلیمات (یوپی) میں اسسٹنٹ انسپکٹر ہوئے۔ آخر میں

ذکر چھپا تھا، اسی کے بعد اس کی تلاش شروع ہوئی، کالج سے بھی کوئی صاحب لے گئے تھے اب کل انشاء اللہ اس کے پڑھنے کا موقع ملے گا۔

مجھے اس کی شکایت آپ سے رہے گی کہ تعلیم و تربیت والی کتاب کی طرف آپ نے توجہ نہ فرمائی، مولویوں کی طرف سے وکالت کا حق افسوس ہے کہ اس میں، خواہ مخواہ میں، نے ادا کیا، مجھے کیا معلوم تھا کہ اپنے مخالفین تو خیر موافقین کی بھی کتابیں یہ نہیں پڑھتے، کتنے قدیم اوہام باطلہ جو عہد جدید کی پیداوار تھے، ان کا ذکر کیا گیا، لیکن شاید کسی مولوی نے نہیں دیکھا، ایک مولوی صاحب کا صرف پنجاب سے خط آیا ہے کہ نحو و صرف میں تو نے جن چند مختصر رسالوں کو کافی قرار دیا ہے، یہ کیا غضب کیا ہے۔ بس اس کے سوا اور کوئی بات کسی نے پوچھی بھی نہیں، ہاں انگریزی خوانوں میں سے صرف افضال قادری صاحب مسلم لیگ کے شعبہ تعلیمی کے سکریٹری، ان کا ایک مفصل خط موافقت میں آیا تھا، بہرحال میری یہ غرض قطعاً نہیں ہے کہ آپ لوگ میری مداحی فرمایئے، لیکن میرا یہ تو

انسپکٹر آف اسکولز کے عہدے پر پہنچ کر سبکدوش ہوئے۔ انگریزی حکومت سے "خاں صاحب" اور "خان بہادر" کا خطاب بھی ملا۔

شاعری میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا، مجذوب تخلص فرماتے۔ اور اپنے وقت کے مشہور شعراء و استادِ فن شمار ہوئے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کی اور طلب رضائے الٰہی میں بڑے بڑے مجاہدے کئے، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اجازت و خلافت سے سرفراز فرمایا۔

۱۹۴۴ء میں وصال فرمایا۔ رحمۃ اللہ علیہ۔

سچا حق ہے کہ جس طرح آپ لوگوں کی کتابیں نقطہ نقطہ، حرف حرف پڑھتا رہا ہوں، آپ بھی کیوں نہیں میری کتابوں کو پڑھ لیں گے، فرض نہیں کم از کم قرض ہی سمجھ کر اس بار کو اٹھائیے، میں جانتا ہوں کہ جتنا نفع آپ حضرات کی کتابوں سے خاکسار کو پہنچا ہے، میری کتابوں سے ظاہر ہے۔ یہ نسبت آپ حضرات کو پیدا نہیں ہو سکتی، لیکن پڑھنے میں کیا حرج تھا، کیا یہ بھی کوئی گناہ ہے۔؟

میرا ایک مختصر سا مضمون "جدید خارجیت" کے عنوان سے صدق میں نکلا تھا آپ نے کا ہے کو پڑھا ہوگا۔ اس میں مشرقی[1] اور عبدالوحید کے ساتھ ساتھ حماقت بھی

[1] عنایت اللہ خاں مشرقی ۲۵ اگست ۱۸۸۸ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے، امرتسر ہی میں ایف۔ اے تک تعلیم حاصل کی، ۱۹۰۶ء میں کرسچین کالج لاہور سے ایم۔ اے (ریاضی) درجہ اول میں پاس کیا، ۱۹۰۸ء میں کیمبرج یونیورسٹی کے ریاضی کے امتحان میں اول رہے، اور فاؤنڈیشن اسکالر کا خطاب حاصل کیا، پھر ۱۹۰۹ء میں ریاضی کا "ٹرائی پوس" اس امتیاز سے پاس کیا کہ "سینیئر رینگلر" کا خطاب پایا۔ ۱۹۱۱ء میں ٹرائی پوس کے دو اور امتحانات (عربی، فارسی میں) شامل ہو کر درجہ اول حاصل کیا، ۱۹۱۲ء میں آپ انجینیرنگ کے سب سے بڑے امتحان میکینکل سائنس کے ٹرائی پوس میں شامل ہوئے، اور نہایت شان سے کامیاب ہوئے، ۱۹۱۲ء سے ۱۹۳۱ء تک ہندوستان میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے ۱۹۳۱ء میں آپ نے ملازمت سے استعفیٰ دیدیا اور خاکسار تحریک کا آغاز کیا، تحریک پورے ہندوستان میں عموماً اور پنجاب میں خصوصاً بہت زیادہ مقبول ہوئی، چار لاکھ کا مسلح دستہ علامہ کی کمان

ہوئی کہ مودودی صاحب کی طرف بھی ذرا سخت لہجہ میں روئے سخن نام کی صراحت سے ہو گیا، مسلسل لعنت و ملامت کی بارش مجھ پر ہو رہی ہے، ان کے معتقدوں میں ہل چل مچی ہوئی ہے، مجھے حاسد قرار دیا جا رہا ہے، خود مودودی صاحب کا بھی گرامی نامہ آیا تھا جس کا جواب ان کو دیدیا ہے۔

مناظر احسن گیلانی

---

۷ دسمبر ۱۹۴۴ء، ۲۰ ذی الحجہ ۱۳۶۳ھ۔ چہار شنبہ۔ حیدرآباد دکن۔

سیدی و سید الہند! ادام اللہ عزکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

گرامی نامہ سامی کئی دن ہوئے کہ موجب فرحت و انبساط ہوا، گو تھوڑی سی اس کی تکلیف بھی ہوئی، کہ آپ کے قیمتی وقت کو بلا وجہ میں نے گویا ضائع کیا، آپکی تحریر کا ہر لفظ جو قیمت رکھتا ہے اور اس کے بعد ان دو طویل اوراق کے خط کو دیکھتا ہوں، تو خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ مجھ جیسے جہول و ظلوم، ذلیل و ذلول کے ساتھ حق تعالی کی نوازشیں بے سبب کے سوا اور کیا ہے۔؟

الحمد للہ اس وقت تک حیدرآباد اپنے تمام خصوصیات کے ساتھ اسی حال

میں تھا، ۱۹۴۰ء میں جبکہ جنگ چھڑی ہوئی تھی گورنمنٹ برطانیہ نے اپنی مصلحتوں کے پیش نظر تحریک کو کچل دیا، ۱۹۴۵ء کے بعد یہ تحریک قریب قریب بالکل ختم ہو گئی، اب علامہ مشرقی پاکستان میں گمنامی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ۱۲۔

میں ہے، جس حال میں چھوڑ کر آپ گئے تھے، اس بشارت سے کہ مدراس کا قصد ہے اور سفر مدراس کے سلسلہ میں حیدرآباد بھی سرفراز کیا جائے گا، فقیر کو خصوصاً اور جن جن جاننے والوں سے ذکر آیا، بڑی مسرت ہوئی، بلکہ جواب میں تاخیر کی وجہ آپ کی یہی بشارت ہوئی۔ آپ نے دریافت فرمایا تھا کہ ان دنوں میں کہاں رہے گا، واقعہ یہ ہے کہ وہی زمانہ ہماری سرمائی تعطیل کا ہے، عام طور پر من دون تخلف فقیر ہر دو تعطیلوں میں گیلانی شریف کی حاضری ضرور دیتا ہے۔ لیکن اب کی سال یہ اتفاقی صورت پیش آگئی ہے کہ سرمائی تعطیل کی مدت کل ۱۹ دن کی ہے، اسی میں آنے بھی اور اسی میں رفت کی طویل مدت بھی شریک ہے، یہ مسئلہ قابلِ بحث ہوگیا۔ میں نے مکارم سلمہٗ کو گیلانی اس حادثہ کی خبر دی تھی، اور لکھ دیا تھا، کہ اس سال اب کی ٹال جانے کا ارادہ ہے، لیکن بعض خانگی ضرورتوں کی وجہ سے انتظار تھا، اس کے بعد آخری رائے قائم کروں گا، مگر میاں مکارم سلمہٗ کا جواب آج تک نہیں آیا۔ مجبوراً طے کر لیا ہے کہ اس سال سرما کا یہ موسم حیدرآباد ہی میں بسر کردوں۔ انشاء اللہ اسی صورت میں، بہرحال حیدرآباد ہی میں رہوں گا، خواہ جناب والا کی تشریف آوری آمد میں ہو یا رفت کے وقت، لیکن ایک پھیرا ہونا ضرور چاہیے، اور قیام کے متعلق کیسے جرأت کروں، آپ کے میزبان جب بنجارہ ہل[1] پر بھی پائے جاتے ہیں تو سیتا پھل[2] منڈی کے فقیر کے جھونپڑے کو کون

[1] شہر حیدرآباد سے دو میل کے فاصلہ پر ایک مرتفع سطح ہے، کہتے ہیں کہ اس جگہ پر بنجارا نام کی ایک جنگلی قوم رہا کرتی تھی، اسی نسبت سے یہ جگہ بنجارا ہل کے نام سے مشہور ہوگئی، آج سے تقریباً

تیس ۳۰ سال پہلے ریاست کے امراء اور اعلیٰ حکام نے اس بلند و پُرفضا مقام کو اپنی رہائش کے لیے منتخب کیا، بڑی بڑی کوٹھیاں بنیں۔ باغات لگے، پانی، بجلی اور ٹیلیفون کا انتظام کیا گیا، بنجارہ ہل کے رہنے والوں میں کافی تعداد سید صاحب علیہ الرحمہ کے قدر شناسوں کی تھی، ایک دفعہ غالباً سید صاحبؒ حیدرآباد تشریف لائے تو سیتا پھل منڈی میں مولانا عبدالباری صاحب کے پاس قیام فرمایا، لیکن حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کے چھوٹے بھائی محمد مظہر علی صاحب کے اصرار پر ان کے پاس ہی بنجارہ ہل پر جاکر ٹھہرے، مسٹر غلام محمد مرحوم گورنر جنرل پاکستان جس زمانہ میں ریاست حیدرآباد کے وزیر مالیات تھے، انھوں نے مظہر صاحب کو خاص طور پر حیدرآباد بلالیا تھا۔ مظہر صاحب ریاست حیدرآباد میں ایک اعلیٰ عہدہ (انسداد رشوت ستانی) پر فائز کئے گئے۔ اور ان کے قیام کے لیے ریاست کی طرف سے بنجارہ ہل پر ایک بڑی کوٹھی ملی ہوئی تھی۔ ۱۲-

[2] جامعہ عثمانیہ کیمپس شہر حیدرآباد سے باہر شمال میں ۶-۷ میل کے فاصلہ پر واقع ہے اسی سے ملی ہوئی ایک چھوٹی سی آبادی کا نام "سیتا پھل منڈی" ہے۔ سیتا پھل حیدرآباد میں "شریفہ" کو کہتے ہیں۔ ۱۹۳۸ء میں حضرت گیلانی علیہ الرحمہ اسی محلہ میں آکر کرایہ کے ایک مکان میں رہ گئے تھے اور قیام حیدرآباد کے زمانہ تک یہیں رہے، مولانا کی تمام اہم تصانیف مثلاً تدوین حدیث، امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی، اسلامی معاشیات، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، سب اسی "سیتا پھل منڈی" کی یادگاریں ہیں۔ حضرت گیلانی اکثر فرمایا کرتے تھے کہ "یہاں رہنے سے ایک تو کالج آنے جانے کا مسئلہ حل ہوگیا، دوسرا بڑا فائدہ یہ

پوچھتا ہے، لیکن کلاہ گوشۂ دہقان خود تو آسمان تک نہیں پہنچ سکتا، جو پہنچا سکتا ہے کاش اُسے پہنچانے کا خیال آجائے۔

مولانا عبدالباری صاحب کے افاقہ کا حال دوسرے ذرائع سے بھی معلوم ہو رہا ہے، اپنی رخصت کی توسیع سرمائی تعطیل تک انھوں نے کرالی ہے، اب نوکری وہ چھوڑیں گے کیا نوکری بیچارے کو خود چھوڑ رہی ہے، بلکہ یہ مسئلہ موجودہ حالت میں مولوی صاحب کی تشویش کا سبب بنا ہوا ہے۔ بڑھاپے میں اہل و عیال والے ہو گئے ہیں جب زیادہ آمدنی کی ضرورت ہوتی ہے، اسی وقت آمدنی کا یکایک غیر معمولی حد تک کم ہو جانا موجب فکر ہی ہو سکتا ہے، کوئی کوشش اس سلسلہ میں انھوں نے ممکنہ حد تک اٹھا بھی نہ رکھی، لیکن اب تک اوپر کی منظوری نہیں ہوئی ہے، حق تعالیٰ فضل فرمائے، مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ من حیث لا یدری طور پر مولانا کا دماغ اس واقعہ کے احساس سے متاثر ہے۔ بلڈ پریشر کا جدید مرض کی شکل میں ان پر حملہ کرنا بلا وجہ نہیں ہے، دماغ پر لکھتے ہیں کہ زیادہ اثر ہے۔

اور کیا عرض کروں، "الدین القیم" پر جناب والا کی رائے معارف والی پڑھی "صوفیانہ علم کلام" نام آپ نے خوب رکھا، مجھے اس کا افسوس ہے کہ اپنے فطری اسہالی رنگ کے خوف سے پنسل برداشتہ والے اس مسودہ کو اسی اجمال و اختصار کی

ہوا کہ بلا ضرورت آنے جانے والوں کا سلسلہ بند ہوا، اور تصنیف و تالیف کے لیے کافی وقت نکل آیا۔ ۱۲۔

حالت میں شائع کرانا پڑا۔ اہلِ بصیرت تو اندازہ کر لیتے ہیں، لیکن عوام بیچارہ کو اس کا صحیح اندازہ لگانا کہ کن کن مسائل میں نئی راہیں اختیار کی گئی ہیں، ذرا مشکل ہے۔ گو بعضوں نے اعتراف کیا ہے، کہ تقریباً کتاب کے دو ثلث مسائل ایسے ہیں جن کے دعاوی تو ٹھیٹ قرآن و حدیث سے ماخوذ ہیں، لیکن استدلال میں کسی کی تقلید نہیں کی گئی ہے۔ لیکن بات آپ نے صحیح لکھی کہ متکلمین سے ہٹ کر در حقیقت حضرات صوفیہ کی زلہ ربائی کا یہ نتیجہ ہے۔ میرے پیش رو اس راہ میں شیخ اکبر[1] اور مولانا اسمٰعیل شہید[2] رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ کہیں کہیں

---

[1] شیخ ابوبکر محی الدین محمد بن علی الحاتمی ابن عربی اور شیخ اکبر کے نام سے مشہور ہیں، اندلس کے مشہور شہر مرسیہ میں ۵۶۰ھ میں پیدا ہوئے۔ علمائے اندلس سے تعلیم حاصل کی، علم تصوف میں امام کی حیثیت رکھتے ہیں، تصوف میں بہت اونچے مقام کے مالک تھے، علم تصوف پر "الجمع والتفصیل فی حقائق التنزیل" "الجذوۃ المقتبسۃ" کتاب کشف المعنی فی تفسیر الاسماء الحسنیٰ، فتوحات مکیہ وغیرہ قیمتی کتابیں تحریر فرمائیں۔ ۵۹۸ھ میں اندلس چھوڑ کر مشرق کا سفر کیا، حافظ سلفی ابن جوزی، ابن عساکر وغیرہ سے اجازت حدیث حاصل کی، مصر، حجاز میں بہت دنوں تک قیام کیا، بغداد، موصل، روم تشریف لے گئے۔

شیخ اکبر صوفیا کے امام ہیں، توحید کا ان پر غلبہ تھا، ان کے کچھ تفردات ہیں، جن کے صحیح محامل ہیں، علامہ گیلانی کو شیخ اکبر سے بڑا گہرا ربط تھا، اور شیخ کی تصنیفات کا بہت وسیع مطالعہ۔ ۲۸ ربیع الاول ۶۳۸ھ جمعہ کی شب میں شہر دمشق میں وفات پائی۔ اور شیخ قاسیون میں دفن کئے گئے۔ رحمۃ اللہ علیہ۔ ۱۲۔

اپنی اپنی جگہ بھی ہے، آپ نے حدیث کنز[1] پر جس کھٹکے کا اظہار کیا ہے، صحیح ہے، لیکن فقیر نے ملا علی قاری[2] کے اس بیان پر اس مسئلہ میں بھروسہ کیا ہے کہ "معناہ صحیح"، میرے نزدیک بھی

(حاشیہ صفحہ ۳۶۳) [؂۲] شاہ عبدالغنی محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے ہیں ۱۲۰۲ھ میں پیدا ہوئے، والد کی وفات کے بعد اپنے چچا حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے زیر سایہ تعلیم و تربیت حاصل کی، علم و فضل، فہم و ذکاوت ورثہ میں پایا تھا۔ مشکل سے مشکل مسائل منٹوں میں حل کر دیتے تھے، ہندوستان میں دینی رجحانات کو زندہ کرنے، بدعات و محدثات کو مٹانے اور دین خالص کو عام کرنے میں ان کا بڑا حصہ ہے، حضرت سید احمد بریلوی علیہ الرحمہ سے بیعت جہاد کی اور شہر شہر گھوم کر جہاد کی تبلیغ کی، بے نظیر خطیب اور سحر بیان واعظ تھے، فنون سپہ گری اور مختلف جنگی امور میں مہارت تامہ رکھتے تھے، پنجاب میں جہاد کرتے ہوئے ۱۲۴۶ھ میں جام شہادت نوش کیا، تقویۃ الایمان، صراط مستقیم، منصب امامت اور تنویر العینین کتابیں ان کی تصنیفی یادگار ہیں۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [؂۱] حدیث کے الفاظ یہ ہیں "کنت کنزا لا اعرف فاحببت ان اعرف فخلقت خلقا فعرفتہم فعرفونی" (موضوعات ملا علی القاری ص۶۲)۔

[؂۲] علی بن محمد سلطان القاری الہروی، ہرات میں پیدا ہوئے اور اپنے زمانہ کے مشہور محقق علامہ ابن حجر مکی ہیثمی سے مکہ آکر تعلیم حاصل کی، علوم عقلیہ و نقلیہ کے ماہر، مشہور حافظ حدیث اور عمیق فکر و نظر کے مالک تھے، پچاسوں کتب و رسائل کے مصنف ہیں، مرقاۃ شرح مشکوۃ، جمع الوسائل شرح شمائل اور موضوعات آپ کے قلم کا شاہکار ہیں،

واقعہ یہی ہے، موضوعات علی قاری[1] میں ملاحظہ فرمایا جائے، روایت تو مشکوۃ[2] میں بھی موجود ہے، باقی "ولا الضالین" کی تفسیر پر آپ کا یہ اعتراض کہ نص کے خلاف ہے، اس کا جواب تو اسی مضمون کے ذیل میں دیتا چلا گیا ہوں، غور فرمایا جاتا تو شاید اس کا اندازہ فرمایا جاتا، کہ بخاری[3] کی اس تفسیر سے غفلت نہیں برتی گئی ہے، ملاحظہ ہو ص ۲۱

شرح الوتریۃ والجزریۃ، شرح نخبۃ الفکر، شرح فقہ اکبر، وغیرہ کتابیں آپ کی تصانیف ہیں۔ ۱۰۱۴ھ میں وفات پائی۔ ۱۲-

[؂۱] امام ملا علی القاری کی تالیف ہے، جس میں موضوع حدیثوں پر تحقیقی تبصرہ کیا گیا ہے، اور کتب احادیث سے موضوع حدیثوں کا استخراج کیا گیا ہے، مطبع عامرہ میں چھپی ہے، اور تقریباً ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل ہے، رحمانیہ کتب خانہ، خانقاہ رحمانی مونگیر میں موجود ہے۔

[؂۲] امام محی السنہ ابو محمد الحسین البغوی نے حدیث میں ایک کتاب مصابیح لکھی تھی، لیکن انھوں نے حدیث کا متن لکھ دیا تھا، نہ کتاب کا حوالہ دیا، نہ راوی کا نام لکھا، اور نہ ابواب و فصول قائم کیں، اس لیے اس سے استفادہ مشکل تھا، شیخ ولی الدین محمد بن عبداللہ الخطیب التبریزی نے اسی مصابیح کے نہج پر مشکوۃ لکھی، اس میں ابواب و فصول بھی فقہی طرز پر مرتب کئے، اور ہر ایک حدیث کو اسی مقام پر درج کیا، باب و فصل میں درج کیا جس کے وہ مناسب تھی، ساتھ ہی ہر ایک حدیث کے اصل راوی کا نام اور جس کتاب سے وہ حدیث لی گئی ہے اس کا نام بھی لکھ دیا، جس کے بعد پورے سلسلہ رواۃ کو بیان کرنے کی ضرورت باقی نہ رہی کیونکہ ماخذ میں ان راویوں کے نام موجود ہیں، اسی لیے صاحب مشکوۃ نے لکھا ہے کہ

وانی اذا نسبت الحدیث الیھم کأنی اسندت الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم لانھم قد فرغوا عنہ واغنونا عنہ، مشکوٰۃ اپنے اختصار اور حسن ترتیب کی وجہ سے بہت مقبول ہوئی، اور آج بھی تمام مدارس عربیہ کے نصاب میں داخل ہے، صاحب مشکوٰۃ اپنے دور کے مشہور شیوخ اور زاہدوں میں تھے، اور ۷۳۶ھ میں مشکوٰۃ کی ترتیب سے فراغت پائی، رحمۃ اللہ علیہ۔

۵۳ اس کتاب کا پورا نام "الجامع الصحیح المختصر من امور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وسننہ وأیامہ" ہے۔ اس کے جامع شیخ الاسلام امیر المومنین فی الحدیث الحافظ الحجۃ ابو عبداللہ محمد بن اسمٰعیل البخاری ہیں، آپ کی ولادت ۱۳ شوال ۱۹۴ھ کو بخارا میں ہوئی۔ ۲۰۵ھ میں سماعت حدیث کی ابتدا اپنے وطن میں فرمائی، پھر مختلف دینی اور علمی مرکزوں کے سفر کیے،

صحیح بخاری کے متعلق خود ان کا بیان ہے کہ میں نے یہ کتاب سولہ سال میں ترتیب دی ہے اور اس التزام کے ساتھ کہ ہر حدیث کے اندراج سے قبل غسل کیا اور دو رکعت نماز پڑھی، اور اس کے مسودہ کو جناب نبی کریم علیہ الصلاۃ والسلام کی قبر مبارک اور منبر کے درمیان بیٹھ کر صاف کیا ہے اور میں نے اس میں کوئی ایک حدیث بھی ایسی درج نہیں کی جس کی صحت پر مجھ کو پورا بھروسہ نہ ہو۔ اور پھر فرماتے ہیں "جعلتہ حجۃ فی ما بینی وبین اللہ" میں نے اس کتاب کو اپنے اور اپنے پروردگار کے درمیان حجت بنایا ہے، یہ اپنی نوعیت کی دنیا میں سب سے پہلی تصنیف ہے جو فن حدیث میں مرتب کی گئی، حضرت امام بخاری نے جن شرائط کو مدنظر رکھتے

الدین القیم کے یہ الفاظ۔

"یہود مدینہ کو تجربات کے جو مواقع میسر آئے، وہ عموماً انصاری کو حاصل نہ تھے، اس لیے اگر بخاری میں عہد نبوت کے ان دو فرقوں میں سے ایک مغضوب علیہم اور دوسرے کو الضالین کے تحت داخل کیا گیا، تو ان الفاظ کی یہ ایک اچھی توضیحی مثال ہو سکتی ہے"

آپ نے دار المصنفین کے اندرونی قصوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ جو ارقام فرمایا ہے کہ میرے مبسوط خط کا تو نے جواب نہیں دیا، واللہ اعلم، اس سے اشارہ کس گرامی نامہ کی طرف ہے، ہو سکتا ہے کہ نہ ملا ہو، بہر حال قصہ یہ ہے کہ مولانا عبد الباری صاحب کے پاس آپ حضرات کے جو آخری خطوط آئے تھے، ان سے یہ معلوم کر کے تشفی

ہوئے اپنی کتاب میں حدیث کا استخراج کیا ہے وہ روایت کی قوت اور حدیث کی صحت کے معیار کو واضح کر دیتے ہیں، حضرت امام نوویؒ فرماتے ہیں "واما رجحانہ من حیث الاتصال فلاشتراطہ أن یکون الراوی قد ثبت لہ لقاء من روی عنہ ولو مرۃ واکتفی مسلم بمطلق المعاصرۃ" یہ اور اسی قسم کے مختلف امتیازات اور خصوصیات کی بنا پر جمہور علماء کا فیصلہ ہے کہ قرآن حکیم کے بعد صحیح ترین کتاب بخاری شریف ہے، صحیح بخاری کی مقبولیت کا اندازہ اس سے بخوبی ہو جاتا ہے کہ امام صاحب سے براہ راست نوے ہزار اشخاص نے پڑھا، سنا اور نقل کیا، اور اس وقت سے آج تک ہر دور میں اس کے پڑھنے اور سماعت و روایت کرنے والوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ بڑھتی ہی جا رہی ہے، بخاری شریف

ہوچکی تھی، کہ الحمد للہ خرخشہ مٹ چکا ہے، اعراض کی وجہ یہی ہوئی، واللہ اعلم، اس کے سمجھنے میں فقیر کہاں تک حق بجانب ہے، دعا تو یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے اس ایک ادارے کو تو جھگڑوں رگڑوں سے پاک رکھے، مجھے امید ہے کہ جب تک دار المصنفین کو آپ کا قلم و سکوت میسر ہے بدنمائی کی صورت انشاء اللہ ظاہر نہ ہوگی۔

یہ آپ نے خوب لکھا ہے کہ میں معینہ پر سار ہا ہوں، سچ عرض کرتا ہوں، لکھنے کے لیے فقیر نے اب تک خود کچھ نہیں لکھا ہے، جو کچھ بھی ہوجاتا ہے کوئی سر پر سوار ہو کر لکھوالیتا ہے، یا اسی قسم کی مجبوریاں پیش آجاتی ہیں، باقی آپ کا استغراق خدا کرے بڑھتا جائے، اس لیے کہ اُجرت میں اسی قدر اضافہ ہوگا جس حد تک نفس کی لذت اس میں شریک نہ ہوگی؛

"کتاب تعلیم و تربیت"، پر آپ ہی کچھ ارقام فرمائیں گے، یا کسی سے لکھوائیگا، بہرحال مجھے پہلے ہی سے معلوم ہے کہ۔ ؎

ایسی ضد کا کیا ٹھکانا، اپنا مذہب چھوڑ کر
ہم ہوئے کافر تو وہ کافر مسلماں ہوگیا

لیکن آج نہیں تو کل، کرنا مسلمانوں کو وہی پڑے گا، انشاء اللہ جو آج کہلایا گیا ہے،

وما ذلک علی اللہ بعزیز۔ مناظر احسن گیلانی۔

چھ لاکھ احادیث کا انتخاب ہے جس میں غیر مکرر حدیثیں چار ہزار ہیں۔ امام بخاریؒ کا انتقال یکم شوال ۲۵۶ھ شنبہ کی شب میں ہوا۔ رضی اللہ عنہ۔

۲۴ر اپریل ۱۹۴۵ء۔ دوشنبہ ۱۰ر جمادی الاولیٰ ۱۳۶۴ھ۔ گیلانی (بہار)

سیدی دمتم بالهناء والعافیۃ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

یہ عریضہ گیلانی سے لکھ رہا ہوں۔ ادھر حیدرآباد میں مختلف ذرائع سے معلوم ہوتا رہا کہ ملک بھوپال آپ کو اپنے محروسہ کا قاضی القضاۃ اور کسی نئی قائم ہونے والی جامعہ کا امیر بنا کر وہیں قیام کرانے پر مصر ہے خیال تھا، کہ اس مسئلہ پر بھی لکھنؤ ہی میں شفاہاً گفتگو کا موقع ملے گا۔ میرے نزدیک تو اس میں بظاہر کسی قسم کا حرج نہیں معلوم ہوتا، بھوپال میں رہ کر بھی جہاں تک میں خیال کرتا ہوں، آپ ان خدمات کو انجام دے سکتے ہیں، جنہیں اس وقت اعظم گڑھ میں انجام دے رہے ہیں۔ اور دار العلوم ندوۃ العلماء کی حقیقی نگرانی اعظم گڑھ سے اس وقت تک کر رہے ہیں، بھوپال سے بھی کر سکتے ہیں بلکہ اسی کے ساتھ اپنے خاص مقاصد و اغراض کے مطابق آپ تعلیمی مہمات کے حل پر بھی ایک حد تک قادر ہو سکتے ہیں۔ حیدرآباد میں تو دھوکہ دیا گیا، دار العلوم کو توڑ کر جامعہ بنانے کا خیال مولانا حمید الدین نے جن عزائم کے پیش نظر رکھ کر فرمایا تھا وہ پورے نہ ہوئے، افسوس کہ دار العلوم تو ٹوٹ گیا لیکن اسی کے ساتھ مولانا کے عزائم کو بھی بری طرح شکست نصیب ہوئی، شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ کا بوجھ بنا ہوا ہے، خدا کرے بھوپال میں آپ کو موقع اس شکست کی تلافی کا مل جائے۔

مجھے اس کا افسوس ہے کہ طول کلامی کی وجہ سے میرا مقصد لوگوں پر ظاہر نہ ہو سکا۔ حالانکہ اس کے سوا اور میں کیا چاہتا ہوں کہ اسلام کے اساسی علوم (قرآن و حدیث و فقہ)

کی تعلیم کو لازم قرار دے کر قدیم علوم کی جگہ جدید علوم و فنون کو قبول کر لیا جائے، اور اسلامی علوم سے کسی خاص فن میں کمال پیدا کرنے کے لیے تخصیصی درجے قائم کر دیے جائیں، میرا خیال ہے کہ اس طریقہ سے نصاب کی دوئی کو ختم کر کے مسلمانوں کے لیے ایک ہی تعلیمی نصاب کے قائم کرنے کا امکان پیدا ہو جاتا ہے، میری یہ بدقسمتی ہے کہ آپ جیسے بزرگوں نے بھی میرے منشا کے سمجھنے یا کم از کم سمجھانے میں تغافل سے کام لیا۔

بہرحال بھوپال میں اگر کوئی میدان عمل کا مل سکتا ہے تو اس کو چھوڑنا ممکن ہے کہ مسئولیت کی وجہ بن جائے، حیدرآباد کی سرزمین اس قسم کے اصلاحی کاروبار کے لیے کم از کم جہاں تک میرا تجربہ ہے شور ہے، لیکن علی یاور جنگ اگر آپ کے مشوروں سے مستفید ہونا چاہیں تو اس سے بھی گریز مناسب نہ ہوگا، ہو سکتا ہے کہ جامعہ عثمانیہ کے ساتھ ساتھ کسی جامعہ عربیہ کے قیام کا امکان پیدا ہو جائے۔

پٹنہ میں ایک ہفتہ کا قیام صرف سوز اور اندرونی کشمکش میں گذرا، عجب بے حسی اور مردنی وہاں کی اسلامی آبادی پر چھائی ہوئی ہے، آپ کی تجویز "جامع عظیم آباد" کا خیال مسلسل دماغ پر مسلط رہا، کاش! کسی مسجد جامع کے قائم کرنے میں وہاں کامیابی ہو جائے، آپ اگر ہمت سے کام لیں، تو بات زیادہ دشوار نہیں ہے۔ لان کے پاس جو ایک چھوٹی سی مسجد مسلمانوں کی ہے، مغرب کی نماز کئی دفعہ اس مسجد میں پڑھنے کا موقع ملا۔ اسی کے سامنے عیسائیوں کا ایک کلیسا بھی سڑک کے دوسری جانب قائم ہے۔ اس کی بلندی، اس کی صفائی، اس کا شاداب و سرسبز باغ اور زمین کی وسعت اس کے مقابلہ

میں مسلمانوں کا یہ جھونپڑا، دیر تک باعثِ تحسر بنا رہا خیال آتا تھا کتنے دن کی بات ہے اسی سرزمین کے ہم بادشاہ تھے، "تتبوء من الأرض من حیث نشاء" کا مقام اسی علاقہ میں حاصل تھا۔ اور آج جنہوں نے زمین کے ایک بڑے قطعہ پر قبضہ کر کے "صلیب خانہ" بنایا ہے ان کی حیثیت وہی تھی جو آج ہماری یہاں ہے، خالق کے پوجنے والوں کی، خالق کی زمین پر یہ بے بسی اور مخلوق پرستوں کا یہ زور بظاہر ایک غیر منطقی سی بات نظر آتی تھی، لیکن دل نے کہا کہ خالق پرستی کے مدعی، کاش خالق پرست ہوتے، تو یہ صورت ہی کیوں پیش آتی،

آپ کیا اب کی گرمیوں میں تشریف لائیں گے، آم کی فصل گیلانی میں تو اچھی ہے، میرے باغ میں دیہری کا ایک دو سالہ درخت تھا، پھلوں سے اس کو لدا ہوا پایا، اسی پر قیاس کر کے کہتا ہوں، کہ آپ کا باغ جو زیادہ تر دیہری کے درختوں سے عبارت ہے وہ تو قطوفہا دانیہ کا سماں پیش کر رہا ہوگا، اور کیا عرض کروں، بظاہر بدامنی میں کچھ خفت نظر آتی ہے، اگرچہ حال میں بھی ڈکیتی کا ایک واقعہ موضع دیوکلی[1] کے ایک بگھے میں پیش آیا ہے، ایک ساہوکاری کسان کے مکان پر ڈاکوؤں نے حملہ کیا اور نقد و زیور لوٹ کر لے گئے، بعض لوگ زخمی بھی ہوئے۔ نیازمند مناظر احسن گیلانی۔

---

[1] دیوکلی ضلع پٹنہ میں استھانواں سے چار میل جنوب میں واقع ہے، میرے علم میں اس چھوٹے گاؤں کی قابلِ ذکر شخصیت مولوی سید ابراہیم صاحب ریٹائرڈ سب جج ہیں جو راقم الحروف کی اہلیہ کے خالو ہیں۔ ۱۲

دوشنبہ ۱۴ مئی ۱۹۴۵ء ۔ یکم جمادی الاخری ۱۳۶۴ھ ۔ گیلانی ۔

سیدی و سید المسلمین ۔ متعنا اللہ بطول حیاتکم ۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ ۔

نوازش نامہ سے سرفرازی ہوئی ، دیر تک طبیعت آپ کی خانگی پریشانیوں کی خبر سے متاثر رہی ۔ بارے خدا کا شکر ہے کہ بچی کی طبیعت رو باصلاح ہے ۔ دنیا اسی کا نام ہے ۔ بھروسہ اس پر ہے کہ جس کے ہاتھ میں یہاں سب کچھ ہے خود اسی کی اطلاع یہ ہے کہ تمام رحم کرنے والوں سے قطعاً وہ سب سے زیادہ مہربان اور رحیم ہے پھر اپنے بال بچوں پر جب دل میں جو رحم کی کیفیت پیدا ہوتی ہے تو قطعاً حق تعالیٰ کی رحمت اس سے زیادہ اور بہت زیادہ ہے ۔ خود بخاری کی مشہور روایت ہے کہ رحمت الٰہی کا صرف ایک فیصدی حصہ ساری دنیا میں تقسیم[1] ہوا ہے ۔ بڑی مسرت اس سے ہوئی ہے کہ جس کے قبضۂ اقتدار میں میری دنیا اور میری آخرت ہے وہ ایسا رحیم ایسا مہربان ہے ، ممکن ہے کہ میرے ناقص معلومات مجھ میں اس قطعی اور یقینی حقیقت کے متعلق کچھ شکوک ابھارتے ہوں ۔ لیکن ناقص معلومات کے نتائج پر بھروسہ کرنا ، یہ تو خود عقل ہی کے

[1] حدیث کے الفاظ یہ ہیں ، "وعن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان للہ مائۃ رحمۃ ۔ انزل منہا رحمۃ واحدۃ بین الجن والانس والبہائم والہوام فبہا یتعاطفون وبہا یتراحمون وبہا تعطف الوحش علی ولدہا واخر اللہ تسعا و تسعین رحمۃ یرحم بہا عبادہ یوم القیامۃ (متفق علیہ مشکوٰۃ شریف باب الاستغفار)

مسلمات کے خلاف ہے اور معلومات کا ہمارے ناقص ہونا اجلی البدیہیات میں سے ہے ۔

حق تعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ کو اپنے تمام اہل بیت کے ساتھ امن و عافیت کے ساتھ رکھے ، اس وقت سرزمین ہند میں آپ کا وجود صحیح اسلام و ایمان کا ایک مرکزی ستون ہے ، خدا وندا ! ہمارے اس ستون کو دیر تک ہم میں قائم رکھ ۔ ہمایناد نقل دعا ہو ،

بھوپال کے معاملات میں آپ کے اقدامات کا انتظار رہے گا ۔ علی گڈھ سے جو خبریں مختلف ذرائع سے مجھ تک بالواسطہ پہنچ رہی تھیں ، وطن آنے کے بعد براہ راست خطاب کی ابتدا بھی ہو گئی ہے ۔ ایک خط ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب[1] کا آیا تھا ، میں نے

[1] ڈاکٹر سر ضیاء الدین مرحوم کا وطن میرٹھ تھا ، ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے ، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ اور کیمبرج یونیورسٹی کی ڈگریاں حاصل کیں ، تاریخ و ریاضی میں امتیاز حاصل تھا ، ملازمت میں لکچرار سے کر آخر میں وائس چانسلر و ریکٹر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ ہوئے ، مجلس قانون ساز و وائسرائے کی ڈیفنس کونسل کے ممبر رہے ،

ہونہار طلبہ کے لیے ان کے دل میں بڑی جگہ تھی ، ۱۹۴۸ء میں تعلیمی ترقیوں کا مطالعہ کرنے کے لیے یورپ گئے تھے ، لندن میں فالج کا حملہ ہوا اور وہیں دسمبر ۱۹۴۸ء میں انتقال کیا ۔ نعش بحری جہاز سے علی گڈھ لائی گئی ۔ اور ۲۱ فروری ۱۹۴۹ء کو سرسید کے پہلو میں دفن کئے گئے ۔ ۱۲

چند اصولی باتیں اس سلسلہ میں ان سے دریافت کی ہیں، پیش آنے والے واقعات سے ان شاء اللہ تعالیٰ آپ کو مطلع کرتا رہوں گا۔ اور وہی کروں گا جس کا آپ حضرات مشورہ دیں گے، زندگی کے لمحات بہت کم باقی ہیں۔ بڑا افسوس ہوتا ہے کہ کچھ کئے

دھرے بغیر مر رہا ہوں۔

اس کا مجھے خود افسوس ہے کہ نہ لکھنؤ ہی کی حاضری کا موقع مل سکا، اور اعظم گڈھ تو میرے لیے ہمیشہ سے اعظم گڈھ ہی بنا رہا ہے۔ جب گڈھ تک چڑھائی میری کوتاہ قسمت میں شاید نہیں، بہرحال رسمی ملاقاتوں سے کیا ہوتا ہے۔ "ایمانی خلت" کا رشتہ جن قلوب میں قائم ہے اجسام کی ملاقات سے اگر وہ محروم بھی ہوں تو یہ محرومی نہیں ہے۔

اس خبر سے ذرہ تکلیف ہوئی کہ آپ کی گرمیوں میں دسنہ کو اپنی رونق افروزی سے محروم رکھا جائے گا۔ خیال تھا کہ پرانی آرزو بہار کے کتب خانوں کی سیر آپ کی معیت میں شاید پوری ہوتی، لیکن بلا کی گرمی ہے، اس قسم کی سیر وغیرہ کے لیے سرما ہی کا موسم کچھ مناسب ہوتا ہے، لیکن اس وقت نہ مجھے فرصت ہوتی ہے، اور نہ آپ فرصت حاصل کرتے ہیں، سخت کڑی تکلیف ہوتی ہے کہ خضر چک[1] اور نسکر انواں[2] کا کتب خانہ دونوں تباہی کے قریب آ لگا ہے، نالائق وارثوں کا عجیب حال ہے، نہ خود ان کتابوں کی

---

[1] شمالی مونگیر میں ایک گاؤں خضر چک ہے یہ کتب خانہ وہیں واقع ہے، کتب خانہ کے بانی اور جامع مولانا سید محمد حسن محدث ہیں، آپ کے والد منشی غلام یحییٰ موضع مظفرہ متصل بیگو سرائے ضلع مونگیر کے رہنے والے تھے، اور انگریزی حکومت میں ناظر کے منصب پر

(باقی ص ۳۷۵ پر)

سرفراز، ملازمت کے سلسلہ میں ایک عرصہ تک پورنیہ بھی رہے، ملازمت کے علاوہ بڑی جائداد کے مالک تھے، جوانی ہی میں موضع مظفرہ سے خضر چک آکر مقیم ہو گئے تھے، اس وقت خضر چک کا علاقہ سرکار ترہت میں تھا، اپنے صاحبزادہ مولانا محمد محسن کی تعلیم پر دل کھول کر خرچ کیا، مولانا علیہ الرحمہ نے ابتدائی تعلیم کلکتہ میں اور انتہائی تعلیم دلی میں حاصل کی اور حضرت شاہ عبد الغنی محدث دہلوی کے ارشد تلامذہ میں تھے، آپ ہی نے "الیانع الجنی فی أسانید الشیخ عبد الغنی" لکھی، ہندوستان سے علوم مروجہ کی فراغت کے بعد مکہ معظمہ چلے گئے، اور وہاں کے شیوخ سے استفادہ کیا، اور مسلسل سات سال مکہ مکرمہ میں مقیم رہے، اور مسجد حرام میں درس دیتے رہے، وہیں سے کتابیں جمع کرنا شروع کیں، حجاز کے کتب خانوں میں جو نایاب کتابیں تھیں، ان کی نقلیں کرائیں، اور مطبوعہ کتابیں بازار سے لیں، جب ہندوستان واپس آئے تو ایک قیمتی کتب خانہ بھی اپنے ساتھ لائے جسے اپنے مکان واقع خضر چک ضلع مونگیر میں مرتب کیا اور سجایا، ایک روایت کے مطابق کتب خانہ میں کتابوں کی تعداد تقریباً بیس ہزار تھی، تعداد جو بھی ہو لیکن کتب خانہ وسیع اور قیمتی تھا۔ خصوصاً فن حدیث کا بہترین متداول اور نایاب ذخیرہ یہاں موجود تھا، سنہ ۱۹[illegible]ء میں ہندوؤں نے بعض خلاف کی بنا پر گاؤں پر حملہ کیا، باغوں کے درخت تک کاٹ ڈالے اور کتب خانہ کی کتابوں کو دریا میں ڈال دیا اور پھاڑ دیا۔ پھر بھی پانچ ہزار کتابیں رہ گئی تھیں، خود مولانا گیلانی نے خضر چک جا کر استفادہ کیا ہے۔ حیدرآباد سے شائع شدہ مستدرک حاکم کی جن نسخوں کو سامنے رکھ کر تصحیح کی گئی ہے اس میں ایک نسخہ خضر چک کے کتب خانہ سے لیا گیا تھا،

مولانا سید ہاشم ندوی نے مستدرک حاکم مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد ۱۳۴۱ھ میں خاتمۃ الکتاب کے تحت لکھا ہے "انا جمعنا نسخا عدیدۃ لمستدرک الحاکم من مکاتیب شتی ...... منہا نسخۃ ...... ناقصۃ من مکتبۃ امیرالدین اشرف الگیلانی"۔ یہ امیرالدین اشرف محدث موصوف کے بھانجے ہیں، اور ان کے مکتبہ سے مراد کتب خانہ خضر چک ہی ہے، افسوس کہ ہندوؤں کے حملہ سے بچی ہوئی کتابیں بھی اب بالکل ضائع ہو گئیں۔ راقم الحروف نے آج سے تین سال پہلے اس کی فہرست تیار کرائی تھی، اب کل ۲۴۷ کتابیں ہیں، وہ بھی اکثر ناقص جن میں نایاب قابل ذکر ایک بھی نہیں ہے!

لے ضلع پٹنہ کی مشرقی سرحد پر ایک گاؤں نگرانواں ہے، سو سوا سو مسلم آبادی میں ۲۰-۲۲ گھر شیوخ و سادات کے ہیں۔ اسی گاؤں کے ایک صدیقی خانوادہ میں (جو بڑی جائیداد اور دولت کا مالک تھا) مولانا رفیع الدین پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد گیلانی چلے گئے اور اپنے عصر کے مشہور فاضل مولانا احسن گیلانی (جد امجد صاحب مکاتیب) کی خدمت میں سات سال رہ کر علوم عربیہ میں کمال پیدا کیا۔ پھر دہلی جا کر مولانا نذیر حسین بہاری ثم الدہلوی سے حدیث پڑھی۔ دہلی سے واپس ہوئے تو ایک ہینڈ پریس ساتھ لیتے آئے اور نگرانواں ہی سے قلمی غیر مطبوعہ نسخوں کی طباعت و اشاعت ہوئی۔ کتابوں کے جمع کرنے کا بڑا شوق تھا۔ دولت کا صحیح مصرف لیا۔ حجاز گئے اور مکہ و مدینہ کے کتب خانوں سے نایاب کتابوں کی نقلیں کرائیں۔ مولانا ابو سلمہ محمد شفیع صاحب نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ صرف مدینہ کے کتب خانوں میں مولانا رفیع الدین کی طرف سے ڈیڑھ سو وراق روزانہ

(باقی ص ۳۷۷ پر)

خدمت کرتے ہیں، اور جہاں ان کی خدمت ہو سکتی ہے وہاں منتقل بھی نہیں کرتے،

آپ نے اپنے گرامی نامہ میں میری تعلیمی تجویز کے متعلق مختصر مضمون کا مطالبہ فرمایا ہے، ارشاد کی تعمیل میں اسی وقت بیٹھ گیا، اور مرتب کر کے بھیج رہا ہوں۔ واللہ اعلم اپنے مافی الضمیر کو صحیح طور پر اس میں پیش کرنے میں کامیاب ہوا ہوں یا نہیں ہوا ہوں۔ اشاعت کے لائق ہو تو کوئی ایسی صورت پیدا کیجیے کہ زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو مطالعہ کا موقع ملے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ اس قسم کی تجویزوں کو عملی قالب تک پہنچانا صرف مقالہ نگاریوں سے ناممکن ہے، اس کے لیے تو میدان میں اترنے کی ضرورت ہے، ہو سکتا ہے کہ کوئی مرد میدان غیب سے حق تعالیٰ فراہم فرمائیں، حیدرآباد سے تو میں مایوس ہوں۔ اور حیدرآباد کی سرزمین اس قابل بھی نہیں ہے، کہ اصلاحی قدم وہاں اٹھایا جائے،

مولوی مسعود عالم[۱] صاحب کی کتاب جس پر آپ کا مقدمہ ہے، اگر دار المصنفین میں

نقل کے کام پر مامور تھے۔ اور اس طرح حدیث و تفسیر کا بہترین اور نایاب ذخیرہ نگرانواں منتقل ہوا۔ اور پھر مولانا نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر مخطوطات جمع کیں اس زمانہ میں مولانا رفیع الدین نے کئی لاکھ روپے کتابوں کے جمع کرنے پر خرچ کئے۔ مولانا گیلانی نے نظام تعلیم و تربیت میں لکھا ہے کہ "حافظ ابن قیم اور ابن تیمیہ کی تصنیفات کا قلمی ذخیرہ جتنا بڑا یہاں جمع ہو گیا ہے شاید ہندوستان میں تو کہیں اتنا بڑا سرمایہ نہ ہوگا"۔ بہرحال یہ کتب خانہ ہندوستان کے اہم ترین کتب خانوں میں ہے، اور آج بھی نایاب کتابوں اور قیمتی مخطوطات کا اچھا ذخیرہ موجود ہے۔ ۱۲۔ [۱] مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم

ملی ہو تو ایک نسخہ اس کا گیلانی کے پتہ سے بھجوا دیجئے، آپ کا مقدمہ میں نے نہیں پڑھا ہے، سخت اشتیاق ہے۔

آم کی پکائی کا آغاز ابھی نہیں ہوا ہے لیکن قریب الختم[2] ہے، دسہری کا ایک مختصر کمسن سا درخت میرے نئے باغ میں کہیں سے آگیا تھا اس نے تو وہ سماں قائم کیا ہے کہ تماشا گاہ بن گیا ہے، اس کو تو دیکھ کر تو میاں مکارم سے کہہ رہا ہوں اگر دسہری کا ایک مستقل باغ ہی لگا دو۔ مکارم کا بیان ہے کہ آپ نے بھی اپنی دسہری سے قلم لینے کی اجازت عطا فرمائی تھی۔

"مناظر احسن گیلانی"

موضع ادگانواں (ضلع پٹنہ) میں ۱۱ محرم ۱۳۲۸ھ (فروری ۱۹۱۰ء) کو پیدا ہوئے آپ کے والد صوفی منش عالم دین اور مدرسہ اسلامیہ بہار شریف میں مدرس تھے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی اور تکمیل ندوۃ العلماء لکھنؤ میں کی مولانا مسعود عالم کو عربی ادب سے گہری مناسبت اور اس پر بڑی قدرت حاصل تھی، اردو میں بھی صاحب قلم شمار کئے گئے ہیں، تاریخ اسلام پر وسیع نظر رکھتے تھے، متعدد کتابوں کے مصنف ہوئے، ابتداءً خدا بخش خاں لائبریری پٹنہ میں کیٹیلاگر کی حیثیت سے کام کرتے رہے، ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۵ء تک لکھنؤ سے عربی ماہنامہ الضیاء نکالتے رہے۔ چند برسوں کے بعد مولانا مودودی کی تحریروں سے متاثر ہو کر جماعت اسلامی میں شرکت کی، اور پھر اسی کے ہو کر رہے۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلے گئے۔ جماعت اسلامی کے مبلغ کی حیثیت سے ممالک اسلامی کا دورہ کیا، ۱۶ مارچ ۱۹۵۴ء کو کراچی میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا، رحمہ اللہ ۱۲

۲ پکنے سے قریب ۱۲

۱۲ ستمبر ۱۹۴۵ء - ۳ شوال ۱۳۶۴ھ - سہ شنبہ - حیدرآباد دکن۔

سیدی و سید المسلمین، متعنا اللہ بطول بقائکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ایک مدت سے خاکسار بھی جناب سے روپوش ہے، اور ظاہر ہے کہ درویش بے نوا کے تفقد حال کا خیال صاحبان کرامت کو سلامتی کے تشکرانے میں کیوں ہونے لگا۔ بہرحال مولانا عبدالباری صاحب کے خطوط سے آپ کی خیر و عافیت کا حال معلوم ہوتا رہا، میری روپوشی کی وجہ یہ تھی کہ مولانا ظفر احمد[1] صاحب کا مضمون معارف میں جب شائع ہوا، اس وقت فقیر گیلانی میں تھا، خیال تو گذرا کہ گیلانی ہی سے جواب لکھ کر بھیج دوں۔ لیکن بعض کتابیں جن کی ضرورت اس مسئلہ کے متعلق تھی وہ گیلانی میں میرے پاس نہ تھیں اس لیے خیال ملتوی کر دیا۔ حیدرآباد پہنچ کر حیدرآبادی جھنجھٹوں میں الجھا رہا، چاہتا تھا کہ لکھنے کی فرصت نکالوں، لیکن میسر نہ ہوتی تھی، اسی خیال سے کہ خط

---

۱ مولانا ظفر احمد عثمانی کا وطن دیوبند ضلع سہارنپور ہے۔ ۱۳۱۰ھ کو وطن ہی میں پیدا ہوئے تعلیم دارالعلوم دیوبند تھانہ بھون، اور جامع العلوم کانپور میں حاصل کی، اور ۱۳۲۸ھ ۱۹۱۰ء میں مظاہر العلوم سہارنپور سے فراغت حاصل کی، چند سال مظاہر العلوم سہارنپور اور تھانہ بھون میں مدرس بھی رہے۔ حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے خواہر زادہ اور تربیت یافتہ ہیں، دیوبند چھوڑ کر تھانہ بھون کی سکونت اختیار کر لی تھی حضرت تھانوی کی نگرانی میں حدیث کا مجموعہ کئی جلدوں میں احناف کے نقطۂ نظر سے جمع کیا۔ جو اعلاء السنن کے نام سے شائع ہو چکا ہے حضرت تھانوی کے مجاز بھی ہیں۔

مضمون کے ساتھ لکھوں گا، مہینے گذرتے رہے ادھر رمضان میں کچھ فرصت میسر آئی۔ لیکن رمضان کا دن روزوں کے خمار میں گذرتا ہے۔ رات کو رمضان کے لیلی مشاغل کے بعد کچھ فرصت جو ملی تو تھوڑا تھوڑا کر کے لکھنا شروع کیا، لکھ کر میرے ایک دوست جو آج کل اضلاع پر ہیں، ان کی خدمت میں مسودہ کو مبیضہ کرنے کے لیے بھیج دیا۔ انھوں نے کافی تاخیر کے بعد مبیضہ ارسال کیا، آج جا کر اس کام کا مرحلہ طے ہوا، اور خدمت والا میں حسب وعدہ اپنے حقیر معلومات جو اس باب میں ہیں انھیں پیش کر رہا ہوں، پہلے تو آپ ہی دیکھ جائیے۔ پھر مضمون آپ کے نزدیک قابلِ اشاعت نظر آئے، تو معارف میں شائع فرما دیجئے۔ اپنی حد تک اس مسئلہ میں اپنے ضمیر کو میں بالکل مطمئن پاتا ہوں، مجھے مولانا ظفر احمد صاحب پر تعجب ہے کہ انھوں نے اس مسئلہ کے مالہا و ماعلیہا کا مطالعہ بہت سرسری طور پر فرمایا ہے، ان کے اعتراضات اب میں کیا عرض کروں طالب العلمانہ نوعیت سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے، حیرت ہے کہ "خلافیات" پر لکھنے لکھانے کا ان کو کافی موقعہ ملا ہے، لیکن اس مسئلہ میں خدا ہی جانتا ہے کہ اتنی بے توجہی سے انھوں نے کیوں کام لیا، بہر حال میں شدت سے آپ کے جواب کا منتظر رہوں گا، گو اسی کے ساتھ یہ بھی جانتا ہوں کہ پڑھنے کے لیے مشکل ہی سے آپ کو موقع مل سکے گا خصوصاً

آٹھ سال تک ڈھاکہ یونیورسٹی میں دینیات کے لکچرار رہے۔ پھر مدرسہ عالیہ ڈھاکہ میں مدرس اول کے عہدے پر مامور ہوئے۔ اور ۱۹۵۵ء سے دار العلوم اسلامیہ ٹنڈو الہ یار خاں ضلع حیدرآباد سندھ کے شیخ الحدیث ہیں۔ ۱۲

مضمون میں باوجود اختصار کے ارادے کے کافی طوالت ہوگئی، دو نمبروں سے کم میں مشکل ہی سے گنجائش پیدا ہو سکے گی، لیکن وقت ضرور نکالیے۔ مختلف جلسات میں ختم کیجیے، لیکن ضرور پڑھیے،

اور حالات کیا لکھوں، اس کا علم تو ہو ہی چکا ہوگا کہ مولانا عبد الباری کی چوبیس سالہ رفاقت آخر اس فقیر کے ساتھ ختم ہوگئی۔ حالانکہ ان کے آنے کے بعد بڑی توقع قائم ہوگئی تھی، کہ کچھ دن اس رفاقت کی مدت اور بڑھ جائے گی، لیکن حریفوں نے عین وقت پر کچھ ایسی چالیں چلیں، کہ مولانا کو جائزہ دے ہی دینا پڑا، اس میں تو کوئی حرج نہیں تھا، افسوس صرف اس کا ہے کہ ان کے حسن خدمات کا صلہ خدمات کی نوعیت کے مطابق نہ ملا، کل دو سو اکیس روپے کچھ آنے حالی سکہ سے ابھی وظیفہ منظور ہوا ہے تاہم تین سو کی تکمیل ہو جائے، اس کے لیے کئی سال سے کوشش کا سلسلہ جاری رہا ہے، لیکن فیصلہ اس کا ہونے بھی نہ پایا کہ مولانا کی ملازمت کی مدت ہی ختم ہوگئی، تاہم ابھی امید منقطع نہیں ہوئی ہے، خدا کرے طے ہو جائے، میرا تو خیال ہے کہ دار المصنفین کا کچھ کام اگر مولانا کے سپرد فرما دیجئے تو ان کے خواطر و سوانح کی بقا کی بھی شکل نکل آئیگی، دار المصنفین کے خدمات میں ایک قیمتی سلسلہ کا اضافہ بھی ہو جائے گا، اور یہ ہو سکتا ہے کہ کچھ معاشی سہولت بھی مولانا کو خصوصاً گرانی کے اس زمانہ میں اس ذریعہ سے میسر آجائے، آخر اب تو وہ فارغ ہیں، ہر سال ایک ہی کتاب اگر لکھ دیا کریں، تو بہت کچھ کام ہو جائے گا، تصنیف نہ کریں تو ترجمہ ہی کا کام ان سے لیجئے، کچھ ندوہ کو

بھی مستفید ہونے کا موقع ان سے حاصل ہو جائے، تو یہ بھی ایک مفید مصرف ان کے علم کا ہوگا۔ ان کا خیال تھا کہ کچھ سرمایہ جمع کر کے اعلیٰ عربی مخطوطات کی اشاعت کا سامان کسی پریس سے کیا جائے آپ بھی اگر اس میں شرکت فرمائیں، تو فقیر بھی شریک ہونے کی ممکن ہے ہمت کرے۔

یہ بھی معلوم ہوا ہوگا کہ اچانک اعلیٰ حضرت کی توجہ مدرسہ نظامیہ کی اصلاح کی طرف مبذول ہوئی ہے، جیسا کہ ان کا قاعدہ ہے جدھر رخ پھر گیا پھر گیا، مسلسل فرامین صبح دکن میں نکل رہے ہیں، اسی سلسلہ میں ایک فرمان یہ بھی نکلا ہے کہ مولوی شبیر احمد صاحب کو بلا کر مدرسہ نظامیہ ان کے سپرد کیا جائے۔ ادھر اُدھر سے یہ خبر ملی کہ غالباً آپ کی تلاش بھی اسی سلسلہ میں ہوئی تھی، لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کچھ آپ کے پاس بھی خطوط وغیرہ پہنچے تھے، مولوی شبیر احمد صاحب کو تو مسلسل تار اور خطوط سے ڈھانک لیا گیا تھا، سنا ہے حیدرآباد آنے پر مولانا نے اپنی رضامندی ظاہر بھی فرمادی ہے، لیکن میرے نزدیک مولانا کے حق میں یہ کچھ اچھا نہ ہوا، حیدرآباد اہلِ کمال کا مدفن ہے، اب تک جتنی بلندی ان کو حاصل ہے، حیدرآباد پہنچنے کے بعد یہ قطعاً باقی نہ رہے گی، لیکن ما قدر اللہ فسوف یکون، فاللّٰہم نعوذ بک من الحور بعد الکور۔

فرمائیے بھوپال کے متعلق آپ نے کیا کیا؟ حکومت حمیدیہ کا رویہ اب کس نقطہ پر ہے۔؟

علی گڑھ سے بس ایک خط میرے پاس گرمیوں کی تعطیل میں آیا تھا، میں نے اس کا جواب اسی وقت دے دیا تھا، اور آپ میرٹھ میں تھے، یاد پڑتا ہے کہ آپ کو بھی آگاہ کر دیا تھا۔ آپ نے ارقام فرمایا تھا کہ پروفیسری سے کم کی جگہ نہ قبول کرنا، اسی ارشاد پر اب تک قائم ہوں، مگر اب نوکری سے جی گھبراتا ہے۔ اور حیدرآباد سے تو بہت زیادہ گھبرا گیا ہوں۔ ایسا جی چاہتا ہے، کہ آج ہی مدت ملازمت ختم ہو جاتی تو مولانا عبدالباری کے ساتھ ؎

رخصت لئے اپنا دکن سے ہوئے وطن جاتا ہوں
آہ! اس آباد ویرانے میں گھبراتا ہوں میں،

کہتا ہوا گیلانی کے گوشہ میں جا کر چھپ جاتا لیکن ما شاء اللہ سارا معاملہ اٹکا ہوا ہے۔ اب دم واپسیں کا خیال سر پر مسلط زیادہ رہتا ہے، ؎

وقت طلوع دیکھا، وقت غروب دیکھا
اب وقت آخری ہے دنیا کو خوب دیکھا

مناظر احسن گیلانی۔

---

۶ ذی قعدہ ۱۳۶۴ھ / ۱۳ اکتوبر ۱۹۴۵ء شنبہ۔

سیدی و سیدی المسلمین اطال اللہ بقائکم، ونفعنا المسلمین بطول حیاتکم۔

ملفوف گرامی نامہ ملا، کئی دن پہلے ہی مل چکا تھا، جواب بھی اس کا لکھ چکا تھا کہ کارڈ بھی ملا، پہلے خط کو منسوخ کرنا پڑا، اس خبر سے گونہ اطمینان ہوا کہ بالفعل کوئی ظاہری تکلیف باقی نہیں رہی ہے۔ لیکن ۲۴ گھنٹے کھڑے کھڑے گذار دینا

میرے لیے تو اس کا تخیل بھی تکلیف کی شکل اختیار کیے ہوئے ہے۔ جس کسی نے سُنا اسے قدرۃً تکلیف پہنچی، کیا عرض کروں ہم جیسے گنہگاروں اور سیاہ کاروں کے لیے تو یہ امراض و مصائب سب کفارے کی حیثیت رکھتے ہیں، سمجھتا ہوں کہ جن سزاؤں کو جہنم میں بھگتنے والا تھا، شاید ارحم الراحمین کی رحمت شاملہ نے ان ہی کو دنیاوی مصائب والام کی شکل میں بدل دیا ہے، لیکن آپ حضرات سے متعلق کیا عرض کروں، ہاں اس کو کمال وفاداری کے اظہار کی ایک شکل کہہ سکتے ہیں، الحمدللہ کہ اب جب اس مقام پر ہے جہاں پڑا رہنا چاہیے۔ تو ڈاکٹروں کے اس کہنے سے کیا ہوتا ہے، کہ وہ گھٹ گیا ہے یا بڑھ گیا، حضرت سلطان جی[۱] نے ایک لطیفہ نقل کیا ہے، کہ کسی برہمن پر راجہ یا بادشاہ کا عتاب ہوا، سب کچھ ضبط کر لیا گیا، جو اس کے پاس تھا، کسی نے پوچھا کہ کیسی گذر رہی ہے

۱۔ سلطان جی سے مراد حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ ہیں، مولانا گیلانی علیہ الرحمہ نے مندرجہ بالا واقعہ اپنی گرانقدر تصنیف "نظام تعلیم و تربیت کے حصہ دوم" میں "فوائد الفواد" سے نقل کیا ہے۔ اس واقعہ کے راوی امیر حسن علا ہیں۔ حضرت سلطان جی کا اسم گرامی سید محمد، القاب محبوب الٰہی، سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء وغیرہ تھے۔ ساتویں صدی ہجری ہندوستان کے لیے بڑی مبارک تھی، یہاں اس صدی ہجری میں بڑے بڑے نامور علماء اور کامل اولیاء اللہ پیدا ہوئے۔ اسی صدی یعنی سنہ ۶۳۴ھ میں حضرت شیخ نظام الدین اولیاء قدس اللہ سرہٗ کی ولادت شہر بدایوں میں ہوئی۔ فضلائے وقت سے تعلیم حاصل کی بچپن ہی سے بزرگی کے آثار ہویدا تھے۔ مولانا شمس الدینؒ

دامغانی کے یہاں خواجہ کا سبق تھا جب کبھی ناغہ ہو جاتا اور پھر خواجہؒ استاد کی خدمت میں پہنچتے تو مولانا شمس الدین خواجہ کو دیکھ کر ذیل کا شعر پڑھتے۔

بارے کم از آنکہ گاہ گاہے — آئی و بما کنی نگاہے۔

علوم ظاہری سے فراغت کے بعد حضرت شیخ العالم بابا فرید گنج شکرؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ عوارف المعارف، اور تمہید ابوشکور سالمی پڑھی بیعت کی اور شیخ کی صحبت سے مستفید ہوئے۔ اور اجازت و خلافت سے سرفراز ہو کر دلی آئے۔ اور رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری کیا۔ خواجہؒ کا ابتدائی دور دلی میں بھی فقر و فاقہ ہی سے گذرا۔ لیکن پھر حق تعالیٰ نے فتوحات کے ایسے دروازے کھولے کہ فقیری میں بادشاہی کی۔ ہندوستان کے بڑے حصے میں سلسلۂ چشتیہ خواجہ ہی کے ذریعہ پھیلا۔

آپ کی خانقاہ میں سماع کی مجالس ہوتی تھی لیکن مزامیر اور محذورات شرعیہ سے پاک، فوائد الفواد میں مذکور ہے کہ خواجہؒ نے فرمایا "سماع کے لیے چار شرطیں لازم ہیں۔ سنانے والا لڑکا اور عورت نہ ہو۔ جو چیز سنی جائے وہ ہزلیات اور فواحش سے پاک ہو، جو شخص سنے وہ صرف خدا کے لیے سنے۔ اور سماع دف و چغانہ کے ساتھ امام شافعی علیہ الرحمہ کے یہاں جائز ہے۔ لیکن ہمارے علمائے احناف اس کے خلاف ہیں۔

آپ نے ایک روز خواب دیکھا کہ سرورِ کائنات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ نظام تم سے ملنے کا بڑا اشتیاق ہے۔ اس خواب کے بعد آپ نے سفر آخرت کی تیاری کی، وصال کے روز لنگر خانہ اور آپ کی ملکیت میں جتنی چیزیں تھیں غرباء اور مساکین میں

بولا "غوب مگی گذرد"، پوچھنے والے نے کہا سب کچھ تو ضبط ہو گیا یہ خوب کیسے گذرتی ہو گی، بولا "زنادمن با من است" بس ایمان ساتھ رہ جائے، اور انشاء اللہ وہ اپنی جگہ قائم ہے۔ الحمد للہ کہ اہل ایمان نے آپ کے ایمان کی توثیق کی ہے، اس سے زیادہ اب اور کیا چاہیے۔ ایک لطیفہ مجھے اپنا بھی یاد آیا، زخموں سے چور پہلی دفعہ جب پٹنہ اسپتال میں داخل ہوا تھا، اس وقت آپ نے نہیں دیکھا تھا، دوسرے حملہ میں آپ سے پٹنہ میں ملاقات ہوئی تھی، اس وقت جسم کے ہر حصہ اور ہر عضو میں اندرونی زخم پیدا ہو گئے تھے، ان کی ٹیک اور کرب دبے چینی جو ہوتی تھی کیا عرض کروں، بلا مبالغہ عرض کر رہا ہوں، کہ تقریباً دو ماہ میرے اس اسپتال میں جو گذرے تمام آرزوئیں دل سے نکل گئی تھیں، اور باقی کوئی آرزو اگر اس دنیا کے متعلق رہ گئی تھی، تو صرف یہ کہ دو ہی سکنڈ کے لیے سہی، لیکن مجھے کوئی بٹھا دیتا، پیٹھ پر بھی جو سوتا تھا، تو درد زخموں پر سوتا تھا، دونوں شق میں ایک ایک زخم تھا، اندرونی کئی کئی دن کے بعد آپریشن کر کے ان کا پورا مواد خارج کیا جاتا تھا، خیر قصہ یہ ہے کہ اسی وارڈ میں جس میں میں تھا، ایک صاحب مریض بن کر آئے غالباً ان کو سل یا دق کی بیماری تھی، مجھ جیسے مردہ کے پلنگ کے پاس کبھی کبھی آ کر بیٹھ جاتے، لیکن ہمیشہ مغموم اور متفکر سر جھکائے رہتے،

تقسیم کر دیں۔ صبح کی نماز پڑھی اور جب آفتاب طلوع ہو رہا تھا۔ دین کا یہ آفتاب ابد کے پردوں میں مستور ہو گیا۔ تاریخ وفات ۸ ربیع الاول ۱۳۷۵ھ ہے، رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

میں نے وجہ پوچھی تو کہنے لگے کہ مولانا! آپ کی بیماری تو ایسی ہے جس سے انشاء اللہ شفا کی توقع بھی ہے۔ اور مجھے تو ایسی بیماری نے پکڑا ہے کہ جان ہی لے کے ٹلے گی۔ اس پر فقیر نے ان سے ایک بات کہی تھی، میں نے عرض کیا کہ بھائی! یہ تو صحیح ہے کہ مرنے کا خطرہ آپ کے سامنے ہے، لیکن یہ خطرہ کب پیش آئے گا، اس کی مدت تو مقرر نہیں ہے، اور اگر اسی کو آپ خطرہ قرار دیئے ہوئے ہیں تو میرے نزدیک ہر وہ شخص جس میں زندگی اور حیات کی بیماری پیدا ہو گئی ہے اس کو مرنا پڑے گا، اس میں آپ کی کیا خصوصیت ہے۔ اس مرض میں تو ہر وہ شخص مبتلا ہے جسے لوگ حَیّ اور زندہ کہتے ہیں۔ کی تھی تو میں نے شاعری، لیکن اس مریض کو دیکھا کہ اچانک اس کا چہرہ بشاش ہو گیا، اور کہنے لگا یہ تو آپ نے ایسی بات کہی، کہ انشاء اللہ مجھے یہ فکر تو کبھی ستا نہیں سکتی، بعد کو جب ملنے آئے تو یہی کہتے کہ "زندگی خود ایک بیماری ہے جسے لگ گئی اسے مرنا ہی پڑے گا۔" واہ مولوی صاحب آپ نے خوب بات فرمائی، واقعہ یہ ہے کہ اب جب میں سوچتا ہوں، تو بات اتنی غلط میں نے نہیں کہی تھی۔

آپ کے دوسرے والا نامہ میں یاس کے آثار بہت محسوس ہوئے، لیکن اسی کے ساتھ یہ عجیب بات آپ نے ارقام فرمائی، کہ اب تم لوگ اسے سنبھالو! گویا جن لوگوں سے آپ کا خطاب ہے کچھ زیادہ وقفہ ان کی زندگی میں کہ ہے، پچاس سے متجاوز ہو جانے کے بعد زندگی کا انسانی حق میرے نزدیک ختم ہو جاتا ہے، انسانیت

کے کامل ترین نمونہ نے یہی نمونہ ہمارے لیے چھوڑا ہے، باقی اس کے بعد کیا ہوگا جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی دنیا چلتی رہی۔ اور دنیا کیا دین کا کام بھی چلتا ہی رہا۔ تو اب اس کے بعد کوئی ہو، ہم ہوں یا آپ، کسی پر بھی ظاہر ہے کہ دین و دنیا کا کوئی کام موقوف نہیں رہ سکتا، خداوند تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ ایک بڑے مومن کا دامن آپ کو آخر وقت میں مل گیا، اور مجھے تو سب سے زیادہ مسرت اسی کی ہے کہ آپ کا رابطہ بالشیخ بحمد اللہ غیر معمولی طور پر محکم و استوار ہے، حق تعالیٰ کے آپ محبوب ہیں۔ آپ ان لوگوں میں ہیں جن کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ "یحبهم ویحبونه" اللہ میاں ہی نے آپ کو پہلے چاہا ہے، اسی لیے تو زندگی کے ہر ہر قدم پر آپ کے سامنے آپ کے چاہنے والے نے اسی چیز کو پیش کیا، جسے زندگی کے اس مرحلہ پر پیش ہونا تھا۔

معاف فرمائیے گا، خدا جانے کیا کیا لکھ گیا، آپ کے آخری خط کے پڑھنے سے دل بہت متاثر ہوا۔ اسی تاثیر نے بے ساختہ قلم کو رواں کر دیا، اور کوئی خاص بات قابلِ ذکر نہیں ہے، مولوی شبیر احمد صاحب بھی بیمار ہیں، مجھے تو توقع نہیں کہ دکن آسکیں گے، کاش نہ آئیں، تو ان ہی کے لیے اچھا ہے، زندگی کے آخری دنوں میں عزت و آبرو کے ساتھ چلا جانا ہی زیادہ مناسب ہے۔ فقط۔

مناظر احسن گیلانی۔

۲۳ رجب ۱۳۶۶ھ - جمعہ - حیدرآباد دکن۔
۱۳ جون ۱۹۴۷ء :

سیدی، دمتم بالحسنیٰ والعافیۃ۔ وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

نیاز نامہ کے جواب میں شفقت نامہ باعث ابتہاج و تشکر ہوا، حالات اتنے پیش آگئے ہیں کہ بجائے کچھ کہنے کے خاموشی ہی اولیٰ ہے، قومی بھی اور ذاتی بھی، برادری کے سوالات بھی، بس، افوض امری الی اللہ ان اللہ بصیر بالعباد۔ الخیر فیما وقع وان شاء اللہ سیکون الخیر فیما سیقع فان اللہ عند ظن عبدہ بہ۔

شاید اس کا خیال آپ کو نہ رہا کہ موسم گرما کی تعطیل میں جامعہ بند ہے، ورنہ مولنا فضل کو سلام اور ان سے استفسار نہ فرماتے، آج کل مفتی صاحب کے پاس علیگڈھ میں ہیں، آپ کو زبانی امتحان کے لیے تشریف لانے کی زحمت شاید ڈاکٹر بٹ کے مقالے کے سلسلہ میں دی گئی ہو۔ کالج کے بند ہونے کی وجہ سے کوئی خاص خبر اس سلسلہ میں نہیں دے سکتا، ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ میں جامعہ کا افتتاح ہوگا، پونے تین مہینے گرمی کی اس تعطیل کے غالباً پوری ملازمت میں پہلی دفعہ حیدرآباد ہی میں گذارنے پر مجبور ہوا، گیلانی میں ابھی کوئی واپس نہیں ہوا ہے۔ گھر کے لوگ ساتھ تھے، پڑا رہا، اب کچھ خبریں ایسی آرہی ہیں کہ بتدریج لوگ رجوع کرنے کا عزم کر رہے ہیں، میاں مکارم اپنے اہل و عیال کے ساتھ استھانواں[1] میں ہیں، دیکھیے اس مختون پاکستان کے بعد بھی

---

[1] استھانواں ضلع پٹنہ کا مشہور اور بڑا گاؤں ہے، بہار شریف سے ایک میل کے فاصلہ پر جنوب اور مغرب میں واقع ہے۔ حکومت کا تھانہ بھی ہے۔ اس گاؤں میں کافی علماء پیدا

شورش فرو ہوئی ہے یا نہیں،

میری ملازمت کی مدت ستمبر کے مہینے میں پوری ہو رہی ہے، اس وقت تک کچھ نہیں معلوم کہ ارباب اقتدار کا کیا ارادہ ہے، امیر جامعہ جدید ولی محمد صاحب[1] یورپ گئے ہیں، آنے کے بعد کچھ فیصلہ ہو گا۔ بھاولپور سے وزیر تعلیم کا تار آیا تھا کہ چند ہی دن کے لیے ایک دفعہ بھاولپور آکر دیکھ جاؤ۔ معذرت لکھ کر بھیج دی ہے،

اسلامی معاشیات[2] میری کتاب شائع ہو گئی، عنقریب حاضر ہو گی، نصف حصہ اس کا غیر مطبوع تھا،

ہوئے، اب بھی ایک تعلیم گاہ مدرسہ محمدیہ کے نام سے قائم ہے، جو حکومت بہار مدرسہ اگزامینیشن بورڈ سے ملحق ہے، اور صوبہ کے مشہور صاحب علم و تقویٰ بزرگ حضرت مولانا فصیح الدین صاحب فاضل دیوبند کے دم سے مدرسہ کی رونق باقی ہے، انگریزی تعلیم کا بھی کافی چرچا ہے۔ ۱۲-

[1] ڈاکٹر ولی محمد صاحب پنجاب کے رہنے والے لکھنؤ یونیورسٹی کے مشہور پروفیسر طبیعات ۱۹۴۶ء میں جب نواب علی یاور جنگ ترقی پاکر ریاست حیدرآباد کے وزیر ہو گئے تو اسی زمانہ میں ڈاکٹر ولی محمد جو لکھنؤ یونیورسٹی سے وظیفہ پر الگ ہوئے تھے، جامعہ عثمانیہ کے وائس چانسلر مقرر کئے گئے۔ ڈاکٹر صاحب جامعہ میں تھوڑے ہی دنوں رہ سکے، اب موصوف زندگی کے آخری ایام لندن میں گذار رہے ہیں۔ ۱۲-

[2] علامہ گیلانی علیہ الرحمہ کی مبسوط تصنیف، پہلی بار ۱۹۴۷ء میں شائع ہوئی، اپنے موضوع پر قیمتی تصنیف ہے۔ کتاب میں خالص اسلامی نقطۂ نظر سے معاشیات کے مسائل پر مفصل بحث کی گئی ہے، اور معاشی دشواریوں کا اسلامی حل پوری وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، ساتھ ہی ساتھ غیر اسلامی معاشی نظاموں پر تنقید کرتے ہوئے اسلامی نظام کی برتری ثابت کی گئی ہے، ۵۴۲ صفحات پر ادارہ اشاعت اردو عابد روڈ حیدرآباد دکن سے شائع ہوئی ہے۔ ۱۲-

ہاں صاحب! اس وقت دراصل اس عریضہ کو اس خاص خبر کی وجہ سے لکھ رہا تھا جس سے آپ نے مطلع فرمایا ہے یعنی اہل و عیال کے ساتھ سفر حج، عجب اتفاق ہے، میرے گھر کا بھی ہفتہ عشرہ سے اصرار ہو رہا ہے، کہ تم تو فرض سے سبکدوش ہو گئے، میں رہ گئی، مجھے لے چلو، لیکن اسی سال میری ملازمت کے فیصلہ کا زمانہ وہی ہے جب روانگی کی تیاری میں مسافر کو مشغول ہونا چاہیے، ٹکٹ اس سال خرچ کا تخمینہ اوسطاً کیا ہے، یعنی جہاز کے عرشہ اور فرسٹ کلاس دونوں کا، ہو سکے تو مطلع فرمایئے محترم! قانون مانع نہ ہوتا تو آپ کے قافلہ میں گھر کو شریک کر دیتا۔ بے چارے ہاشم[1] کا

[1] مولوی سید محمد ہاشم ندوی استھانواں ضلع پٹنہ کے رہنے والے اور اپنے وقت کے مشہور صاحب علم و صاحب قلم مولانا محمد حسن صاحب استھانوی کے صاحبزادے ہیں، آپ نے ندوۃ العلماء سے فراغت حاصل کی، اور پھر دائرۃ المعارف حیدرآباد میں ایک معقول اسامی پر بحال ہوئے، بعد میں محکمہ کے ناظم بھی ہو گئے تھے، اب پنشن ہو گئی ہے، اور حیدرآباد میں مقیم ہیں۔ ۱۲-

حال کیا عرض کروں، دیکھ کر دل کانپ جاتا ہے، وہ کوچہ غم میں اور ہوش والوں کے لیے سیبت بنے ہوئے ہیں، ممکن حد تک خبر گیری جو کچھ کر سکتا ہوں کر رہا ہوں۔ لیکن خود مجھ پر کافی بار ہے۔ فقط۔

والسلام، مناظر احسن گیلانی۔

---

۳۱ جنوری ۱۹۴۷ء۔ ۸ ربیع الاول ۱۳۶۶ھ۔ پنجشنبہ۔

سیدی و سیدی المسلمین، رزقنا اللہ وایاکم العافیۃ فی الدنیا والآخرۃ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

بہار کے حالات سنتے سنتے کلیجہ پک گیا۔ الم تر الی الذین خرجوا من دیارھم وھم ألوف حذر الموت[1]۔ "ھم الوف" کے الفاظ نے ہمیشہ اس تفسیر کے سمجھنے سے رکاوٹ پیدا کی، جو عموماً کتابوں میں ملتی ہے اور تقریباً ایک سال سے یہی خیال سامنے آرہا تھا، جسے اب دیکھ رہا ہوں۔ فقال لھم اللہ موتوا، کاش مرنے پر یہ لوگ آمادہ ہو جاتے تو "ثم أحیاھم" کا وعدہ ان کے سامنے آتا، لیکن وہ زندگی کو موت کے گڑھوں میں تلاش کرنے کے لیے جا رہے ہیں، اللہ ہم لوگوں پر رحم کرے، بہار کا حال تنہا بھی زمانے سے اس کا مستحق تھا جسے اب اپنے

[1] ترجمہ: ارکیا تم نے ان کو نہیں دیکھا جو اپنے گھروں سے موت کے خوف سے نکلے اور وہ ہزاروں تھے۔

سامنے دہ پا رہے ہیں،

مگر اب یہ "گیلانی" کی دم کا کیا کروں، بہ ظاہر لنڈھے ہو کر جینے کا وقت تو باقی نہیں رہا، شاید کہیں ادھر ادھر مرنا پڑے گا، دکن میں؟ لیکن دکن میں کب تک، ہو سکے تو کوئی مشورہ دیجیے، ورنہ کم از کم دعا کیجیے، اچانک زندگی کی ایک ایسی منزل پر پہنچ گیا ہوں، کہ ہر طرف مایوسی ہی مایوسی نظر آرہی ہے،

سنا آپ کو بعض لوگ بھاولپور سے دعوت دے رہے ہیں، بغداد جدید[1] میں اس گیلانی کے فقیر کو بسنے پر آمادہ کر رہے ہیں، سنا ہے کہ کوئی جامعہ عباسیہ وہاں ہے، آپ کے معلومات وہاں کے متعلق کیا ہیں،

مجلّہ کا نام "دانش" مجھے بھی پسند ہے، اس سے بہتر لفظ اب تک دماغ میں نہیں آیا، دیوانوں کے لیے دانش میں کیا گنجائش ہے، معارف والے مضمون "ربوا" پر چاروں طرف سے حملے ہو رہے ہیں، میرے ایک قدیم رفیق فی الاستاذیت کے صاحبزادے ترجمان القرآن کے میدان میں اترے ہیں، خیر وہ تو ابھی نو آموز ہیں، اور غالباً فقیہ النفس نہیں معلوم ہوتے، لیکن تعجب مجھے مولانا ظفر احمد صاحب پر ہے، میں نے سوچ لیا

[1] بغداد جدید ریاست بھاولپور کے شہر بھاولپور کا حصہ ہے یہاں ریاست کے امراء و اعلیٰ حکام رہتے ہیں۔ اسی بنا پر نام بغداد رکھا گیا ہے اور وہاں ریاست کے موجودہ نواب صاحب نے جامع ازہر مصر کی طرز پر ایک مدرسہ جامعہ عباسیہ کے نام سے کھولا ہے۔ ۱۲۔

کہ اب کچھ نہ لکھوں، اور زیادہ لوگوں نے ستایا تو تحکیم پر آمادہ ہو جاؤں گا، آپ کو اور مولوی شفیع[١] دیو بندی کو "حکم" بنانا قبول کرتا ہوں۔ آپ منظور فرمائیں گے، میں آپ کے رجحانات سے واقف ہوں، لیکن اس کے ساتھ اس کا بھی اعتماد ہے کہ "اعدلوا" پر قیام کی آپ جیسے حضرات سے توقع کی جا سکتی ہے۔ فقط

مناظر احسن گیلانی۔

---

[١] مولنا مفتی محمد شفیع ۱۳۱۴ھ ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے، دیوبند وطن ہے، دار العلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کی، اور وہیں مدرس مقرر کئے گئے، ۱۳۵۰ھ ۱۹۳۱ء میں دار العلوم دیوبند میں منصب افتاء پر فائز ہوئے، ۱۳۶۸ھ ۱۹۴۹ء میں پاکستان چلے گئے، وہاں دستور ساز اسمبلی کے بورڈ آف تعلیمات اسلام کے رکن کی حیثیت سے اسلامی دستور کی ترتیب میں مدد دی۔ ۱۳۷۰ھ ۱۹۵۱ء میں کراچی شہر میں ایک دینی مدرسہ دار العلوم کے نام سے قائم کیا، جو اس وقت کراچی میں علوم اسلامیہ کا سب سے بڑا مرکز ہے۔

مفتی صاحب کا علم وسیع اور گہرا ہے، اور تقریباً تمام متداول علوم عربیہ میں عمدہ صلاحیت اور اچھی نظر رکھتے ہیں، متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ اور ہر کتاب پڑھنے والے سے ان کے علم و فضل کا اعتراف کراتی ہے، آپ کے سیکڑوں شاگرد و تلامذہ ہند و بیرون ہند میں دینی و اسلامی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ راقم الحروف کو بھی آپ سے شرفِ تلمذ حاصل ہے، الحمد للہ کراچی میں سلامت با کرامت ہیں۔ ۱۲۔

∴ ∴ ∴

۱۶ فروری ۱۹۴۷ء۔ ۲۴ ربیع الاول ۱۳۶۶ھ۔ حیدر آباد دکن۔ شنبہ۔

سیدی: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

اس قدر جلد نقد جواب کی توقع نہ تھی، جزاکم اللہ عنا خیر الجزاء، ہمارے مسلمانوں کے سامنے کوئی دینی یا دنیوی نصب العین ادھر چند دنوں سے باقی نہ رہا تھا۔ قریب قریب بے مقصد زندگی گذار رہے تھے، زیادہ سے زیادہ توالد و تناسل بقائے نوعی کے لیے اور اجل مسمیٰ تک پہنچنے اور بقاء شخصی کے لئے جو معدات اور اسباب کی ضرورت ہو سکتی ہے، یہی ایک حیوانی مشغلہ ان کے سامنے رہ گیا تھا، وہ آج شاکی ہیں، کہ غیروں نے ان کی مسجدوں کو ویران کیا، لیکن میں گواہی دیتا ہوں کہ اس سے پہلے برسوں سے وہ خود اپنے ہاتھوں اپنی مسجدوں کو ویران کر چکے تھے۔

لا ایمان لمن لا أمانة له۔ وان صام وان صلّى[١]۔ (الحدیث)

لیکن ان میں امانت کے ساتھ ساتھ ان صام و صلی کا ذوق بھی ختم ہو چکا تھا، ان بیماریوں میں سچ پوچھئے تو ایک خود میں بھی ہوں، دیکھئے دین کا افلاس دنیا میں بھی افلاس کے کس نقطۂ انجماد تک ہم لوگوں کو پہنچاتا ہے، اللھم انی اعوذبک من غضبک۔

میرا ارادہ اب ملازمت کے جھنجھٹوں میں مبتلا ہونے کا نہ تھا، لیکن موجودہ

---

[١] ترجمہ: جس کے پاس امانت نہیں اس کے پاس ایمان نہیں اگرچہ وہ روزے رکھتا ہو اور نمازیں پڑھتا ہو،

حالات ایسے ہیں کہ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے، بھادلپور کے خیال کو آپ کے خط کے بعد میں نے اٹھا دیا، اب جو آپ حضرات کا حکم ہوگا، اس وقت تو میں بے در اور بے گھر ہو رہا ہوں۔ گیلانی کو وہاں کے مسلمان باشندوں نے قطعی طور پر چھوڑ دیا ہے، بعض خبریں ادھر ایسی آرہی ہیں، کہ دیسنہ کے بزرگوں کے پائے استقامت میں تزلزل "لا فعل اللہ" پیدا ہو گیا ہے، خداوند تعالیٰ ہم لوگوں کی دستگیری فرمائے۔

مسلم یونیورسٹی سے بعض سلسلہ جنبانیاں ہوئی ہیں، معاملہ آپ ہی کے سپرد کرتا ہوں۔ المتوسل بذیلکم فی الدنیا والآخرہ۔ مناظر احسن گیلانی۔

---

۹ فروری ۱۹۴۸ء۔ ۲۷ ربیع الاول ۱۳۶۷ھ۔ حیدر آباد دکن۔

سید المحترم! متعنا اللہ بطول حیاتکم، وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

مجھے تعجب تھا کہ جواب میں خلاف دستور تاخیر کیوں ہوئی، لیکن اب معلوم ہوا کہ بہار کو سعادت اندوزی کا موقع دیا گیا تھا، گو یہ دنیا بہر حال چھوٹنے والی ہے، لیکن اب اس حدیث کی قیمت سمجھ میں آئی ہے، جس میں "اغرورقت عیناہ"[1] کے الفاظ ہیں یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان جذبات کا اظہار کیا گیا ہے جو ترک مکہ کے بعد اس کے ذکر سے آپ متلاطم ہونے لگتے تھے، مرز و بوم کے ساتھ الف اور اس کی طرف حنین کی عقلی توجیہ ممکن ہے نہ ہو سکے جیسے اولاد کے ساتھ غیر معمولی عطوفت بھی غیر موجہ ہے،

[1] ترجمہ:۔ ان کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں، ۔۱۲

مگر واقعہ کا کیسے انکار کیا جائے، اب تو پروگرام بنانے سے دل الجھتا ہے، یہ کوئی دنیا ہے، جس سے ہم گذر رہے ہیں، پہلے ہی منطقی تعلق یہاں کے حوادث و واقعات میں کیا تھا، اور اب تو للہ الواحد القہار کے ارادۂ قاہرہ کے سوا ہر سبب اپنی سببی حیثیت کو کھو چکا ہے۔ بڑی بے رحمی کا ارتکاب ہندوستان کے اس بوڑھے پیر مرد[1] کے ساتھ کیا گیا، مارنے والے کا کوئی قصور اس بیچارے نے نہیں کیا تھا، میری سمجھ میں تو صرف اس آیت کی تفسیر آئی، کہ قل لن ینفعکم الفرار من الموت او القتل، اب امن کسے سمجھا جائے، کسی علاقہ کو فتح کر کے دار السلطنت میں اس کے بیٹھ کر بھی گولی کا نشانہ جب آدمی بن سکتا ہے تو پھر این المعاد و این المفر۔

میاں ہاشم سلمہ کا حال کیا لکھوں، مجھ میں اور ان میں یاجوج ماجوج کی دیوار کا سا معاملہ ہو رہا ہے۔ رات بھر کی ساری محنت صبح کو وہ ضائع کر دیتے ہیں، میں ذلیفہ کی کوشش کرتا ہوں اور ان کو اپنے ہوش و حواس کی صحت کا چونکہ کامل یقین ہے، اس لیے عود کی جد و جہد میں گھومتے ہیں، کل پرسوں سے آکر مجھے یہ خوشخبری سنا رہے ہیں، کہ نواب مہدی یار جنگ بہادر نے ان کے تقرر کا باضابطہ حکم دیدیا ہے خدا کرے صحیح ہو، کئی دفعہ باور کرایا، مگر تحقیق نے غلط ثابت کیا، ان کے بال بچوں کا حال سن کر کلیجہ کانپ گیا۔ اللھم نعوذ بک من الحور بعد الکور[2]

[1] مراد گاندھی جی ہیں۔ ۱۲۔ [2] اے اللہ میں پناہ مانگتا ہوں اُس افلاس سے جو خوشحالی کے بعد آئے۔

حالات دیکھیے کیا ہوتے ہیں، میاں مکارم مجھے بلا رہے ہیں، فقط،

مولانا رضوان[1] صاحب کو سلام فرما دیجئے۔ مولوی فضل صاحب سے معلوم ہوا کہ ان کے گھر کی طبیعت تشویشناک حدود تک پہنچی ہوئی ہے، معلوم نہیں اب کیا حال ہے، مولانا فضل کو سلام پہنچا دیا تھا جواب فرماتے ہیں، نیاز مند۔

مناظر احسن گیلانی۔

---

۱۱ نومبر ۱۹۴۶ء - ۸ محرم ۱۳۶۶ھ جمعہ۔

سیدی! ادام اللہ مجدکم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مولوی محمد علی صاحب اور میاں ہاشم کے خطوط میں تفقد حال فقیر کا جو فرمایا گیا دل متاثر ہوا؛ زندہ ہوں اور لا تاخذہ سنۃ ولا نوم کے ساتھ زندہ ہوں۔ جب بھیک (شفاعت) بھی باذنہ کے بغیر ناممکن ہے تو اس جیتے جاگتے ہمہ بیداری و ہمہ حکمت و علم کے ملک میں کسی دوسرے کا ارادہ کس راہ

[1] پھلت ضلع مظفرنگر (یو۔پی) کے رہنے والے۔ جید عالم اور بالخصوص فقہ میں عمدہ استعداد کے مالک، زندگی کا بڑا حصہ بھوپال میں رہ کر علوم دینیہ کے پڑھنے پڑھانے میں صرف کیا۔ بھوپال ہی میں نائب قاضی ہوئے۔ پھر قاضی کے منصب پر سرفراز ہوئے۔ راقم الحروف کی حقیقی بہن آپ ہی سے منسوب تھیں۔ بھوپال ہی میں وصال فرمایا۔ رحمۃ اللہ علیہ - ۱۲ -

سے گھس سکتا ہے۔ بیدہ الملک، لہ الملک ولہ الحمد، ونحن الیہ راجعون، امید ہے کہ آپ بعافیت ہوں گے۔ مولوی فضل تو گئے ہیں، کیا راہ میں آپ کے پاس بھی ٹھہرے۔

مولوی عبد الباری مسلسل پوچھ رہے ہیں، اب کیا ارادہ ہے، میں لکھتا ہوں کہ کوئی ارادہ نہیں تو بگڑ جاتے ہیں، ابھی لکھا ہے کہ ترک ارادہ بھی تو ارادے کے وجود کو ثابت کرتا ہے، پھر حماز میں مجھے شریک کیوں کرتے ہیں، کچھ نہ سوچنا کبھی عقل ہی کا اقتضا ہو جاتا ہے، تو نعمت عقل کے کفران کا الزام آپ دیتے ہیں؛

محکمات بینات لا تدری نفس ماذا تکسب غدا، ولا تدری نفس بای ارض تموت، کے بعد آپ ہی بتائیے کہ مولوی عبد الباری صاحب کو میں یہ کیسے بتاؤں کہ کل کیا کروں گا اور کہاں جا کر مرنے کا ارادہ ہے، فقط۔

مولانا رضوان صاحب کو سلام فرما دیجئے۔

خاکسار۔ مناظر احسن گیلانی۔

حصہ اول ختم شد۔